طلوع اسلام

جلد ۸
شمارہ ۹
کراچی: ہفتہ-۲-اپریل ۱۹۵۵ء
قیمت چار آنہ
سالانہ دس روپے

قرآن نے کیا کہا؟

یہ بتایا جا چکا ہے کہ خدائے واحد پر ایمان کے یہ معنی ہیں کہ خارجی کائنات میں بھی اسی کا اقتدار و اختیار مانا جائے اور انسان کی اجتماعی اور معاشی دنیا میں بھی اسی کا قانون نافذ ہو۔ اگر انسان کی اپنی دنیا میں غیر خدائی قانون نافذ ہو (خواہ وہ کسی کا بتایا ہوا قانون بھی کیوں نہ ہو) تو یہ کھلا ہوا شرک ہے۔ سورہ انبیا میں ہے کہ۔ ام اتخذوا آلھۃ من الارض ھم ینشرون۔ کیا لوگ اپنی معاشی دنیا میں خدا کے علاوہ اوروں کا اقتدار تسلیم کرتے ہیں جن کے بل بوتے پر یہ اپنے معاشی نظام کو پھیلانا چاہتے ہیں؟ اگر ایسا ہی ہے تو انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ۔ لوکان فیھما آلھۃ الا اللہ لفسدتا۔ اگر خارجی کائنات میں کسی اور کا اقتدار ہو اور انسانوں کی معاشی دنیا میں اور کا قانون تو اس سے دونوں جگہ ناہمواریاں پیدا ہوجائیں۔ فسبحان اللہ رب العرش عمایصفون (۲۱/۲۱-۲۲)۔ سو وہ خدا جس کے کنٹرول میں کائنات کی ربوبیت کا مرکز ہے ان تصورات سے بہت دور ہے جو لوگوں نے اس کے متعلق قائم کر رکھے ہیں۔

طلوع اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ....

۱ تنہا انسانی عقل زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔

۲ یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے اس لئے نوع انسانی اب قرآن کے بغیر اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔

۳ ہمارے اعمال کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے خلاف ہو، خواہ اسے کسی کی طرف منسوب کیا جائے، غلط ہے۔

۴ حضور نبی اکرم انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن سازشوں نے ہماری تاریخ میں ایسی چیزیں شامل کر دی ہیں جن سے حضور کی سیرت داغدار ہوتی نظر آتی ہے۔ ہماری تاریخ کے اپنے تمام حصے (خواہ وہ کسی کی کتابیں ہوں) یکسر غلط اور جھوٹ ہیں۔ حضور کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔

۵ قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

۶ اس عالمگیر نظام زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں۔ (انہیں قانون شریعت کہا جاتا ہے) یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

۷ اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اسے ربوبیت عامہ یعنی تمام نوع انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۸ ربوبیت عامہ کے مقصد عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے مطابق ہو سکے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے کا محتاج نہ رہے۔ اسے "قرآنی نظام ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ....

پہلے پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں قرآنی نظام ربوبیت قائم ہو جائے تاکہ صفات خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی مضمر صلاحیتیں کامل نشوونما پا سکیں اور یوں "زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"۔

اگر آپ طلوع اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوع اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ سنت رسول اللہ ★ گورنر جنرل کا اعلان ★ ہندو پروپیگنڈہ ★ انجمن حمایت اسلام ★ ڈاکٹر خان صاحب سے ا ★ مجلس اقبال
★ عورت کا قرآن ★ اسلام کی سرگزشت ★ تاریخی شواہد ★ بزم طلوع اسلام ★ قرآن اور حدیث کی صحیح پوزیشن ★ مس ہلین کیلر
★ حقائق و عبر ★ باب المراسلات ★ دفتری بدنظمیاں ★ بین الاقوامی جائزہ ★ عالم اسلامی ★ اندرون ہند

سلسلہ مطبوعات طلوع اسلام

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلق اویسؓ و چادر زہراؓ
(اقبال)

مزاج شناس رسولؐ

جماعت اسلامی کی خطرناک ڈکٹیٹر شپ پر
طلوع اسلام کا بے لاگ تبصرہ

شائع کردہ
ادارہ طلوع اسلام کراچی

ضخامت ۴۴۸ صفحات - مجلد مع گرد پوش -
قیمت -/۴ روپے علاوہ محصول ڈاک

دورِ حاضرہ کی ایک عجیب وغریب کتاب

ہماری بصیرت کے مطابق

قرآنی فیصلے

ایسے متعدد امور کے متعلق — جنھیں
سمجھا کچھ اور جاتا ہے — اور وہ ہیں کچھ اور

شائع کردہ - ادارہ طلوع اسلام کراچی

ضخامت ۴۰۸ صفحات مجلد مع گرد پوش —
قیمت -/۴ روپے علاوہ محصول ڈاک

سلسلہ مطبوعات طلوع اسلام

بچوں، عورتوں، کم پڑھے لکھے لوگوں اور سرکاری ملازموں کیلئے

اسلامی معاشرت

جس میں آسان زبان میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کسے کہتے ہیں
اور قرآن کی رو سے مسلمانوں کا معاشرہ کس قسم کا ہونا چاہیے

پرویز

شائع کردہ
ادارہ طلوع اسلام کراچی

ضخامت ۱۹۲ صفحات مجلد مع گرد پوش
قیمت -/۲ روپے علاوہ محصول ڈاک

اسبابِ زوالِ امت

قیمت -/۱/۸ روپیہ

اسلامی نظام

قیمت -/۲ روپے

ہفتہ وار

طلوعِ اسلام

جلد ۸ ۲ اپریل ۱۹۵۵ء نمبر ۹

سنتِ رسول اللہؐ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں بھیجا تو اسے جسمانی قوتیں عطا کیں اور ان کے ساتھ ہی عقل و شعور کا مادہ بھی۔ لیکن جس طرح اس کی جسمانی قوتیں محدود ہیں اسی طرح اس کی عقل و فکر کی بھی ایک حد ہے۔ اس کی جسمانی قوتوں کی محدودیت کی کمی پوری کرنے کے لئے اس کی عقل نے آلات ایجاد کئے۔ (جس چیز تک اس کا ہاتھ نہیں پہنچتا یہ اس تک سیڑھی کے ذریعہ پہنچ جاتا ہے) لیکن اس کی عقل کی محدودیت کی کمی یہ خود پوری نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام کیا کہ اسے اپنی طرف سے راہ نمائی دی جائے۔ اس راہ نمائی کی شرح یہ نہیں تھی کہ ہر انسان کے دل میں یہ بات ڈال دی جائے کہ زندگی کا فلاں راستہ صحیح ہے اور فلاں غلط۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کو منتخب کر لیتا اور اسے وحی کے ذریعے بتا دیتا کہ نوعِ انسانی کے لئے صحیح راستہ کونسا ہے۔ اس وحی میں نہ تو اس منتخب فرد کی اپنی عقل و بصیرت کا کوئی دخل ہوتا اور نہ ہی اس کے کسب و ہنر کا کوئی واسطہ۔ اسے وحی براہِ راست خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی۔ خدا کی طرف سے اس طرح وحی ملنے کے منصب کو منصبِ نبوت کہا جاتا ہے اور حاملِ وحی کو نبی۔

وحی کا مقصد یہ تھا کہ انسانوں کو بتایا جائے کہ انہوں نے اس دنیا میں کس طرح رہنا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ ان کا معاملہ کیا ہونا چاہیے۔ اس کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی کے معاملات کا تصفیہ کیسے ہونا چاہیے۔ مختصر الفاظ میں وحی کا مقصود یہ بتانا تھا کہ انسانوں کی ہیئت اجتماعیہ کا نقشہ کس قسم کا ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد حاصل ہو نہیں سکتا جب تک اس نقشہ کی عملی شکل قائم کر کے نہ دکھا دی جائے اور انسانوں کو اس پر چلا کر یہ بتا نہ دیا جائے کہ وحی جس زندگی کا مطالبہ کرتی ہے وہ ناممکن العمل نہیں۔ اس مقصد کے پیشِ نظر نبی کے ذمہ یہ فریضہ بھی تھا کہ وہ وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچائے اور عملاً بتائے کہ اس کے مطابق زندگی کا نقشہ کیسے مرتب ہوگا۔ نبی کے اس منصب کو منصبِ رسالت کہا جائے گا۔ واضح رہے کہ ہم نے نبوت اور رسالت کے مناصب کا یہ فرق اس منتخب فرد کی دو حیثیتوں کو سمجھانے کے لئے بیان کیا ہے۔ ورنہ نبی رسول ہوتا ہے، اور رسول نبی ہوتا ہے۔ قرآن میں ایک ہی فرد کے لئے کہیں نبی اور کہیں رسول کا لفظ آیا ہے۔ لیکن مقصد پیشِ نظر کے اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس فرق کا سامنے رکھنا ضروری ہے۔ یعنی خدا سے وحی ملنے کا منصب، منصبِ نبوت ہے اور اس وحی کو دوسروں تک پہنچانا اور اس کے مطابق عملی نظام قائم کرنا منصبِ رسالت۔ مقصد اس تمام پروگرام کا یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کو خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق چلایا جائے۔ اس کو خدا کی اطاعت کہتے ہیں۔

اب آگے بڑھیے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب مختلف انسانوں نے مل کر ایک نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنی ہو تو اس نظام کا کوئی مرکز بھی ہونا چاہیے۔ جب رسول، وحی کے نقشے کے مطابق نظام قائم کرتا تو اس نظام کا مرکز خود اس رسول کے سوا کوئی . . . . اور ہو نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا ان تمام افراد کے لئے جو وحی کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عہد کر کے اس نظام کے اجزاء بنتے تھے، اس رسول کی اطاعت ضروری تھی۔ یہ اطاعت درحقیقت خدا ہی کی اطاعت ہوتی تھی کیونکہ رسول اپنی ذات کی اطاعت نہیں کراتا تھا بلکہ خدا کے قوانین ہی کی اطاعت کراتا تھا۔ لہٰذا، وحی کے نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے میں رسول کی اطاعت کے بغیر خدا کی اطاعت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

خدا کی طرف سے یہ سلسلۂ نبوت و رسالت چلا آرہا تھا تا آنکہ مشیت کے پروگرام کے مطابق چھٹی صدی عیسوی میں سرزمین حجاز میں نبی اکرمؐ مبعوث ہوئے۔ ان پر جو وحی نازل ہوئی وہ ایسی مکمل تھی کہ اس کے بعد نوعِ انسانی کے لئے مزید وحی کی ضرورت نہ رہی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی ذات پر نبوت کا خاتمہ کر دیا اور آپ پر نازل کردہ وحی کو قرآن کی شکل میں منضبط کر کے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ اس سے نبی اکرمؐ کے منصبِ نبوت کی بھی تکمیل ہو گئی اور نفسِ نبوت کا اختتام بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاتم النبیین قرار دیا ہے۔

اب رہا فریضۂ رسالت سو اس کے لئے حضورؐ نے وحی کے ذریعہ بتائے ہوئے نقشہ کے مطابق ایک نظام متشکل کیا۔ اس نظام کی بنیاد اس نظام کے مرکز یعنی خود رسول اللہ کی اطاعت پر تھی۔ رسول اللہ اس نظام کو واضح اور نکھری ہوئی صورت میں اُمت کو دے کر اس دنیا سے تشریف لے گئے اور دنیا کو بتا گئے کہ قانونِ خداوندی کے مطابق انسانوں کی اجتماعی زندگی کا نقشہ کس قسم کا ہوتا ہے۔

رسول اللہ کی وفات سے نبوت کا سلسلہ تو ختم ہو گیا لیکن وحی کے مطابق نظام کو تو بہرحال آگے چلنا تھا۔ اس نظام کو جماعتِ مومنین نے قائم رکھا اور رسول اللہ کی بجائے، خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیق کو اس نظام کا مرکز منتخب کیا۔ اب افرادِ امت کے لئے اس مرکز کی اطاعت بمنزلہ خدا اور رسول کی اطاعت کے تھی۔ اور خلیفۃ الرسول کے سامنے خدا کا قانون (قرآن کی شکل میں محفوظ تھا) اور اس کے علاوہ وہ منہاج و مسلک جس کے مطابق رسول اللہ نے اس نظام کو متشکل فرمایا اور آگے چلایا تھا۔ رسول اللہ کے اس عملی طریقہ کا نام "سنتِ رسول اللہ" تھا۔ سنت کے معنی ہی طریقہ ہیں۔

رسول اللہؐ نے اپنی تیئیس ۲۳ سالہ رسالت کی زندگی میں اس نظام کو بتدریج متشکل فرمایا تھا۔ اس لمبے عرصہ میں حالات میں کافی تغیر و تبدل ہوا۔ جس دن حضورؐ نے اس دعوت کے لئے پہلی آواز بلند فرمائی اور جس روز آپ دنیا سے تشریف لے گئے، اس کے درمیانی عرصہ میں یہ کاروانِ رشد و سعادت، مختلف منازل میں سے گزرا حضورؐ ایک راہ شناس اور واقفِ منزل میرِ کارواں کی طرح ان تمام منازل و مراحل میں، اپنی خداداد بصیرت اور رفقائے کار (صحابہؓ) کے مشورہ سے، حالات کے تقاضے کے مطابق عملی نقشے بنانے اور وقت اور موقعہ کے مناسب ہدایات نافذ فرماتے، مقدس اس قافلہ کو آگے بڑھاتے گئے۔ مثلاً نماز جیسے اہم فریضہ میں بھی پہلے ہر نماز میں دو دو رکعتیں پڑھی جاتی تھیں۔ بعد میں ان میں اضافہ ہوا۔ (مشکوٰۃ۔ بحوالہ مسلم و بخاری)۔ یا مکہ میں نماز کے لئے اذان کا قاعدہ نہیں تھا۔ اس کی ابتداء مدینہ میں جا کر صحابہ کے مشورہ سے ہوئی (بخاری) ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ اس کے بعد کچھ عرصہ اور بھی اس دنیا میں تشریف رکھتے تو آنے والے حالات کے مطابق کہیں پہلے نقشوں میں رد و بدل فرماتے اور کہیں جدید نقشوں کا اضافہ فرماتے۔ لیکن حضورؐ کے بعد یہ سلسلۂ رد و بدل منقطع نہیں ہوا بلکہ آپ کے خلفائے راشدینؓ اسے اپنی خطوط پر آگے بڑھاتے گئے۔ یعنی اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق، اس مناسب ردّ و بدل کو نہ خلفائے راشدین نے خلافِ سُنّتِ رسول اللہؐ سمجھا نہ صحابۂ کبارؓ نے اسے ایسا قرار دیا۔ (مثال کے طور پر) جب حضرت عمرؓ نے، پورے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ شام اور فلسطین کی مفتوحہ اراضی، فوج میں تقسیم نہیں کی جائے گی بلکہ ملت کی مشترکہ تحویل میں رہے گی تو کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ فیصلہ خلافِ سُنّتِ رسول اللہ ہے۔ یا جب آپ نے وظائف کو علی قدرِ مراتب بڑھایا گھٹایا تو کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ جب رسول اللہ نے ان میں مساوات کو قائم رکھا تھا تو آپ ان میں ردّ و بدل کیسے کر سکتے ہیں۔[1] اس لئے کہ وہ حضرات اس حقیقت سے واقف تھے کہ حالات کے مطابق اس قسم کا ردّ و بدل خود سنتِ رسول اللہؐ کی اتباع ہے۔ اس لئے کہ حضورؐ خود حالات کے مطابق نظام کے نقشے میں ردّ و بدل فرماتے رہتے تھے۔ البتہ جن امور میں حالات

---

[1] ہم نے صرف ایک آدھ مثال پر اکتفا کیا ہے ورنہ اس قسم کے متعدد واقعات ہیں جن میں عہدِ نبوی کے فیصلوں میں بعد میں عند الضرورت ردّ و بدل کیا گیا۔ اس قسم کی ایک تبدیلی (تعلیقِ ثلاثہ) کے ضمن میں امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ عہدِ حضرت عمرؓ کی سیاست کا یہی تقاضا تھا کہ ایسا ہی کیا جاتا۔

تقاضے کسی تبدیلی کے داعی نہیں ہوتے تھے، وہ انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیتے تھے۔ ان میں انہی نقشوں کے مطابق چلتے رہنا، اتباعِ سنت تھا۔ یعنی، اس نظام کے مرکز کے لئے، وحی کی روشنی میں، اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق نظامِ خداوندی قائم رکھنا، اتباعِ سنت تھا۔ اور افرادِ امت کے لئے اس مرکزِ نظام کے فیصلوں کی اطاعت کرنا، اطاعتِ خدا اور رسول کے مرادف۔ یاد رہے کہ خلفائے راشدینؓ کی عمل میں لائی ہوئی تبدیلیاں بھی سنت کے مفہوم میں داخل ہیں چنانچہ جمعہ کی پہلی اذان جو حضرت عثمانؓ نے شروع فرمائی تھی اور نماز تراویح کی جماعت جو حضرت عمرؓ نے شروع کی تھی سنت تسلیم کی جاتی ہیں۔

اگر یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہتا تو اطاعتِ خداوندی اور اتباعِ سنت کا یہ عملی نقشہ آگے بڑھتا رہتا۔ لیکن ہماری بدقسمتی سے یہ سلسلہ تھوڑے عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا۔ اب آپ اس مقام پر آجائیے جہاں ہم اس وقت کھڑے ہیں۔ اس وقت ہماری صورت یہ ہے کہ

(۱) وہ اسلامی نظام موجود نہیں جسے رسول اللہؐ نے متشکل فرمایا تھا اور صحابہؓ نے آگے بڑھایا تھا۔ ہم اس وقت بالکل انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں جو وحی کی منشاء اور سنتِ رسول اللہؐ کے خلاف ہے۔

(۲) ہمارے پاس قرآن ہے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جسے خدا نے رسول اللہ کو بذریعہ وحی عطا کیا تھا۔

(۳) ہمارے پاس سنتِ رسول اللہؐ یا آثارِ صحابہؓ کا کوئی مجموعہ ایسا نہیں جسے خود رسول اللہؐ یا خلفائے راشدینؓ نے مرتب کرایا ہو۔

(۴) ہمارے پاس روایات کا ایک ذخیرہ ہے جو نبی اکرمؐ اور عہدِ صحابہؓ کے احوال و کوائف پر مشتمل ہے۔ (چنانچہ ان میں سب سے اہم کتاب، صحیح بخاری جو تیسری صدی ہجری میں مدون ہوئی تھی کا نام خود امام بخاری نے "الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ وایامہ" رکھا تھا) لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان مجموعوں میں صحیح روایات بھی ہیں اور غلط بھی۔ اصل بھی ہیں اور وضعی بھی۔ باہم متناقض و متخالف روایات بھی موجود ہیں جو ہو سکتا ہے کہ مختلف ادوار سے متعلق ہوں جنہیں آج ہم متعین نہیں کر سکتے۔ ایسی روایات بھی ہیں جو اپنے سیاق و سباق سے کٹی ہوئی ہیں یا جن میں ادھوری بات بیان ہو گئی ہے اور اس طرح بات کچھ سے کچھ بن گئی۔ حتیٰ کہ ایسی بھی ہیں جنہیں ہم کسی طرح بھی حضورؐ رسالت مآب کی ذاتِ اقدس کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ ایسی ہی روایتیں ہیں جن کے متعلق (اور تو اور) مولانا ابوالکلام آزاد جیسا اہلِ حدیث بھی اس کا اعتراف کرتا ہے: (اور ان کا یہ اعتراف صحیح بخاری کی ایک روایت پر تنقید کے سلسلے میں ہے) کہ "روایات کی قسموں میں کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو، بہرحال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں۔ اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لئے بھی یقینیاتِ دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ اللہ کے رسول کا قول نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے۔ اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شق ہو جائے گی۔" (ترجمان القرآن جلد دوم صفحہ)

روایات کے ان مجموعوں کے متعلق جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی رقمطراز ہیں کہ

> یہ مواد اس حد تک قابلِ اعتماد ضرور ہے کہ سنتِ نبویؐ اور آثارِ صحابہؓ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے۔ مگر اس قابل نہیں ہے کہ اس پر بالکل اعتماد کر لیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ بحالاتِ موجودہ یہ کس طرح متعین کیا جائے کہ صحیح سنتِ رسول اللہ اور آثارِ صحابہ کیا ہیں؟ اس لئے کہ جب تک یہ متعین نہ ہو جائے کون کہہ سکتا ہے کہ سنتِ رسول اللہ کی صحیح ترین شکل یہ ہے۔ اس تعین کی صورت یہ ہے کہ

(۱) سنتِ رسول اللہؐ کا ایک بڑا حصہ خود قرآن کے اندر ہے جو یقینی طور پر صحیح ہے۔

(۲) روایات کا جو ذخیرہ ہمارے پاس ہے اسے پرکھنے کا معیار بھی خود قرآن ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہؐ اور صحابہؓ قرآن ہی پر عمل کیا کرتے تھے اور انہوں نے اس کے مطابق عملی نظام متشکل فرمایا تھا۔

(۳) اس ذخیرہ کو پرکھنے کا کام زید، بکر، عمر کے ذاتی طور پر کرنے کا نہیں۔ اس لئے کہ کسی فرد کو یہ حق کس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ دوسرے افرادِ امت سے کہے کہ جس بات کو میں سنتِ رسول اللہ کہتا ہوں اس کی اتباع تم پر فرض ہے اگر تم اس کی اتباع نہ کرو گے تو تمہیں منکرِ رسالت قرار دے دیا جائے گا۔

(۴) اس تعین کے لئے ضروری ہے کہ امت قرآن کی روشنی میں پھر سے وہی نظام قائم کرے جسے رسول اللہ نے قائم فرمایا اور صحابہ نے آگے بڑھایا تھا۔ اس نظام کا یہ کام ہو کہ وہ کتبِ روایات کے اس تمام ذخیرے کو قرآن کی روشنی میں پرکھے اور پھر ہمارے لئے) متعین کر دے کہ اس کی رو سے سنتِ رسول اللہ کی سب سے زیادہ صحیح شکل یہ ہو سکتی ہے۔ وہ قرآن کے قوانین اور اس طرح متعین کردہ سنتِ رسول اللہ کی روشنی میں امت کو چلائے اور جہاں جہاں ضرورت ہو، اس زمانے کے حالات کے مطابق، اس سنتِ رسول اللہ میں ضروری تبدیلی کرتا جائے جس طرح خلفائے راشدین نے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق ان میں تبدیلیاں کی تھیں۔

(۵) جب تک ایسا نظام قائم نہ ہو اس وقت تک جس طرح امت انفرادی طور پر سنتِ رسول اللہؐ کی اتباع کرتی آرہی ہے اسی طرح کیا جائے (تاکہ امت انتشار سے بچی رہے) اس میں صرف اتنا دیکھ لینا ضروری ہوگا کہ کوئی بات ایسی نہ ہونے پائے جو صریحاً قرآن کے خلاف ہو۔ اس لئے کہ جو کچھ قرآن کے خلاف ہوگا وہ خود سنتِ رسول اللہ کے بھی تو خلاف ہوگا کیونکہ رسول اللہؐ قرآن ہی کی اطاعت کیا کرتے تھے۔

یہ ہے ہمارے نزدیک اتباعِ سنت کی صحیح پوزیشن جس کی طرف ہم شروع سے دعوت دیتے چلے آرہے ہیں۔ ہم ملک کے اربابِ فکر و نظر سے باادب درخواست کریں گے کہ وہ ان معروضات پر دل کے سکون اور فکر کی گہرائی سے غور کریں اور پھر سوچیں کہ جس نتیجے پر ہم پہنچے ہیں وہ صحیح ہے یا غلط۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اربابِ فکر و نظر سے یہ درخواست کرنا کہ وہ اس پر سکوت و سکون سے غور فرمائیں، عام حالات میں خود فکر اور نظر کی توہین ہے۔ لیکن اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں فضا ایسی پیدا کر دی گئی ہے کہ کسی معاملہ پر (بالخصوص جو مذہب سے متعلق ہو) خالی الذہن ہو کر، سکوت و سکون سے غور کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اور اتباعِ سنت کا سوال اتنا اہم ہے کہ اس کا صحیح حل کئے بغیر ملت کی حیاتِ اجتماعیہ کا کوئی نقشہ صحیح نہیں بیٹھے گا۔

جو حضرات یا جماعتیں، طلوع اسلام کو منکرِ حدیث پکار کر ایک بہت بڑے فتنے کا موجب قرار دیتی چلی آرہی ہیں، اُن سے بھی ہماری باادب درخواست ہے کہ وہ ازرہِ کرم صرف اتنا بتائیں کہ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس میں کوئی غلطی ہے۔ اور اگر غلطی ہے تو کہاں۔ اس کے لئے کسی لمبے چوڑے مضمون لکھنے کی ضرورت نہیں۔ فقط اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ فلاں مقام غلط ہے اور اس کی جگہ صحیح پوزیشن یہ ہے۔ اس باب میں ہم جماعتِ اسلامی کی خدمت میں خاص طور پر درخواست پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ ان سے یہ بھی گزارش ہے کہ وہ ایک نظر اس مضمون پر ڈال لیں جو "قرآن اور حدیث" کی "صحیح پوزیشن" کے عنوان سے اسی اشاعت میں شائع ہو رہا ہے۔ اگر اس طرح ہماری کسی واقعی غلطی کی اصلاح ہو جائے تو ہم بدل شکر گزار ہوں گے اور اگر اس طرح کے غور و فکر کے بعد یہ متعین ہو جائے کہ سنتِ رسول اللہ کسے کہتے ہیں وہ کہاں سے اور کس طرح حاصل ہوگی اور اس پر عمل کیسے ہوگا۔ تو اس سے ایک بہت بڑے سوال کا حل مل جائے گا جس کے متعین نہ ہونے سے اس وقت قوم عجیب الجھن میں ہے اور جس کی وجہ سے اس کی بہت سی توانائیاں بے نتیجہ ضائع ہو رہی ہیں بلکہ مضر نتائج پیدا کر رہی ہیں۔

کیا اربابِ فکر و نظر اس طرف توجہ فرمائیں گے؟ [مختلف جرائد اور رسائل سے بھی گزارش ہے کہ وہ اس مقالہ کو اپنے ہاں شائع فرما کر اس اہم مسئلہ کے حل میں ہم سے تعاون کریں جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہوں گے۔]

للہ الحمد

طلوع اسلام نے اپنی ستمبر ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

> صوبوں کی لکیریں محض نظم و نسق کی سہولت کی خاطر کھینچی گئی تھیں نہ کہ ملک کے باشندوں میں تفریق پیدا کرنے کے لئے۔ اگر یہ لکیریں اس قسم کی تفریق کا موجب بن رہی ہیں تو ان لکیروں کو، جس قدر جلد مٹایا جا سکے اتنا ہی اچھا ہے۔

یہ طلوع اسلام کی طرف سے اٹھائی ہوئی تنہا آواز تھی اور بظاہر صدا بصحرا جس کی تائید کسی نے نہ کی لیکن اسے اس آواز کی صداقت پر اس قدر یقین تھا کہ یہ اسے برابر دہراتے چلا گیا۔ چنانچہ اس نے اپنی مارچ ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں پھر لکھا کہ

> ملت میں تفرقہ انگیزی کا ایک بنیادی سبب صوبوں کا وجود ہے۔ ہمارے صوبے ہمارے لیڈروں کی ہوسِ اقتدار اور حرصِ مناصب و مدارج کو بڑھانے کا موجب بن رہے ہیں .... اس بنا پر طلوعِ اسلام نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ملک سے صوبوں کا وجود ختم کر دیا جائے۔

اس کے ساتھ ہی ہم نے مجلسِ دستور ساز (مرحوم) کی بنیادی کمیٹی کی رپورٹ کے سلسلہ میں لکھا کہ

> ذرا غور کیجئے کہ اس طرح مملکت کی آئینی مشینری کس طرح بھاری ہو جائیگی۔ ہر صوبہ میں الگ الگ پارلیمان۔ الگ الگ وزارتیں۔ پھر مرکز میں پانچ سو بیس ارکان پر مشتمل دو ایوان۔ ان کے اوپر کابینہ۔ پھر صوبوں کے گورنر اور مرکز میں امیرِ مملکت۔ نوزائیدہ مملکت کی نرم و نازک شاخیں ان پھلوں کے بوجھ سے ٹوٹ جائیں گی۔ (طلوعِ اسلام - جنوری ۱۹۵۳ء)

اس پر بھی کسی نے کان نہ دھرا تو ہم نے اکتوبر ۱۹۵۳ء میں صاف صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ

> ہماری تجویز یہ ہے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو دو خود مختار وحدتیں تسلیم کر کے ان میں کانفیڈریسی پیدا کر دی جائے، جس میں تراضیِ طرفین سے مشترکہ مسائل اکٹھے رکھ دیئے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو مٹا کر پورے ملک میں ایک حکومت قائم کی جائے۔

جب یہ تجویز اس قدر واضح الفاظ میں سامنے آئی تو اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ لیکن طلوعِ اسلام کو حق بات کے کہنے میں مخالفت کی پرواہ ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ اس دعوت کو برابر دُہرائے چلا گیا۔ چنانچہ اس نے اپریل ۱۹۵۴ء میں پھر کہا کہ

> مغربی پاکستان سے الگ الگ صوبوں کا وجود ختم کر دیا جائے اور تمام علاقہ ایک ہی مرکز کے ماتحت رہے۔

اس تجویز کی مخالفت بھی بڑھتی گئی اور اس کے ساتھ ہی طلوعِ اسلام کی نوا بھی تلخ سے تلخ تر ہو گئی چنانچہ اس نے نومبر ۱۹۵۴ء میں لکھا کہ

> مغربی پاکستان میں صوبوں کی تقسیم پورے پاکستان کی بربادی کا باعث ہے۔ جب تک مغربی پاکستان ایک وحدت نہیں بن جاتا پاکستان میں استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ ان صوبوں کو مٹایئے اور انتظامی ضرورتوں کے لئے اس قسم کے خطے بنایئے جو موجودہ صوبائی لکیروں سے ہٹے ہوئے ہوں اور جن میں مختلف صوبوں کی مشترکہ آبادیاں ہوں۔

جو ننھی سی آواز ۱۹۴۸ء میں اٹھائی گئی تھی اور جسے دبانے کے لئے چاروں طرف سے شور و غوغا بلند کیا جاتا رہا، اس نے بالآخر اپنا اثر کیا اور ۲۲ر نومبر ۱۹۵۴ء کی شام کو وزیرِ اعظم پاکستان نے اپنی نشری تقریر میں اس کا اعلان کر دیا کہ

> ہمیں مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنا دینا چاہیئے۔ مغربی پاکستان کی موجودہ صوبائی تفریق کے لئے کوئی وجۂ جواز نہیں۔ گذشتہ سات سال میں اس مصنوعی تقسیم نے تشتت و انتشار کے سوا اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کیا۔ ویسے بھی ہمارے لئے یہ مشکل ہے کہ ہم ایسے انداز کی حکومت کی مسرفانہ عیاشی کو برداشت کر سکیں جس میں چھ یا سات الگ الگ اسمبلیاں، الگ الگ وزارتیں، الگ الگ سکرٹریٹ، اور خدا جانے کیا کیا الگ ساز و سامان ہوں گے۔ لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ پورے مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنا دیا جائے۔

ہمیں خوشی ہوئی کہ، بعد از خرابیٔ بسیار ہی سہی، ہمارے اربابِ حل و عقد کی سمجھ میں وہ بات تو آ گئی جسے ہم پانچ سال سے دہراتے چلے آ رہے تھے لیکن اس کے بعد ملک میں جو طوفان برپا ہوا ہے اس سے ہمیں بھی خدشہ لاحق ہو رہا تھا کہ اربابِ متعلقہ کہیں اس شور سے متاثر نہ ہو جائیں۔ بارے الحمد کہ جوانِ کہن سال، محترم غلام محمد کی ہمت نے ان تلاطم انگیزیوں کا پورا پورا مقابلہ کیا اور آج (۵ر مارچ کی صبح) اس فیصلہ کا اعلان وجۂ اطمینان ہوا کہ مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنا دیا گیا ہے۔

حوریاں رقص کنند سجدۂ شکرانہ زنند

ہمیں اس کا احساس ہے کہ محض نظم و نسق کی خاطر پورے مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنا دینے سے وحدتِ ملت کا وہ مقصدِ عظیم حاصل نہیں ہو جائے گا جس کے لئے ہم نے یہ تجویز پیش کی تھی۔ جس طرح محض پاکستان کے خطۂ زمین سے قیامِ نظامِ قرآن کا وہ مقصدِ عظیم حاصل نہیں ہو گیا تھا جس کی خاطر حصولِ پاکستان کے لئے اس قدر جد و جہد کی گئی تھی۔ لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ جس طرح ایک خطۂ زمین کے بغیر، نظامِ قرآنی کے قیام کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا، اسی طرح مغربی پاکستان سے صوبائی تفریق کو مٹائے بغیر وحدتِ ملت کا تصور بھی کبھی حقیقت بن کر سامنے نہیں آ سکتا۔ گویا جو فیصلہ اب کیا گیا ہے وہ اصلی مقصد کے حصول کے لئے پہلا قدم ہے۔ لہٰذا وجۂ اطمینان۔ لیکن اگر ہم نے اس قدم کو آخری قدم سمجھ لیا تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اب ضرورت ہے کہ اس کے بعد ان تفریقات کو مٹانے کے لئے بھی آہستہ آہستہ عملی طریقے اختیار کئے جائیں جن کی لکیریں ان صوبوں میں بسنے والوں کے دل اور دماغ میں گہرے نقوش بن کر جاگزیں ہو چکی ہیں اور جن کی وجہ سے وہ ایک ملت کے افراد نہیں بن پاتے۔ اس کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہاں قرآنی خطوط کے مطابق آئین نافذ کیا جائے۔ ہم اس آواز کو آٹھ سال سے برابر دہراتے چلے آ رہے ہیں اور اس پر ابھی تک کسی نے توجہ نہیں دی۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ جس طرح ان لوگوں کو ہماری طرف سے بلند کی ہوئی اور آوازوں کو بالآخر سننا اور ماننا پڑا، اس آواز کو بھی ایک دن سننا اور ماننا پڑے گا۔

کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

ہندو پروپیگنڈہ

ہندو قوم پروپیگنڈے میں مہارتِ تامہ رکھتی ہے۔ تقسیم سے پہلے کی ہندو مسلم سیاست اس پر شاہد ہے کہ ہندوؤں نے عموماً ہٹلر کے اس اصول پر عمل کیا کہ جھوٹ بولو اور اسے دُہراتے جاؤ، دہراتے جاؤ تا آنکہ اسے سچ سمجھ کر تسلیم کر لیا جائے۔ تقسیم کے بعد بھی ہندو نے اس عادتِ مستمرہ کا مظاہرہ کیا۔ ان دنوں اس اصول کا نشانہ مشرقی پاکستان ہے۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ وہاں کے ہندو بھاگ رہے ہیں۔ کیوں بھاگ رہے ہیں؟ یہ کوئی نہیں بتاتا۔ ہندوستانی پریس کے تبصروں کا انداز بالعموم یہ ہے۔ ہندو گذشتہ چھ ماہ سے بالعموم ہندوستان آ رہے ہیں۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ جو حالات انہیں مشرقی پاکستان چھوڑنے پر مجبور کر رہے ہیں وہ بدستور سابق ہیں۔ یہ حالات کیا ہیں، ان کا کوئی ذکر نہیں لیکن ہر کوئی کف بر دہان ہے اور پاکستان کے خلاف زہر اگل رہا ہے۔ بھارت کی لوک سبھا (ایوانِ زیریں) میں تو ہندوستانی ممبروں نے یہاں تک ہرزہ سرائی کی کہ ہندوستان کو حملہ کر کے مشرقی پاکستان پر قبضہ کر لینا چاہیئے۔ یہ اس ملک کے خلاف کہا جا رہا ہے جس سے نہ محض ہندوستان کی لڑائی نہیں ہو رہی بلکہ جس سے مفاہمت کی گفتگوئیں ہو رہی ہیں اور اپیلیں یہ کی جا رہی ہیں کہ دونوں ممالک کے باشندے زبان و قلم کو احتیاط سے استعمال کریں تاکہ دوستانہ فضا خراب نہ ہو۔ یہ ہرزہ سرائی پنڈت نہرو سنتے ہیں اور وہ کسی کی زبان نہیں پکڑتے۔ وہ عموماً ایسے موقعوں پر فخریہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہندوستان میں تقریر و تحریر کی آزادی ہے اور اسے سلب نہیں کیا جا سکتا۔ پنڈت جی کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر پاکستان بھی اسی قسم کی آزادی کا مظاہرہ کرنے پر آ جائے تو اس کا نتیجہ سوائے جنگ کے اور کچھ نہیں ہو گا۔ بد لگاموں سے بازپرس کرنا تو ایک طرف خود پنڈت جی بھی اس رو میں بہہ جاتے ہیں۔ وہ ہندوؤں کے ترکِ وطن کو انتہائی سنگین بتاتے ہیں لیکن اس کی کوئی وجہ نہیں بتا سکتے۔ یہ قابلِ ذکر ہے کہ اس طوفانِ بدتمیزی میں کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ مشرقی پاکستان میں کوئی فرقہ وار فساد ہوا ہے جس سے ہندو ہراساں ہو کے بھاگ نکلے ہوں۔ اور یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ پاکستان میں ہندوستانی ہائی کمشنر کئی بار مشرقی پاکستان کا دورہ کرنے کے بعد یہ اعلانات کر چکے ہیں کہ وہاں ہندو بڑے اطمینان سے رہ رہے ہیں۔

آخر ہندوؤں کے "بھاگنے" کی کیا وجہ ہے؟ ایک ہندوستانی اخبار نے اپنے وقائع نگار کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب اس نے تارکینِ وطن سے کلکتہ میں پوچھا کہ وہ کیوں ہندوستان آئے ہیں تو انہوں نے جواب میں کہا۔ "کیونکہ اور لوگ آ رہے ہیں"۔ اس جواب میں اس ساری افراتفری کا راز ہے اور اس کے لئے ان عوامل کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جو مغربی بنگال میں مصروفِ کار ہیں۔ بنگال اور بہار میں ایک عرصہ سے رقابت چلی آ رہی ہے۔ تقسیم کے بعد یہ رقابت سنگین صورت اختیار کر گئی ہے۔ بنگال بہار کے متصل مشرقی علاقے پر للچائی ہوئی نظریں ڈال رہا ہے اور بہار اس سے دست کش ہونے کے لئے تیار نہیں۔ اس سے دونوں صوبوں میں بعض اوقات ایسی تیز کلامی تک نوبت پہنچ گئی جو دو آزاد قوموں میں جنگ کا الٹی میٹم دینے سے پہلے ہو جاتی ہے۔ اس مقصد میں

کامیاب نہ ہو کر بنگالی ہندوؤں نے یہ تحریک شروع کر دی کہ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کو وہاں سے بلا کر مغربی علاقے میں آباد کیا جائے تاآنکہ کثرت آبادی کے بہانے سے بعد میں بہار سے کچھ علاقہ لے لیا جائے۔ یہ تحریک چنداں کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں نے ہندوستان آ کر نئے مکانات وغیرہ الاٹ کرائے لیکن تھوڑے ہی عرصے میں انہیں بیچ بچا کر واپس چل دیئے۔ گویا پاکستان میں ان کی جائدادیں برقرار رہیں اور ہندوستان میں نئی مراعات حاصل کر کے انہیں بیچ کر انہوں نے اور روپیہ کما لیا۔ خود ہندوستان میں اس کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ ابھی انہی دنوں مغربی بنگال کی وزیر مہاجرین، مسز رینوکارے نے کہا کہ بہار میں جو خاندان آباد کئے گئے تھے ان میں سے ۵۰ فی صدی چھوڑ کے چلے گئے۔ اڑیسہ سے اسی طرح جانے والوں کا تناسب ۶۰ فی صدی ہے۔ اس کے لئے اچھوتوں میں پروپیگنڈا کیا گیا۔ چنانچہ مغربی بنگال کی حکومت نے اعلان کیا کہ جو ہندو ۳۱ر دسمبر ۱۹۵۴ء تک ہندوستان آئیں گے انہیں مالی معاوضہ دیا جائے گا۔ ایک طرف یہ لالچ، دوسری طرف پروپیگنڈہ کرنے والے چرب زبان۔ غریب اچھوتوں کے قدم اکھڑ گئے۔

اب چالاک بنگالی ہندو اسے دو دھاری تلوار بنا رہے ہیں۔ ایک طرف وہ ان تارکین کو بہار پر مسلط کریں گے اور دوسری طرف وہی پاکستان کے خلاف پروپیگنڈے کا ذریعہ بھی ہو رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان نے پاکستان کو قبول نہیں کیا۔ اس کی نظریں خصوصیت سے مشرقی پاکستان پر ہیں جسے وہ کمزور کڑی سمجھتا ہے چنانچہ جب کبھی وہ دیکھتا ہے کہ پاکستان ذرا مشکل یا الجھن میں ہے تو پر تولنے شروع کر دیتا ہے۔ اب اس نے دیکھا کہ مولوی تمیز الدین کے مقدمے نے ملک میں تذبذب اور بے یقینی کی فضا پیدا کر رکھی ہے اور مشرقی پاکستان میں بھی پارلیمانی حکومت نہیں، اس لئے وہ اس نفسیاتی موقع کو استعمال کر رہا ہے۔ ضمناً اس سے ان پاکستانی ارباب سیاست کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے جو اپنے مفاد کی خاطر ملک کے مفاد کو پس پشت ڈال کر دشمنان پاکستان کے حوصلے بڑھا رہے ہیں۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وہ بھول رہا ہے کہ پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اس کی اساسی وحدت اور استحکام کا مظاہرہ ہے اور اب فیڈرل کورٹ کے فیصلے کے بعد وہ مستحکم تر ہو گیا ہے۔ نیز پاکستان ایسا تر نوالہ نہیں جسے ہندوستان آسانی سے نگل جائے۔

یہ فضا پیدا کر کے ہندوستان کے وزیر مہاجرین مسٹر کھنہ، ہمارے وزیر داخلہ، جنرل اسکندر مرزا، پر زور دے رہے ہیں کہ ان کے ساتھ مشرقی پاکستان کے دورے پر چلیں۔ ہمیں ایسے دورے پر کوئی اصولی اعتراض نہیں کیونکہ ہماری نیت صاف ہے اور ہمیں یہ دکھانے میں کوئی باک نہیں کہ ہمارے یہاں غیر مسلم کس طرح رہ رہے ہیں، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہماری حکومت اس غوغا آرائی سے متاثر ہو کر اس حقیقت کو نظر انداز کر رہی ہے کہ یہاں مشرقی پاکستان سے اب ہندو آنا شروع ہوئے ہیں، ہاں کھوکھراپار کے راستہ سے ہر روز مسلمان مہاجرین آتے رہتے ہیں۔ اور یہ گذشتہ سات سال سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اور تو اور یہ سلسلہ اپریل ۱۹۵۰ء کے لیاقت نہرو معاہدہ سے بھی نہیں تھمیں رکا۔ تازہ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ اُس وقت سے لے کر اب تک ساڑھے پانچ لاکھ مسلمان ہندوستان سے بھاگ کر پاکستان آ چکے ہیں، اس طرح اوسطاً سوا تین سو روزانہ، دس ہزار ماہانہ اور ایک لاکھ سے اوپر سالانہ غریب مسلمان پاکستان آتے ہیں، وہ پاکستان کی معیشت پر ناقابل برداشت بوجھ ہیں اور بحالی کی جملہ تدابیران سے درہم برہم ہوتی رہتی ہیں۔ کیا مسٹر کھنہ یا پنڈت نہرو اسے سنگین نہیں سمجھتے؟ کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک میں ایسے حالات پیدا کریں کہ وہ مسلمان جو ترک وطن نہیں کرنا چاہتے ایسا کرنے پر مجبور نہ ہوں؟ کیا حکومت پاکستان اور جنرل اسکندر مرزا یہ نہیں سوچتے کہ جہاں وہ مشرقی پاکستان کے دورے پر آمادگی کا اظہار کرتے ہیں وہاں ہندوستان کو یہ بھی جتا دیں کہ ذرا وہ بھی اپنی آنکھ کا شہتیر دیکھیں اور اس سیلاب مہاجرین کی روک تھام کے لئے بھی کسی دورے کا انتظام کریں!

اے کاش ہمارے ارباب اقتدار کو کوئی بتا سکے کہ ہندو آپ کی کشادہ ظرفی کو کمزوری پر محمول کر رہا ہے اور جب کوئی دنی الطبع قوم دوسری قوم کو کمزور سمجھ لے تو پھر اس کی دراز دستیوں کی انتہا نہیں رہا کرتی۔

کیا فرماتے ہیں ڈاکٹر خان صاحب؟

ڈاکٹر خان صاحب کے بھائی غفار خاں کی سیاست مہاتما گاندھی کی سیاست کی طرح عام انسانوں کے فہم سے بالا ہے۔ یوں تو ہر کوئی اپنے اقوال و اعمال کا خود ذمہ دار ہوتا ہے اس لئے ہمیں غفار خاں صاحب سے متعلق کوئی سوال ڈاکٹر خان صاحب سے نہیں کرنا چاہیئے لیکن چونکہ پچھلے دنوں آپ نے اپنے بھائی کے بارے میں ایک بات ذمہ داری سے کہی اس لئے ہم ان سے براہ راست مخاطب ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر خان صاحب نے ۱۸ر مارچ کو کوئٹہ میں فرمایا کہ ان کے بھائی غفار خان ایک یونٹ کے حامی ہیں نیز اب جبکہ ایک یونٹ قائم ہو رہا ہے "پختونستان" کا سوال ختم ہو جاتا ہے۔ بڑے بھائی تو یہ کہہ رہے ہیں لیکن چھوٹے بھائی نے ۲۰ر مارچ کو لاہور میں روزنامہ "آفاق" کے نمایندے سے ملاقات میں "مطالبہ دہرایا کہ عوام کی رائے معلوم کئے بغیر مغربی پاکستان میں ایک یونٹ بنانا مناسب نہیں...... (مزید برآں) ایک یونٹ کے سوال پر عام انتخابات کرائے جائیں"۔ ۲۵ر مارچ کو ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔ انہیں ایک یونٹ کی تجویز سے اختلاف ہے۔ انہوں نے مغربی پاکستان کے لئے ذیلی وفاق کی تجویز پیش کی جس میں پنجاب اور بہاولپور، سندھ اور خیرپور اور سرحد بلوچستان تین تہذیبی اور نسلی وحدتیں ہوں۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے جب یونٹ کے حامیوں پر الزام لگایا کہ وہ چند آدمیوں کے فائدہ کے لئے ایسا کر رہے ہیں اور انہیں متنبہ کیا کہ نسلی اور لسانی تقاضوں کو نظر انداز کیا گیا تو پاکستان جمہوری ملک نہیں بن سکے گا۔

کیا یہ ایک یونٹ کی حمایت ہے؟ کیا ہمارے محترم ڈاکٹر خان صاحب اس پر غور فرمائیں گے۔

انجمن حمایت اسلام

انجمن حمایت اسلام، لاہور نے حکومت پاکستان کو ایک یادداشت بھیجی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ سال رواں میں انجمن کو کوئی ۹ لاکھ ۴۱ ہزار روپے کا خسارہ ہو گا۔ یادداشت مذکورہ میں حکومت سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ انجمن کی مالی مدد کرے۔ انجمن مذکورہ ایک قدیم تعلیمی ادارہ ہے اور اس کی ستر سالہ خدمات برکمہ و مہ پر بخوبی عیاں ہیں اس کی تحویل میں متعدد تعلیمی ادارے اور یتیم خانے چل رہے ہیں۔ اب اس نے کراچی میں بھی ایک سکول اور ایک یتیم خانہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تقسیم سے پہلے انجمن کا کام بخیر و خوبی چلتا تھا کیونکہ سارے برصغیر ہند و پاک سے اسے امداد ملتی رہتی تھی۔ تقسیم کے بعد آمدنی کے بیشتر ذرائع ختم ہو جانے کی وجہ سے انجمن مالی مشکلات میں مبتلا ہو گئی ہے۔ چونکہ اب کا دائرہ کار بہت وسیع ہے اور اس میں مزید وسعت بھی پیدا ہوتی جا رہی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ انجمن کی فوری مالی امداد کی جائے۔ انجمن کا سالانہ بجٹ ۲۵ لاکھ تک پہنچ چکا ہے لیکن آمدنی پندرہ سولہ لاکھ سے زیادہ نہیں۔ ان حالات میں کسی پبلک ادارے کا کام نہیں چل سکتا۔ ہمیں توقع ہے کہ حکومت حسب استطاعت ضرور اس کی مدد کو پہنچے گی۔

ہم محسوس کرتے ہیں کہ ملک کے امراء اس کار خیر میں ہاتھ بٹائیں تو وہ انجمن کو مالی مشکلات سے نجات دلا سکتے ہیں۔ گذشتہ سات سال میں جو پاکستان نے حیرت انگیز صنعتی ترقی کی ہے اس کی بدولت متعدد افراد غیر معمولی طور پر صاحب دولت ہو گئے ہیں۔ یہ ساری دولت پاکستان کی بدولت کمائی گئی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس کا کچھ حصہ رفاہی امور پر صرف نہ کیا جائے۔ اگر امرائے پاکستان اس ضرورت کو محسوس کر لیں تو ایک طرف حکومت کے محدود ذرائع پر خواہ مخواہ کا بار نہیں پڑے گا اور دوسرے خدمت کرنے والے اداروں کی حوصلہ افزائی ہو گی اور ملکی تعمیر و ترقی کی رفتار تیز تر ہو جائے گی۔

غور کیجئے! دولت کی غیر قرآنی تقسیم کس قدر مشکلات پیدا کر دیتی ہے لیکن بحالات موجودہ اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ دولت مندوں سے خیرات کی اپیل کی جائے۔

نوجوانوں کے لئے
فکر و نظر کی
نئی راہیں
سلیم کے نام
از پرویز

تاریخی شواہد

۹

یہ ہے وحی کی روشنی میں معیارِ قومیت۔ یورپ تو اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکتا کہ اس کے پاس وحی کی قندیلِ آسمانی نہ تھی، لیکن اس شوریدہ بختی کا کیا علاج کہ خود مسلمانوں کا بھی آج یہ عالم ہے کہ یورپ کی تقلید میں اشتراکِ وطن یا نسل کو وجہ جامعیت قرار دے کر قومیت پرستی کو شعارِ ملی بتایا جا رہا ہے، حالانکہ اب یورپ بھی اس غلط معیارِ تقسیم انسانی کے ہاتھوں خود تنگ آچکا ہے۔ اور اس کے اربابِ فکر و نظر، قرآنی تعلیم سے غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر یا خود زمانہ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر (کہ فطرت کے مطالبات اور زمانہ کے تقاضے بھی انسان کو آہستہ آہستہ قرآن کی طرف آنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں) اس حقیقت کو محسوس کر رہے ہیں کہ قومیت کی بنیاد وحدتِ افکار (ایمان و مذہب) پر ہی رکھی جانی چاہیئے، نہ کہ جغرافیائی حدود اور رنگ و نسل پر۔ مشہور فرانسیسی مؤرخ رینان (ESSAY ON NATIONALITY) میں لکھتا ہے کہ

> انسان کی رُوح دریاؤں کے رُخ اور پہاڑوں کی سمتوں میں مقید نہیں ہوسکتی۔ وطن کی سرزمین انسان کے لئے جائے قیام اور کشمکش و کاروبار کے لئے ایک میدان مہیا کر دیتی ہے۔ لیکن انسان (اس کے لئے) روح مہیا کرتا ہے، اس مقدس تشکیل کے لئے جسے قوم (یا ملت) کہا جاتا ہے۔ آدمی ہی سب کچھ ہے۔ مادی اسباب میں سے کچھ بھی اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔

اور (LORD BRYCE) اپنی کتاب (International Relations) میں لکھتا ہے:

> جس چیز پر کسی قوم کی اندرونی اور سب سے گہری زندگی کا انحصار ہے وہ مذہب ہی ہے۔

یورپ کا ایک اور مدبر (HENRY SIDWICK) اگرچہ مذہب کو قومیت کی بنیاد قرار نہیں دیتا۔ (اس لئے کہ اس کے سامنے یورپ کی مختلف اقوام موجود ہیں جو ایک مذہب (عیسائیت) کے باوجود الگ الگ قومیت کی مدعی ہیں) لیکن جس شے کو وہ قومیت کی بنیاد قرار دیتا ہے وہ اسلام میں مذہب کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے نزدیک مختلف افراد کے ایک قوم بننے کے لئے ضروری ہے کہ ان میں "من تو شدم تو من شدی" کا شعور پیدا ہو جائے۔ یہ شعور کہ وہ ایک "جسدِ واحد" کے مختلف اعضا ہیں.... اگر ان میں یہ شعور موجود ہو تو ہم انہیں ایک قوم کے افراد قرار دیں گے خواہ ان میں کوئی اور وجہ جامعیت ہو یا نہ۔"

(Elements of Politics)

اسلام میں یہ شعورِ یگانگت اس وحدتِ فکر و عمل سے پیدا ہوتا ہے جس کا نام ایمان ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم مختلف شعوب و قبائل (اقوام و ملل) کا اعتراف (Recognise) کرتا ہے۔ لیکن صرف تعارفی غرض کے لئے۔ اس سے زیادہ اور کسی مقصد کے لئے نہیں۔ جیسے کسی شخص کے پانچ سات بیٹے ہوں تو وہ تعارف (پہچان) کی خاطر ان کے الگ الگ نام رکھ لیتا ہے۔ یا جس طرح محض انتظامی غرض کے لئے کسی مملکت کے مختلف خطے (صوبے) بنا دیئے جاتے ہیں اور ان کا کچھ تعارفی نام رکھ لیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دنیا کے مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمانوں میں تعارفی نشانات کو روا رکھا جا سکتا ہے لیکن اگر یہ تفریق ایک دوسرے پر فضیلت کا باعث یا قومی عصبیت اور غیریت کا موجب بننے لگے تو یکسر غیر اسلامی ہے اور اس کا مٹانا نہایت ضروری۔ قرآن کریم کی رو سے معیارِ فضیلت فقط تقویٰ ہے اور بس۔ تمام انسان ایک اصل کی مختلف شاخیں ہونے کے اعتبار سے برابر ہیں۔ اس لئے یہ چیز کہ کوئی شخص کسی آدمی کے گھر میں پیدا ہو گیا ہے۔ یا اس کا وطن کونسا ہے، نہ وجہ امتیاز بن سکتا ہے نہ باعثِ تفریق۔ قرآن کریم نے نہایت واضح الفاظ میں اس حقیقت کو بیان فرمایا ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا
وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ۝ (۴۹/۱۳)

> اے نوع انسانی! ہم نے تمہیں (سب کو ایک ہی طرح) مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو لیکن یاد رکھو کہ تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہے۔ یقیناً اللہ (سب کچھ) جاننے والا خبردار ہے۔

چونکہ نسل کی بنیاد پر قبائل کی تقسیم میں ایک دوسرے پر برتری اور فضیلت کا امکان زیادہ تھا (کہ اونچی اور نیچی ذاتیں اسی طرح وجود میں آتی ہیں) اس لئے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلی دعوت کے ذکر میں اس حقیقت کی وضاحت کر دی کہ اگر کسی کا اپنا بیٹا بھی، کسی دوسری آئیڈیالوجی (ایمان) کو مانتا ہے تو وہ اور اس کا باپ دونوں ایک جماعت کے رکن، ایک برادری کے فرد، اور ایک قوم کے آدمی نہیں بن سکتے۔

اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ (۱۱/۴۶) سے بعض حضرات کا ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کا یہ بیٹا ان کی بیوی کے عملِ بد کا نتیجہ تھا۔ اس لئے کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ
كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا
عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا وَّ قِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ ۝ (۶۶/۱۰)

> ان لوگوں کے لئے جو (حق و صداقت کی دعوت کا) انکار کرتے ہیں۔ اللہ نوح اور لوط کی بیویوں کی مثال بیان کرتا ہے۔ وہ ہمارے بندوں میں سے دو صالح بندوں کے زیر تھیں لیکن انہوں نے ان کی خیانت کی تو وہ اللہ کے (فیصلہ کے) مقابلہ میں دونوں ان کے کسی کام نہ آسکے (وہ تباہ ہو کر رہیں۔ اور رسول کی بیوی ہونے کی حیثیت ان کے کسی کام نہ آسکی) اور (ان سے) کہا گیا کہ تم دونوں جہنم میں داخل ہونے والوں کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔

لیکن حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کی اس "خیانت" سے خیانتِ عصمت مراد لینا دور افتادہ سی بات ہے۔ چنانچہ خود اس آیت سے متصل آیت:

وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ
اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ وَ نَجِّنِیْ مِنْ
فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ وَ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (۶۶/۱۱)

> اور ایمان والوں کے لئے اللہ فرعون کی بیوی کی مثال بیان کرتا ہے۔ جب اس نے عرض کیا اے میرے رب میرے لئے اپنے پاس جنت میں گھر بنا۔ اور مجھے فرعون اور اس کے اعمال سے نجات دے اور مجھے ظالمین کی قوم سے بچائے رکھ

ان آیات میں حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کا تقابل فرعون کی بیوی سے کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ تقابل یہاں کفر و ایمان کا تقابل ہے۔ عصمت و بے عصمتی کا نہیں۔ پھر حضرت نوحؑ اور ان کے بیٹے کا معاملہ کفر و ایمان سے متعلق تھا۔ اگر ان لوگوں کا خیال صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اگر حضرت نوحؑ کا بیٹا "ان ہی کا بیٹا" ہوتا تو اسے عذابِ خداوندی سے نجات مل جاتی۔ خواہ وہ دعوتِ نوحی کا منکر ہی کیوں نہ ہوتا۔ یہ قرآنی تعلیم کے صریحاً خلاف ہے۔ یہاں تو بتانا ہی یہ مقصود تھا کہ خواہ بیٹا ہی کیوں نہ ہو اگر جماعتِ مخالف (منکرین) میں شامل ہے تو نسبی تعلق اسے کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ جس طرح حضرت ابراہیمؑ کے باپ کو نسبی رشتہ کچھ فائدہ نہ دے سکا۔ اور حضور خاتم النبیین کے عہد ہمایوں میں بدر و حنین کے میدانوں نے دیکھ لیا کہ کس طرح نسبی تعلقات، ایمانی رشتہ پر قربان کئے جاتے ہیں۔

نظامِ ربوبیت از پرویز

نوعِ انسانی کا سب سے مشکل مسئلہ معاش کا مسئلہ ہے انسانی فکر اس مسئلے کے حل میں آج تک کس طرح ناکام رہا ہے اور قرآن اس کا کیا حل دیتا ہے۔

جس طرح کارل مارکس نے کمیونزم کا منشور شائع کیا تھا اسی طرح یہ کتاب

قرآنی نظامِ ربوبیت ہے

جو عنقریب چھپ کر تیار ہو جائے گی۔

دعوتِ قرآن

(۸)

خدا

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ وَلَوْ اَنَّ
مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ
سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ
(لقمٰن ۳)

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی موجود ہے، سب اللہ ہی کا ہے۔ بے شک اللہ بے نیاز بڑی خوبیوں والا ہے اور جتنے درخت ساری زمین میں ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور یہ جو سمندر ہے، اس کے علاوہ اور بھی سات سمندر دوات بن جائیں تو اللہ تعالیٰ کی باتیں بھی ختم نہ ہوں بیشک اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

رسول

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ
النَّبِيّٖنَ (احزاب ۵)

محمد، تم مردوں میں سے کسی کے بھی باپ نہیں ہیں بلکہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء ۷)

اور اے پیغمبر! ہم نے آپ کو اور کسی بات کے واسطے نہیں بھیجا الا یہ کہ سارے عالم پر مہربانی کرنے کے لئے۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم ۱)

اور بیشک آپ اخلاق کے اعلیٰ معیار پر ہیں۔

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ (محمد ۲)

اور اے پیغمبر! آپ اپنی فروگزاشتوں کے لئے خدا سے سامانِ حفاظت طلب کرتے رہیے اور مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کے لئے بھی۔

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (توبہ ۱۳)

اور آپ جماعت مومنین کے ساتھ ساتھ چلتے رہیے کہ آپ کا ساتھ ساتھ چلنا اُن کے لئے موجبِ سکون اور اطمینان بخش ہے!

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰۗىِٕكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَي النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا
عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (احزاب ۷)

اللہ کا قانون اور کائنات کی تمام قوتیں اس نبی کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہی ہیں۔ اے مسلمانو! تم بھی اس نبی کے ساتھ ساتھ چلو اور پوری پوری تسلیم و رضا کا ثبوت دو۔

قرآن مجید

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ (آل عمران ۹)

یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تم کو صحیح صحیح پڑھ کر سناتے ہیں۔

(۱) اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (یٰس)

یہ اور ہے کیا بجز اس کے کہ قوانینِ الٰہیہ کو سامنے لے آنے والی اور پراگندہ انسانیت کو ایک مرکز پر جمع کر دینے والی کتاب ہے۔ تاکہ یہ ان کو بدعملی کے نتائج سے آگاہ کر دے جن میں زندگی کے آثار ہوں۔

(۲) اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِىَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ
يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (بنی اسرائیل ۱)

بلاشبہ یہ قرآن ایسے طریقے کی ہدایت کرتا ہے، جو بالکل سیدھا ہے اور ان ایمان والوں کو جو نیک کام کرتے ہیں، یہ خوشخبری دیتا ہے کہ ان کے لئے اجر عظیم رکھا ہوا ہے اور یہ بھی بتلاتا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ہم نے اُن کے لئے نہایت دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔

(۳) وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۡ فَاَبٰٓى
اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (بنی اسرائیل ۱۰)

اور ہم نے لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کا مضمون طرح طرح سے بیان کیا ہے۔ پھر بھی اکثر لوگ بے انکار کئے ہوئے نہیں رہتے۔

(۴) فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ
اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ
تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ
(واقعہ ۳)

"سو میں ستاروں کے غروب ہونے کو شہادت میں پیش کرتا ہوں۔ اور اگر تم غور کرو تو یہ بڑی بھاری شہادت (یعنی دلیل) ہے یہ بہت مکرم قرآن ہے جو ایک محفوظ کتاب میں درج ہے کہ اس تک بجز پاکیزہ لوگوں کے کوئی رسائی نہیں پاتا۔ یہ رب العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہے۔ سو کیا تم لوگ اس کلام کو ایک سرسری بات سمجھتے ہو۔؟"

(۵) فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ
كَرِيْمٍ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ وَلَا بِقَوْلِ
كَاهِنٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الحاقہ ۲)

میں ان ہی چیزوں کو شہادت میں پیش کرتا ہوں جن کو تم دیکھتے ہو اور اُن چیزوں کو بھی جن کو تم نہیں دیکھتے۔ کہ یہ قرآن کلام ہے ایک معزز رسول کا لایا ہوا۔ اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔ تم بہت کم ایمان لاتے ہو۔ اور نہ یہ کسی کاہن کا کلام ہے، تم لوگ بہت کم سمجھتے ہو۔ یہ رب العٰلمین کی طرف سے نازل شدہ کلام ہے

(۶) فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ وَالصُّبْحِ
اِذَا تَنَفَّسَ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي
الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ...... وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ فَاَيْنَ تَذْ
هَبُوْنَ ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ لِمَنْ شَاۗءَ مِنْكُمْ
اَنْ يَّسْتَقِيْمَ (تکویر ۱)

پھر میں ان ستاروں کو شہادت میں پیش کرتا ہوں جو پیچھے کو ہٹنے لگتے ہیں، چلتے رہتے ہیں، جا چھپتے ہیں۔ اور رات کو جب وہ جانے لگے اور صبح کو جب وہ آنے لگے کہ یہ قرآن کلام ہے اس رسول کا لایا ہوا جو قوت والا ہے، مالکِ عرش کے نزدیک ذی رتبہ ہے...... اور یہ قرآن شیطان مردود کا قول نہیں ہے۔ پھر تم لوگ بہکے کہاں جا رہے ہو؟ یہ تو ایک نصیحت نامہ ہے ساری دنیا والوں کے لئے، ہر اُس شخص کے لئے جو تم میں سے سیدھا راستہ اختیار کرنا چاہے۔

(۷) وَالسَّمَاۗءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ
فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (طارق ۱)

اور آسمان شاہد ہے جس سے بارش ہوتی ہے اور زمین شاہد ہے جو پھٹ جاتی ہے کہ یہ قرآن قولِ فیصل ہے اور وہ کوئی ہنسی ٹھٹا نہیں ہے۔

(۸) وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (انعام ۷)

کوئی خشک و تر ایسا نہیں ہے۔ جو خدا کے واضح قانون میں موجود نہ ہو۔

مجلسِ اقبال

(۳)

ہم کو حیرت ہے کہ "عیارستانِ بازارِ صفا" میں پیرزادہ صاحب منصور حلاج کے "انا الحق" کے تو نہایت سرگرم حامی ہیں اور ڈاکٹر اقبال کی "انا"، انا سے اس قدر بیزار !!

منصور کی حمایت میں فرماتے ہیں

ناہداں منصور را خوں کردہ اند　　بے کس و معذور را خوں کردہ اند
مردِ حق گو را بدار آویختند　　بے گنہ را خوں بناحق ریختند
ہٰذا اے زاہدِ آشفتہ دروں　　ہاے ستیزہ کارانِ جنوں
خونِ منصور از شما خواہم گرفت　　خفتہ خوں را خوں بہا خواہم گرفت

ڈاکٹر صاحب نے حکیم افلاطون کی جو مذمت "مسئلہ اعیان" کی وجہ سے کی ہے اس کے جواب میں پیرزادہ صاحب نے شیخ شہاب الدینؒ کی کتاب تلویح سے ایک کشفی فضیلت نقل فرما کر اس کی مدح سرائی فرمائی ہے۔ فلسفۂ استدلال جاننے والوں کے لئے یہ جواب ایک لطیفہ ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ مذکور نے ارسطو کو دیکھا کہ وہ افلاطون کی مدح میں سرگرم ہے۔ پوچھا کہ اس کے درجے کا اور کوئی حکیم نہیں؟ ارسطو نے کہا نہیں، پھر مسلمان بزرگوں اور صوفیوں کے نام لئے ارسطو نے سوائے بایزیدؒ کے اور کسی کو افلاطون کا ہم مرتبہ نہ بتایا۔ چنانچہ پیرزادہ صاحب اسی بنیاد پر اس کی بابت کہتے ہیں۔

جبرئیلے در لباسِ آدم است

ہم کو امید تھی کہ پیرزادہ صاحب حافظ کی مدافعت زیادہ جوش کے ساتھ کریں گے۔ لیکن یہاں مضمون بہت ہی مختصر نکلا

اے کہ حافظ را شماتت می کنی　　رندِ مے کش را ملامت می کنی
اے بعلمِ خویش مغرورِ عمل　　تو چہ دانی سرِ مستانِ ازل

اصل مرکزِ بحث یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہ کہتے ہیں کہ مذہب اسلام ایک حقیقی پیغام عمل ہے باوجود پیرو اسلام ہونے کے موجودہ مسلمانوں میں جو جمود ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان پر ایک بیرونی عنصر مذہبی رنگ میں آکر غالب ہو گیا ہے اور وہ تصوف ہے۔ اسی تصوف کے مسئلہ فنا اور نفس کشی[1] نے مسلمانوں کی قوتِ عمل کو باطل کر دیا ہے۔ کیونکہ تصوف کا اثر تمام ادبیات اسلامیہ میں ساری ہو گیا ہے اور ہر قوم کی ادبیات کا ایک تدریجی اثر اس قوم کے جذبات اور قوائے نفسانیہ پر ہوتا ہے، اس لئے رفتہ رفتہ اس کے اثر سے ہماری قوتِ عمل جاتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں مسئلہ نفی خودی کو بنی نوعِ انسان کی مغلوب قوموں نے ایجاد کیا ہے کہ اس تعلیم سے مخفی طور پر غالب قوموں کو کمزور بنائیں۔

یونان میں فلسفۂ اشراق اور ایران میں تصوف پھیلا اس وجہ سے ضمناً افلاطون اور حافظ کا بھی تذکرہ آیا۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال جیسا کہ پیرزادہ صاحب نے اپنی مثنوی کے دیباچہ میں خود انہی کے الفاظ میں نقل کیا، یہ ہے،

(۱) تصوف رہبانیت سے پیدا ہوا ہے۔
(۲) اسلام تصوف کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔
(۳) تصوف نے قرمطی تحریک سے فائدہ اٹھایا ہے۔
(۴) تصوف قیودِ شرعی کو فنا کر دینے کی کوشش کرتا ہے۔

اور اس کی بنیاد محض عقیدت پر نہیں ہے بلکہ انہوں نے خود تحقیقات کی ہے

(۱) میرے آباء و اجداد کا مشرب تصوف تھا اور خود میرا میلان بھی تصوف کی طرف تھا۔
(۲) فلسفۂ یورپ کے پڑھنے سے اسلامی تصوف کی صداقت میرے دل میں مستحکم ہو گئی تھی۔

---

[1] تصوف نفس کشی سکھاتا ہے، لیکن اسلام کی یہ تعلیم نہیں ہے، وہ صرف اصلاحِ نفس کا خواہاں ہے۔

کیونکہ فلسفۂ یورپ بحیثیت مجموعی منجر بہ تصوف ہے

(۳) قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کو پڑھنے سے مجھے معلوم ہوا کہ میں غلطی پر تھا تصوف اور فلسفۂ یورپ بھی غلط ثابت ہوا، اس واسطے میں نے تصوف کو ترک کر دیا۔

اس کے مقابلہ میں پیرزادہ صاحب فرماتے ہیں کہ "کہ میرا نسبی و نسبتی تعلق ایک قدیم صوفیانہ خاندان سے ہے، میرے آباء و اجداد نے نسلاً بعد نسلٍ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے وقت سے جو میرے جدِ اعلیٰ ہیں اس وقت تک تصوف کے دامانِ تربیت میں پرورش پائی ہے۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ "اسلام عین تصوف ہے اور تصوف عین اسلام ہے"

تصوف کا مسئلہ "عینیت" افلاطون کے مسئلہ "اعیان" سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے "ہمہ اوست" کے عقیدہ نے ایک ایسی ہمہ گیر عینیت کی بنیاد ڈالی کہ ہر ذرہ عین آفتاب ہو گیا اور خالق اور مخلوق متحد ہو گئے۔ چند اقوال بطور امثال کے لکھتا ہوں۔

"انا الحق"
"سبحانی ما اعظم شانی"
"سبحان الذی خلق الاشیاء وھو عینھا"

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ　　خود بر سرِ بازار خریدار برآمد
خود انا الحق زد لبِ منصور　　خود برآمد ز شوق بر سرِ دار
گفتہ انا احمد بلا میم　　از زبانِ محمدِ مختار
ندیم و مطرب و ساقی ہمہ اوست　　خیالِ آب و گل در رہ بہانہ

یہاں تک کہ بعض یکے تازانِ میدانِ تفرید کلمۂ توحید کو بھی شرک خیال کرتے ہیں

اے پسر لا الٰہ الا اللہ　　خود ز شرکِ خفی است آئینہ دار
ہست شرکِ جلی رسول اللہ　　خویشتن را ازیں دو شرک برار

ایک اور سرمست کا ترانہ سنیئے۔

من ہم زمینم ہم سما، من با تو ہستم جملہ جا　　من مصطفیٰ را ہم خدا، من لحد دیرینہ ام

فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کے امتیازی حدود بھی مٹ گئے۔

چونکہ بے رنگی اسیرِ رنگ شد　　موسیٰ با موسیٰ در جنگ شد

تجرید کا یہ نعرۂ مستانہ بھی سن لیجئے جس میں قافیہ کی پابندی بھی ترک کر دی گئی ہے۔

سر برہنہ نیستم دارم کلاہ چار ترک　　ترکِ دنیا ترکِ عقبیٰ ترکِ مولیٰ ترکِ ترک

ان شطحیات کا ایک انبار ہے، ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جن کو نقل کرتے ہوئے مجھ نا آشنائے سرِ وحدت کا قلم لرزتا ہے، اور یہ ان حضرات کے اقوال ہیں جن کا ایک ایک لفظ "عیارستانِ بازارِ صفا" میں بے بہا جوہر سمجھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کا عین تصوف اور تصوف کا عین اسلام ہونا کیا حیرت انگیز ہے۔

تمام مصلحوں اور پیشواؤں کو سب سے پہلی خطرناک منزل جو پیش آتی ہے وہ علم و عقیدت کی جنگ ہے۔ مصلح دیدۂ تحقیق سے دیکھ کر ڈراتا ہے کہ اے قوم جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے اسے پھینک دے کیونکہ زہریلا سانپ ہے۔ مگر رسم پرست قوم کہتی ہے کہ نہیں یہ تازیانہ ہے۔

بوقتِ صبح شود ہم چو روز معلومت　　کہ با کہ باختۂ عشق در شبِ دیجور

اس جنگ کے ہزارہا تماشے دنیا دیکھ چکی ہے لیکن ابھی تک بدستور اس کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک شخص علمی تحقیقات سے مفید اور صحیح خیالات قوم کے سامنے پیش کرتا ہے، قوم اس کو جاہل، دشمنِ اسلام اور کافر بتاتی ہے۔ امام غزالیؒ، ابنِ رشد اور امام ابنِ تیمیہ رحمہم صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کسی کی کتابیں جلائی جاتی ہیں، کوئی جلاوطن کیا جاتا ہے، کسی کو قید خانے میں جانا پڑتا ہے۔ عقیدہ وہی صحیح ہے جس کی بنیاد علم یقینی پر ہو، محض رسمی عقیدہ "عیارستانِ بازارِ تحقیق" میں کوئی قیمت نہیں رکھتا۔

---

[1] خود ڈاکٹر اقبال کو بھی یہ میم پسند نہیں آیا ایک جگہ لکھتے ہیں

کہیں تہذیب کی پوجا کہیں تعلیم کی ہر　　قوم دنیا میں ہی احمدِ بے میم کی ہر

معلوم نہیں کہ قرآن شریف کے مطالعہ کے بعد جس طرح تصوف کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا خیال بدلا ہے اسی طرح اس عقیدہ میں بھی کوئی تبدیلی ہوئی یا ابھی تک معذورِ صہبائے محبت" ہیں اور "خاکِ عرب کے سونے والے کو کچھ اور ہی سمجھتے ہیں"۔

اسلام کی سرگذشت

جزیرۂ عرب اور قبائل عرب کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں۔ عربوں کے دیگر ممالک و اقوام کے ساتھ تجارتی تعلقات اور سرحدوں میں عرب کی متمدن و مہذب مملکتوں کے قیام کا تذکرہ بھی کیا جا چکا ہے۔ جن میں شعر و ادب کے استدلال سے گفتگو کی جا رہی تھی۔ موجودہ اشاعت میں عربوں میں یہودیت و نصرانیت کے فروغ سے بحث کی گئی ہے۔

اتنا جو کچھ صحیح ہو سکتا ہے۔ وہ صرف اس قدر ہے کہ حضارت و تمدن شعر کی ان انواع کو واقعی فنا کر دیتا ہے جو عرب صحرا نشینی ہی میں زندہ رہ سکتی ہیں۔ جیسا کہ بہت سی ان انواع و اقسام کو وہ پیدا کر دیتا ہے۔ جو تہذیب و تمدن کے گہوارۂ عیش و نعیم ہی میں زندہ رہ سکتی ہیں۔

ہمارے خیال میں اس کی صحیح وجہ یہ ہے کہ اہل حیرہ اور غسانی قبائل میں شاعر تو ضرور ہوں گے۔ لیکن ان کی زبان الگ اور ممتاز ہوگی۔ قریشی زبان نہیں ہوگی۔ جو سارے حجاز پر چھائی ہوئی تھی کیونکہ حیرہ اور غسان حجاز سے بہت دور واقع تھے۔ اس لئے وہاں قریشی زبان اپنا تسلط نہیں جما سکی۔ پھر چونکہ اہل حیرہ اور غسانی اپنے آس پاس کے عربوں کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ تھے اس لئے وہ اپنے علاوہ دوسروں کی زبان کی پیروی کرنے میں عار بھی محسوس کرتے ہوں گے۔ بہت ممکن ہے کہ شعر کے لئے ان کے مخصوص اوزان ہوں۔ جو ان کی زبان اور ان کی عقلیت کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوں۔ جب اسلام آیا اور قرآن کریم قریش کی زبان میں نازل ہوا تو قریشی زبان کی سیادت اس طرح مسلّم ہو گئی کہ مورخین نے ان چیزوں کے بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جو قریشی زبان سے اس کے قواعد اور اوزان سے اختلاف رکھتی تھی۔

عدی بن زید کے ان اشعار کو جو نقل کئے گئے ہیں نیز شعراء جزیرہ کے حیرہ اور غسان کی طرف جانے کو ہماری اس رائے کے خلاف پیش نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ عدی ابن زید کی (جیسا کہ راویوں نے بیان کیا ہے) جزیرہ کے عربوں سے رشتہ داری تھی۔ رہا جزیرہ کے شعراء کا حیرہ اور غسانی دربار میں جانا تو یہ کوئی بڑا اعتراض نہیں ہے کیونکہ اہل حیرہ اور غسانیوں کی زبانیں بوجہ دیگر حجازی زبانوں سے مختلف تھیں۔ تاہم اس سے قریب ضرور تھیں کیونکہ وہ بنیاد جس سے عرب کی تمام زبانیں اور لہجے نکلے ہیں ایک ہی تھی لہذا یہ بعید نہیں ہے کہ اہل حیرہ اور غسانیوں کی اپنی الگ زبان بھی ہو اور اس کے باوجود وہ قریش کی زبان کو بھی جب وہ ان کے سامنے بولی جائے سمجھ سکتے ہوں۔

اس رائے کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اہل نسب (جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں) اس طرف گئے ہیں کہ لخمی اور غسانی قبائل یمنی الاصل ہیں۔ معتمد مورخین قدیم زمانہ سے آج تک بتاکید کہتے چلے آئے ہیں کہ اہل یمن کی زبان قریش کی زبان سے مختلف تھی چنانچہ

اس بارے میں ابن خلدون کا بیان ہے کہ "مضری زبان حمیری زبان کے بالمقابل تھی۔ مضری قبائل کے ہاں بہت سے حمیری زبان کے موضوعات اور کلمات کی گردانیں بدلی ہوئی تھیں۔ جس کی شہادت وہ منقولات دیتی ہیں جو آج بھی ہمارے پاس موجود ہیں کچھ لوگ اپنی کوتاہ نظری سے اس طرف گئے ہیں کہ حمیری اور مضری زبانیں ایک ہی تھیں اور وہ حمیری زبان کے قوانین کو مضری زبان کے قوانین و قواعد پر قیاس کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ "قیل" حمیری زبان میں "قول" سے مشتق ہے وغیر ذالک۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ حمیری زبان اپنی بہت سی اوضاع اور گردانوں میں اور اعراب و حرکات میں مضری زبان سے قطعی مختلف ہے۔ (مقدمہ ابن خلدون ص۴۵)

لخم اور غسان کی اصل کے بارے میں جو کچھ نسب نگاروں نے بیان کیا ہے اگر ہم اسے تسلیم نہ کریں تو دونوں زبانوں کا اختلاف اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ لخمی اور غسانی دراصل نبطی تھے۔ نہ یمنی تھے اور نہ ہی خالص عرب تھے۔ ان کا شعر و ادب نبطی زبان میں موجود تھا۔

۳۔ یہودیت و نصرانیت

جزیرۂ عرب میں اجنبی ثقافتوں کے پھیلنے کے اسباب میں سے یہودیت و نصرانیت کا پھیلنا بھی تھا۔

یہودیت: یہودیت اسلام سے صدیوں پہلے جزیرۂ عرب میں پھیل چکی تھی۔ وہاں یہودی مستعمرات قائم ہو چکے تھے جن میں سے مشہور ترین مستعمرہ یثرب تھا۔ جس کا نام بعد میں مدینہ رکھ دیا گیا۔ یہاں سوال یہ ہے کہ جزیرۂ عرب کے یہ یہودی کون تھے؟ کیا یہ یہودی النسل تھے یا عرب ہی تھے۔ جو یہودی بن گئے تھے۔ اگر پہلی بات صحیح ہے تو یہ کہاں سے آئے تھے؟ کیا فلسطین سے یا کہیں اور سے؟ روایات اس بارے میں بڑی مختلف ہیں بظاہر الباً نظر آتا ہے کہ جزیرۂ عرب میں دونوں ہی قسمیں موجود تھیں یہودی النسل لوگ بھی جو ترک وطن کر کے ادھر نکل آئے تھے اور عرب بھی جو یہودی بن گئے تھے۔ چنانچہ یاقوت اپنی معجم میں بیان کرتے ہیں کہ یثرب کے یہودی عرب ہی تھے جو یہودی بن گئے تھے۔ اغانی کے مصنف کا بیان ہے کہ جب تمام شام میں رومی قوم بنی اسرائیل پر غالب ہو گئی تو انھوں نے ان کو بری طرح روندا اور قتل کیا۔ ان کی عورتوں سے شادیاں کریں تو بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو بہدل شام سے بھاگ کر حجاز میں چلے آئے تھے ان بیانات میں سے کون سا بیان صحیح ہے۔ اسکی تحقیق کا یہ موقعہ نہیں۔

اگلے شمارے میں محترم پرویز صاحب کا خط

سلیم کے نام

ملاحظہ کیجئے

بزم طلوع اسلام

اس اشاعت کے ساتھ طلوع اسلام کو ہفتہ وار ہوئے تقریباً دو مہینے ہو گئے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ قارئین اپنے کام کی رفتار تیز کر دیں گے اور بزموں کی تشکیل اور کارگذاری میں مستعدی سے کام لیں گے لیکن اس دو مہینے کے تجربہ سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ قارئین کا جمود ختم نہیں ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مقامی بزموں کی افادیت کو کما حقہٗ محسوس نہیں کیا گیا۔ اگر یہ صورت ہے تو اس مغالطہ کو جلد از جلد ختم کر دینا چاہیئے۔ یہ صحیح ہے کہ طلوع اسلام قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا کام کر رہا ہے۔ لیکن اس فکر کو افراد ملت کے دلوں میں جاگزیں کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مختلف مقامات پر قارئین طلوع اسلام مل بیٹھیں اور کوشش کریں کہ مقامی حالات کے مطابق یہ پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔ یہی نہیں بلکہ دوسری جگہوں کے قارئین سے بھی رابطہ پیدا کریں اور اس طرح اس فکر کی اساس پر ایک برادری قائم کرتے ہوئے حالات و ضرورت کے مطابق ایک دوسرے کی مدد کریں تاکہ یہ آواز ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچ جائے اسی غرض کے لئے جہاں کہیں بزم کی تشکیل ہوتی ہے اس کا پورا پتہ طلوع اسلام میں شائع کر دیا جاتا ہے۔ قارئین کو چاہیئے کہ ان اطلاعات سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ اور ہم خیال حضرات سے براہ راست رابطہ پیدا کریں۔

جمود کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جو بزمیں بنتی ہیں، وہ ضروری کارروائی طلوع اسلام تک نہیں بھیجتیں یہ سہل انگارانہ روش بھی مستحسن نہیں کہلا سکتی۔ جہاں قارئین کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ اپنے اپنے مقامات پر ہم خیال میسر آنے پر بزم کی تشکیل کریں وہاں یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے کہ اس کی تشکیل، ترجمان کے پتے اور معمولی اور ممکن کارگذاری سے ہمیں مطلع کیا جائے۔ کارگذاری سے متعلق یہ پابندی کرنی چاہیئے کہ ایک معین عرصے کے بعد (مثلاً ایک ہفتہ کے بعد، اگر ہفتہ واری اجتماعات کا انتظام ہے تو، ورنہ دو ہفتوں یا ماہ ایک مہینے کے بعد) ایک رپورٹ بھیج دی جائے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے بزم کی تشکیل کے ساتھ "طلوع اسلام لائبریری" قائم کی جائے۔ اور اسے تمام سرگرمیوں کا مرکز بنایا جائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ بزم کے باقاعدہ اجلاس ہوں جن میں تبادلۂ خیالات کیا جائے۔ اور مقامی حالات کے مطابق قرآنی شعور بیدار کرنے کی تجاویز پر غور کیا جائے اور عمل کی صورتیں پیدا کی جائیں تحریک طلوع اسلام جس مرحلہ میں ہے اس میں تمام کوششیں ہم خیال پیدا کرنے اور ہم خیالوں کو متحد و معاون بنانے پر مرکوز کرنی اور کے رکھنی ہوں گی۔ اس سلسلہ میں جہد مسلسل سے ہی نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ وقت کام کا ہے آرام کا نہیں۔ لیکن اس سارے سلسلہ میں یہ حقیقت ہر وقت پیش نظر رہنا چاہیئے کہ آپ کا کوئی قدم قرآن کے صراط مستقیم سے ادھر ادھر نہ ہونے پائے

سیالکوٹ کی بزم نے ریلوے روڈ چوک گرین ڈاسٹرکٹ مقابل ٹیوب ویل میونسپل کمیٹی پر لائبریری کھولی ہے گجرات کی نئی بزم کے ترجمان بابو محمد حسین صاحب شملہ اسٹور، چوک شاہ دولہ (گجرات) ہیں اور جھنگ گھمیانہ کے ظفر عباس قریشی صاحب (محلہ بھیرانہ لال دھرم شالہ جھنگ بازار) ہیں۔ ہری پور کی بزم نے طاہر العبدی صاحب کے مکان ۱۰۴ محلہ ہونیاں پر لائبریری قائم کی ہے۔ بزم کا ہفتہ وار اجلاس بھی وہیں ہوتا ہے

قرآن اور حدیث کی صحیح پوزیشن

(سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

قرآن کی حیثیت

یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جن چیزوں پر کسی کا اسلام کا مدار ہے اور جن امور پر انسان کی نجات موقوف ہے انہیں بیان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں۔ اور قرآن میں بھی ان کو کچھ اشارۃً و کنایۃً بیان نہیں کیا گیا۔ بلکہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ ان کو کھول دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ان علینا للھدیٰ[۱]

دین کے اصول

باقی رہے دین کے اصول تو وہ سب کے سب کتاب اللہ میں موجود ہیں جو روایات سے بالاتر اور تمام مسلمانوں میں مشترک ہیں[۲]۔ حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنا اور انسانی زندگی کے لئے قانون اور شرع تجویز کرنا۔ یہ سب خداوند ملک کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا شرک ہے[۳]۔ اس اصل کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جو ابوداؤد نے سلمان فارسی سے بدیں الفاظ نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام ما حرم اللہ فی کتابہ وما سکت عنہ فھو مما عفا عنہ۔

حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا۔ اور حرام وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا۔ رہیں وہ چیزیں جن کا ذکر نہیں کیا گیا ہے تو وہ معاف ہیں[۴]۔

جزئیات کا تعین

ایک دوسری حدیث میں ہے۔ ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحرم حرمات فلا تنتھکوھا وحد حدودا فلا تعتدوھا وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا۔

اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض تم پر عائد کئے ہیں انہیں ضائع نہ کرو کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے۔ ان کے پاس نہ پھٹکو کچھ حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے۔ بغیر اس کے کہ اسے بھول لاحق ہوئی ہے۔ لہذا ان کی کھوج نہ لگاؤ[۵]۔

ان دونوں حدیثوں میں سے ایک اہم حقیقت پر متنبہ کیا گیا ہے جن امور کو شارع نے مجملاً بیان کیا ہے۔ اور ان کی تفاصیل نہیں بتائیں یا جو احکام بسبیل اجمال دیئے ہیں اور مقدار یا التعداد یا دوسرے تعینات کا ذکر نہیں کیا ہے ان میں اجمال اور عدم تفصیل کی وجہ یہ نہیں ہے کہ شارع سے بھول ہو گئی۔ تفصیلات بتانی چاہئے تھیں مگر نہ بتائیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شارع ان امور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرنا چاہتا اور احکام میں لوگوں کے لئے وسعت رکھنا چاہتا ہے اب جو شخص خواہ مخواہ سوال پر سوال نکال کر تفصیلات اور تعینات اور تقییدات بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اگر شارع کے کلام سے یہ چیزیں کسی طرح نہیں نکلتیں تو قیاس سے، استنباط سے کسی نہ کسی طرح مجمل کو مفصل، مطلق کو مقید، غیر معین کو معین بنا کر ہی چھوڑتا ہے۔ وہ در حقیقت مسلمانوں کو بڑے خطرے میں ڈالتا ہے۔ یہودیوں نے ایسا ہی کیا، جس کے نقش قدم پر چلنے میں قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تنبیہات کے باوجود مسلمانوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ آپ کی تشفی کے لئے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ قرآن مجید اپنے مدعا کو بغیر کسی ابہام کے صاف صاف بیان کرتا ہے۔ اور اس نے کسی ایسی حقیقت کو جس کا جاننا آدمی کی ہدایت کے لئے ضروری تھا واضح کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے[۶]۔

فہم قرآن کے لئے حدیث کی ضرورت نہیں

قرآن اور سنت رسول کی تعلیم سب پر مقدم ہو۔ مگر تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں سے نہیں[۷]۔ قرآن کے لئے کسی تفسیر کی حاجت نہیں۔ ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے جس نے قرآن کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہو اور طرز جدید پر قرآن پڑھانے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو[۸]۔

جزئیات میں تبدیلی ہو سکتی ہے

یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے منشاء کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسے بھی ہیں جن میں تغیر حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے جو حالات عہد رسالت اور عہد صحابہ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے۔ لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانہ اور ہر ملک کے ہوں۔ لہذا احکام اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں ان کو جوں کا توں تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح اور حکم کے لحاظ سے ان کے جزئیات میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے۔ جس کو روح اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ جزئیات میں دلالۃ النص اور اشارۃ النص تو درکنار صراحۃ النص کی پیروی بھی تفقہ کے بغیر درست نہیں ہوتی۔ اور تفقہ کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارع کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے اور انہی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیر احوال کے ساتھ ایسا تغیر کرتا رہے۔ جو شارع کے اصول تشریع پر مبنی اور اس کے طرز عمل سے اقرب ہو[۹]۔

عہد صحابہ میں جزئیات میں تغیر و تبدل

زرعی قوانین مدون کرنے کے لئے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ مزاج شریعت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ یہ بات صرف قرآن مجید کی تعلیم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں تدبر کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے ان دونوں چیزوں پر جس شخص کی نظر وسیع اور عمیق ہوگی وہ شریعت کا مزاج شناس ہو جائے گا اور ہر وقت پر اس کی بصیرت اس کو بتائے گی کہ مختلف طریقوں میں سے کون سا طریقہ اس شریعت کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ اور کس طریقہ کو اختیار کرنے سے اس کے مزاج میں بے اعتدالی پیدا ہو جائے گی۔ اس بصیرت کے ساتھ احکام میں جو تغیر و تبدل پیدا کیا جائے گا وہ نہ صرف مناسب اور معتدل ہوگا۔ بلکہ اپنے محل خاص میں شارع کے اصل مقصد کو پورا کرنے کے لئے وہ اتنا ہی بجا ہوگا۔ جتنا کہ خود شارع کا حکم ہوتا۔ اس کی مثال میں بہت سے واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں مثلاً حضرت عمرؓ کا یہ حکم کہ دوران جنگ میں کسی مسلمان پر حد نہ جاری کی جائے اور جنگ قادسیہ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا ابو محجن ثقفی کو شرب خمر پر معاف کر دینا اور حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ قحط کے زمانہ میں کسی سارق کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ یہ امور اگرچہ بظاہر شرع کے احکام کے خلاف معلوم ہوتے ہیں لیکن جو شخص شریعت کا مزاج داں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایسے خاص حالات میں حکم عام کے امتثال کو چھوڑ دینا مقصود شارع کے عین مطابق ہے۔ اسی قبیل سے وہ واقعہ ہے کہ حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں کے ساتھ پیش آیا۔ قبیلہ مزینہ کے ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ حاطب کے غلاموں نے اس کا اونٹ چرا لیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پہلے تو ان کے ہاتھ کاٹنے جانے کا حکم دیا۔ پھر فوراً ہی آپ کو تنبہ ہوا اور آپ نے فرمایا کہ تم نے ان غریبوں سے کام لیا اور ان کو بھوکا مار دیا۔ اور اس حال کو پہنچایا کہ اگر ان میں سے کوئی شخص حرام چیز بھی کھا لے۔ تو اس کے لئے جائز ہو جائے یہ کہہ کر آپ نے ان غلاموں کو معاف کر دیا۔ اور ان کے مالک سے اونٹ والے کو تاوان دلوایا۔ اسی طرح تطلیقات ثلاثہ کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ نے جو حکم صادر فرمایا۔ وہ عہد رسالت کے عمل درآمد سے مختلف تھا۔ مگر چونکہ احکام میں یہ تمام تغیرات شریعت کے مزاج کو سمجھ کر کئے گئے تھے اس لئے ان کو کوئی نامناسب نہیں کہہ سکتا۔ برخلاف اس کے جو تغیر اس فہم اور بصیرت کے بغیر کیا جاتا ہے وہ مزاج شرع میں بے اعتدالی پیدا کرتا ہے اور مفضی الی الفساد ہو جاتا ہے[۱۰]۔

اتباع رسول کا مفہوم

مدینہ طیبہ سے مماثلت پیدا کرنے کا مفہوم کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم ظاہر شکل میں مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور دنیا اس وقت تمدن کے جس مرتبہ پر ہے اس سے رجعت کر کے اسی تمدنی مرتبہ پر واپس جانے کے خواہش مند ہیں جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا۔ اتباع رسول کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے۔ اور اکثر دیندار لوگ غلطی سے اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں ان کے نزدیک سلف صالحین کی پیروی اس کا نام ہے کہ تمدن و حضارت کی جو حالت ان کے عہد میں تھی ہم اس کو بالکل متحجر (FOSSILISE) صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں۔ اور ہمارے اس ماحول سے باہر کی دنیا میں جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں۔ ان سب سے آنکھیں بند کر کے ہم اپنے

---

[۱] رسائل و مسائل صفحہ ۲۸ [۲] تفہیمات حصہ اول صفحہ ۳۳۹ [۳] تفہیم القرآن صفحہ ۵۹۸ [۴] تفہیمات حصہ دوم صفحہ ۳۰۹ [۵] تفہیم القرآن صفحہ ۵۰۶ [۶] تفہیم القرآن صفحہ ۸ [۷] ترجمان القرآن ابتداء اپریل، مئی ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۱۲ [۸] تنقیحات صفحہ ۶

دماغ اور اپنی زندگی کے ارد گرد ایک حصار کھینچ لیں، جس کی سرحد میں وقت کی حرکت اور زمانہ کے تغیر کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔ اتباع کا یہ تصور جو دورِ انحطاط کی کئی صدیوں سے دین دار مسلمانوں کے دماغوں پر مسلط ہو رہا ہے۔ درحقیقت روحِ اسلام سے بالکل منافی ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم پیچھے جا کر آثارِ قدیمہ بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈرامہ بنائے رکھیں وہ ہم کو رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں سکھاتا۔ اس کا مقصد دنیا میں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں جو تغیر و ارتقاء کو روکنے کی کوشش کرتی رہے بلکہ اس کے برعکس وہ ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے جو تغیر و ارتقاء کو غلط راستوں سے پھیر کر صحیح راستوں پر چلانے کی کوشش کرے۔ وہ ہم کو قالب نہیں دیتا بلکہ روح دیتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں۔ ان سب میں یہی روح بھرتے چلے جائیں[10]

اتباعِ رسول

اب اس امر کی تحقیق کیجئے کہ نبی کی اطاعت جو اسلام میں فرض کی گئی ہے۔ اور جس پر دین کا مدار ہے۔ یہ کس حیثیت سے ہے؟ یہ اطاعت اس حیثیت سے ہرگز نہیں کہ نبی وہ خاص شخص مثلاً ابن عمران یا ابن مریم یا ابن عبداللہ ہے۔ اور یہ شخص خاص ہونے کی بنا پر اس حکم کو دینے اور منع کرنے کا، حلال کرنے اور حرام ٹھہرانے کا ذاتی حق حاصل ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان سے بار بار اس حقیقت کا اظہار کراتا ہے کہ وہ اطاعت جو مومن پر فرض کی گئی ہے جو اصل ایمان ہے اور جس سے کسی مومن کو سرتابی کیا معنی یک سر مو انحراف کا بھی حق نہیں وہ دراصل نبی بہ حیثیت انسان کے اطاعت نہیں ہے بلکہ نبی بحیثیت نبی کی اطاعت ہے۔ اس علم، اس ہدایت، اس حکم اور اس قانون کی اطاعت ہے جسے اللہ کا نبی اللہ کی طرف سے اس کے بندوں کو پہنچاتا ہے۔[11]

سنت کا مفہوم

دراصل سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا اختیار کئے۔ تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو جاری کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضور کے شخصی مزاج اور طبیعت پر مبنی تھیں کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانہ کے حالات پر جس میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنت بنا دینا مقصود نہ

تحریفِ دین

سنت کے متعلق لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اپنی زندگی میں کیا ہے وہ سب سنت ہے لیکن یہ بات ایک بڑی حد تک درست ہونے کے باوجود ایک حد تک غلط بھی ہے دراصل سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا اختیار کئے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور بالعموم سنت میں یہ فرق و امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کون سا جزو سنت ہے اور کون سا جزو عادت، بغیر اس کے یہ ممکن نہیں کہ آدمی دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔ نہ شرائع الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانہ کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنت بنا دیں۔ سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاحِ شرعی میں سنت نہیں ہیں۔ ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے لینا من جملہ ان بدعات کے ہے جن سے نظامِ دین میں تحریف واقع ہوتی ہے۔ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا یعنی رسم و رواج کو، اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت ہے اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے جس کے برے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔

حدیث اور قرآن کا فرق

قرآن کے کلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے کلام میں زبان اور اسلوب کا اتنا نمایاں فرق ہے کہ کسی انسان کے دو اس قدر مختلف اسٹائل کبھی نہیں ہو سکتے۔ یہ فرق صرف اسی زمانہ میں واضح نہیں تھا جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ملک کے لوگوں میں رہتے سہتے تھے۔ بلکہ آج بھی حدیث کی کتابوں میں آپ کے سینکڑوں اقوال اور خطبے موجود ہیں۔ ان کی زبان اور اسلوب قرآن کی زبان اور اسلوب سے اس قدر مختلف ہیں کہ زبان و ادب کا کوئی رمز آشنا نقاد یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہو سکتے ہیں۔

احادیث سے یقینی علم حاصل نہیں ہو سکتا

احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں، جن سے حد سے حد کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمانِ صحت ہے نہ کہ علم الیقین، اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس خطرے میں ڈالنا ہرگز پسند نہیں کر سکتا کہ جو امور اس کے دین میں اتنے اہم ہوں کہ ان سے کفر و ایمان کا فرق واقع ہوتا ہو انہیں صرف چند آدمیوں کی روایت پر منحصر کر دیا جائے۔ ایسے امور کی تو نوعیت ہی اس امر کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو صاف صاف اپنی کتاب میں بیان فرمائے۔ اللہ کا رسول انہیں اپنے پیغمبرانہ مشن کا اصل کام سمجھتے ہوئے ان کی تبلیغ عام کرے اور وہ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے مسلمانوں تک پہنچ گئے ہوں۔

قولِ رسول اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیاتِ قرآن کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیاتِ قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں، برخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول و فعل کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضور کا ہے یا نہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح اور معتبر ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے اس باب میں اختلاف کی بھی کافی گنجائش ہے کیونکہ ایک شخص کا ذوق اور اس کی بصیرت لازماً دوسرے شخص کے ذوق اور بصیرت سے بالکل مطابق نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ ماخذ دونوں کا ایک ہی ہو۔ لہٰذا کسی شخص کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ صرف وہی چیز شرعی ہے جس کو میری بصیرت شرعی کہتی ہے اور دوسرے شخص کی بصیرت جس کو شرعی کہتی ہے۔ وہ قطعاً و یقیناً غلط ہے۔ کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج شناس ہو جاتا ہے۔ اور اسلام کی صحیح روح اس کے دل و دماغ میں بس جاتی ہے۔ پھر وہ ایک حدیث کو دیکھ کر اول نظر میں سمجھ لیتا ہے کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا فرما سکتے ہیں یا نہیں؟ یا آپ کا عمل ایسا ہو سکتا تھا یا نہیں؟

احادیث پر بالکلیہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا

ہم اس سے پہلے بھی اشارۃً اس کا ذکر کئی مرتبہ کر چکے ہیں جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے۔ اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسول کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے۔ جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیت تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس کی نظر بہ حیثیت مجموعی شریعتِ حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتی ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کون سی چیز اسلام کے مزاج سے اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے، اور کون سی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی رد و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذاتِ نبوی کا مزاج ہے۔ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے۔ اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے۔ وہ نبی اکرم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں کون سا قول یا کون سا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کون سی چیز سنتِ نبوی سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی۔ ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے یا اس لئے کہ اس کی روح محمدی میں گم اور اس کی نظر بصیرتِ نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی

طلوع اسلام ادراہ ص ۱۵ ۔ ۱ تفہیمات جلد اول ص ۹۲-۹۳ ۔ ۲ رسائل و مسائل ص ۳۱۰-۳۱۱ ۔ ۳ رسائل و مسائل ص ۳۱۰-۳۱۱ ۔ ۵ رسائل و مسائل ص ۳۱۲ ۔ ۶ رسائل و مسائل ص ۳۰۰ ۔ ۷ رسائل و مسائل ص ۲۶ ۔ ۸ رسائل و مسائل ص ۲۷
۹ رسائل و مسائل ص ۲۹ ۔ ۱۰ تفہیمات حصہ دوم ص ۳۲۱ ۔ ۱۱ تفہیمات ص ۳۰۲

سے اس کا مزاج اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور وہ اس طرح دیکھتا اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے۔ اس مقام پر پہونچ جانے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلہ کا مدار اس پر نہیں ہوتا وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جام زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے۔ وہ اسے طبیعت اسلام اور مزاج نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔

احادیث دجال قیاسات ہیں

ان امور (احادیث دجال) کے متعلق جو باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں وہ در اصل آپ کے قیاسات ہیں جن کے بارے میں آپ خود شک میں تھے۔ یہ باتیں آپ نے علم وحی کی بنا پر نہیں فرمائی تھیں بلکہ اپنے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں اور آپ کا گمان وہ چیز نہیں ہے جس کے صحیح ثابت ہونے سے آپ کی نبوت پر کوئی حرف آتا ہو۔ یا جس پر ایمان لانے کے لئے ہم مکلف کئے گئے ہیں[1]۔

احادیث کے اختلاف کی وجہ

محدثین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا ہے ایک ایک حدیث کو چھان پھٹک کر وہ بتا چکے ہیں کہ کون کس حد تک قابل اعتبار ہے اور کون کس حد تک ناقابل اعتبار۔ اب ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ان بزرگوں نے احادیث کے جو درجے مقرر کر دیئے ہیں۔ انہی کے مطابق ہم ان کو اعتبار اور حجیت کا مرتبہ دیں مثلاً جو قوی الاسناد ہے اس کے مقابلہ میں ضعیف الاسناد کو چھوڑ دیں جسے وہ صحیح قرار دے گئے ہیں اسے صحیح تسلیم کریں اور جس کی صحت میں وہ قدح کر گئے ہیں اس سے بالکل استناد نہ کریں۔ ان کے معروف کو معروف اور ان کے منکر کو منکر مانیں۔ رواۃ کے عدل اور ضبط اور ثقاہت کے متعلق جن جن آراء کا وہ اظہار کر گئے ہیں۔ ان پر گویا ایمان لے آئیں۔ ان کی نگاہ میں احادیث کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا جو معیار ہے ٹھیک ٹھیک اسی معیار کی ہم بھی پابندی کریں۔ مثلاً مشہور کو شاذ پر، مرفوع کو مرسل پر اور مسلسل کو منقطع پر لازماً ترجیح دیں۔ اور ان کی کھینچی ہوئی حد سے یک سر مو تجاوز نہ کریں۔ یہی وہ مسلک ہے جس کی شدت نے بہت سے کم علم لوگوں کو حدیث کی کلی مخالفت یعنی دوسری انتہا کی طرف دھکیل دیا ہے[2]۔

محدثین پر کلیتہً اعتماد نہیں کیا جا سکتا

محدثین رحمہم اللہ کی خدمات مسلّم، یہ بھی مسلّم کہ نقد حدیث کے لئے جو مواد انہوں نے فراہم کیا ہے وہ صدر اول کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کار آمد ہے۔ کلام اس میں نہیں بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیتہً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے۔ وہ بہرحال تھے تو انسان ہی، انسانی علم کے لئے جو حدیں فطرۃً اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں۔ ان سے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں۔ وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے؟ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا۔ اور وہ بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہتے تھے کہ اس حدیث کی صحت کا ظن غالب ہے۔ مزید براں یہ ظن غالب جس بنا پر ان کو حاصل ہوتا تھا وہ بلحاظ روایت تھا نہ کہ بلحاظ درایت۔ ان کا نقطۂ نظر زیادہ تر اخباری ہوتا تھا۔ فقہ ان کا اصل موضوع نہ تھا۔ اس لئے فقیہانہ نقطۂ نظر سے جو رائے قائم کرتے ہیں وہ فقہائے مجتہدین کی بہ نسبت کمزور تھے پس ان کے کمال کا جائز اعتراف کرتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ احادیث کے متعلق جو کچھ بھی تحقیقات انہوں نے کی ہیں اس میں دو طرح کی کمزوریاں موجود ہیں۔ ایک بلحاظ اسناد دوسرے بلحاظ تنقید[3]۔

اسماء الرجال میں غلطیوں کے احتمالات ہیں

اس مطلب کی توضیح کے لئے ہم ان دونوں حیثیتوں کے نقائص پر تھوڑا سا کلام کریں گے کسی روایت کو جانچنے میں سب سے پہلے جس چیز کی تحقیق کی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ روایت جن لوگوں کے واسطے سے آئی ہے۔ وہ کیسے لوگ ہیں؟ اس سلسلہ میں متعدد حیثیات سے اس کی جانچ کی جاتی ہے۔ وہ جھوٹا تو نہیں ہے؟ روایتیں بیان کرنے میں غیر محتاط تو نہیں؟ فاسق اور بدعقیدہ تو نہیں؟ وہمی یا ضعیف الحفظ تو نہیں؟ مجہول الحال ہے یا معروف الحال؟ ان تمام حیثیات سے رواۃ کی جانچ پڑتال کر کے محدثین کرام نے اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا ہے جو بلاشبہ نہایت بیش قیمت ہے۔ مگر اس میں کون سی چیز ہے۔ جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو۔ اول تو رواۃ کی سیرت اور ان کے حافظہ اور ان کی دوسری باطنی خصوصیات کے متعلق صحیح علم ہونا مشکل، دوسرے خود وہ لوگ جو ان کے متعلق رائے قائم کرنے والے تھے انسانی کمزوریوں سے مبرا نہ تھے نفس ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اشخاص کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کرنے میں ان کے جذبات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جائے یہ امکان محض امکان عقلی نہیں ہے بلکہ اس امر کا ثبوت موجود ہے کہ بارہا یہ امکان فعل میں آگیا ہے[4]۔

محدثین کی چوٹیں اور فقرہ بازیاں

حماد جیسے بزرگ تمام علمائے حجاز کے متعلق رائے ظاہر کرتے ہیں کہ "ان کے پاس علم نہیں تمہارے بچے بھی ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں" عطاء اور طاؤس اور مجاہد جیسے فضلاء کے حق میں ان کی یہ رائے ہے۔ یہ حماد کون ہیں؟ امام ابوحنیفہ کے استاد اور ابراہیم النخعی کے جانشین۔ امام زہری کو دیکھئے، اپنے زمانے کے اہل مکہ پر ریمارک کرتے ہیں "ما رأیت قوماً انقض لعری الاسلام من اهل مکة" حالانکہ اس وقت جلیل القدر علماء و صلحاء سے خالی نہ تھا۔ شعبی اور ابراہیم النخعی دونوں بڑے درجے کے لوگ ہیں مگر ایک دوسرے پر کس طرح چوٹ کرتے ہیں۔ شعبی کہتے ہیں کہ ابراہیم النخعی رات کو ہم سے مسائل پوچھتا ہے اور صبح کو لوگوں کے سامنے اپنی طرف سے بیان کرتا ہے۔ ابراہیم النخعی کہتے ہیں کہ وہ کذاب مسروق سے روایت کرتا ہے۔ حالانکہ مسروق سے وہ ملا تک نہیں۔ ضحاک کو دیکھئے ایک مرتبہ اپنی بات کی ترنگ میں آکر صحابہ کرام کے متعلق کہہ گئے کہ "ہم ان سے زیادہ جانتے ہیں"۔ سعید بن جبیر جیسے محتاط بزرگ ایک مسئلہ میں شعبی پر جھوٹ کا الزام رکھتے ہیں، اور عکرمہ کے حق میں اپنے غلام سے کہتے ہیں کہ "لا تکذب علیّ کما کذب عکرمة علی ابن عباس"۔ امام مالک کی جلالت شان دیکھئے اور محمد بن اسحاق جیسے شخص کے حق میں ان کا یہ فرمانا دیکھئے۔ "ذلک دجال من الدجاجلة"۔ اس سے بڑھ کر عجیب یہ ہے۔۔۔ کہ وہ تمام علماء عراق پر سخت طعن کرتے ہیں۔ اور ان کے حق میں فرماتے ہیں کہ "انزلوهم منزلة اهل الکتاب لا تصدقوهم ولا تکذبوهم"۔ امام ابوحنیفہ کس قدر جلیل القدر اور محتاط فقیہ ہیں اعمش کے حق میں فرماتے ہیں کہ "اس نے نہ کبھی رمضان کا روزہ رکھا۔ نہ غسل جنابت کیا"۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اعمش "الماء من الماء" اور حذیفہ کی حدیث کے مطابق عمل کیا کرتے تھے۔ عبداللہ بن المبارک کس پایہ کے ثقہ بزرگ ہیں۔ ایک مرتبہ ان پر بھی غصہ نے غلبہ کیا اور امام مالک کے حق میں ان کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے کہ "میں اس کو عالم نہیں سمجھتا"۔ یحیی بن معین نے تو بڑے بڑے ثقات پر چوٹیں کی ہیں۔ زہری، اوزاعی، ابوعثمان النہدی، طاؤس غرض اس عہد کے متعدد بڑے بڑے لوگوں پر وہ طعن کر گئے ہیں حتیٰ کہ امام شافعی تک کے حق میں انہوں نے کہا کہ "لیس بثقة"۔

صحابہ بھی بشری کمزوریوں کا شکار تھے

ان سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ بسا اوقات صحابہ رضی اللہ عنہم پر بشری کمزوریوں کا غلبہ ہو جاتا تھا۔ اور وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کر جاتے تھے[5]۔ ابن عمر نے سنا کہ ابوہریرہ وتر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ فرمانے لگے ابوہریرہ جھوٹے ہیں۔ حضرت عائشہ نے ایک موقع پر انس اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما کے متعلق فرمایا کہ وہ حدیث رسول کو کیا جانیں وہ تو اس زمانہ میں بچے تھے؛ حضرت حسن بن علی سے ایک مرتبہ "وشاهد ومشهود" کے معنی پوچھے۔ انہوں نے اس کی تفسیر بیان کی عرض کیا گیا کہ ابن عمر اور ابن الزبیر تو ایسا اور ایسا کہتے ہیں۔ فرمایا دونوں جھوٹے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر مغیرہ بن شعبہ کو جھوٹا قرار دیا[6]۔ عبادہ بن الصامت نے ایک مسئلہ بیان کرتے ہوئے مسعود بن اوس انصاری پر جھوٹ کا الزام لگا دیا۔ حالانکہ وہ بدری صحابی ہیں[7]۔

بشری غلطیاں

اس قسم کی مثالیں پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اسماء الرجال کا سارا علم غلط ہے بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن حضرات نے رجال کی جرح و تعدیل کی ہے وہ بھی تو آخر انسان تھے بشری کمزوریاں ان کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھیں کیا ضرور ہے کہ جس کو انہوں نے ثقہ قرار دیا ہو وہ بالیقین ثقہ اور تمام روایتوں میں ثقہ ہو اور جس کو انہوں نے غیر ثقہ ٹھہرایا ہو وہ بالیقین غیر ثقہ ہو اور اس کی تمام روایتیں پایۂ اعتبار سے ساقط ہوں۔ پھر ایک ایک راوی کے حافظہ اور اس کی نیک

۱ رسائل و مسائل ص۵۵-۵۶ ۲ تفہیمات حصہ اول ص۳۱۸ ۳ تفہیمات حصہ اول ص۳۱۹ ۴ تفہیمات ص۳۱۹ ۵ تفہیمات ص۳۲۱ حصہ اول ۶ رسالہ طلوع اسلام ۷ تفہیمات حصہ اول ص۳۲۲

نیتی اور صحت ضبط وغیرہ کا حال بالکل صحیح معلوم کرنا اگر اور بھی مشکل ہے۔ اور ان سب سے زیادہ مشکل یہ تحقیق کرنا ہے کہ ہر راوی نے ہر روایت کے بیان میں ان تمام جزئیات کو ملحوظ بھی رکھا ہے یا نہیں جو فقیہانہ نقطۂ نظر سے استنباط مسائل میں اہمیت رکھتی ہیں ۱؎

راویوں سے غلطیاں ہو جایا کرتی تھیں

یہ تو فن رجال کا حال ہے اس کے بعد دوسری اہم چیز سلسلۂ اسناد ہے۔ محدثین نے ایک حدیث کے متعلق یہ تحقیق کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر راوی جس شخص سے روایت لیتا ہے .... یا وہ اس کا ہم عصر تھا یا نہیں ہم عصر تھا تو اس سے ملا بھی تھا یا نہیں اور ملا تھا تو اس نے یہ خاص حدیث خود اسی سے سنی یا کسی اور سے سن لی۔ اور اس کا حوالہ نہیں دیا۔ ان سب چیزوں کی تحقیق انھوں نے اس حد تک کی ہے جس حد تک انسان کر سکتے تھے مگر لازم نہیں کہ ہر ہر روایت میں یہ سب امور ان کو ٹھیک ٹھیک ہی معلوم ہو گئے۔ بہت ممکن ہے کہ جس روایت کو وہ متصل السند قرار دے رہے ہیں وہ درحقیقت منقطع ہو اور انھیں یہ معلوم ہو سکا ہو کہ بیچ میں کوئی ایسا مجہول الحال راوی چھوٹ گیا ہے جو ثقہ نہ تھا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ جو روایتیں مرسل یا معضل یا منقطع ہیں۔ اور اس بنا پر پایہ اعتبار سے گری ہوئی سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض ثقہ راویوں سے آئی ہوں اور بالکل صحیح ہوں ۲؎۔

فقہا نے حدیث کے خلاف فتوے دیئے

امام ابوحنیفہ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھتے ہیں جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ایک ضعیف الاسناد حدیث کو قبول کیا گیا ہے۔ یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کچھ کہتے ہیں۔ یہی حال امام مالکؒ کا ہے۔ باوجودیکہ اخباری نقطۂ نظر ان پر زیادہ غالب ہے۔ مگر پھر بھی ان کے تفقہ نے بہت سے مسائل پر ان کو ایسی احادیث کے خلاف فتوے دینے پر مجبور کیا جنھیں محدثین صحیح قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ لیث بن سعدؒ نے ان کی فقہ سے تقریباً ستر مسئلے اس نوعیت کے نکالے ہیں۔ امام شافعیؒ کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ۳؎۔

حاصل بحث

یہ اور ایسے ہی بہت سے امور ہیں جن کی بنا پر اسناد اور جرح و تعدیل کے علم کو کلیۃً صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ مواد اس حد تک قابل اعتماد ضرور ہے کہ سنت نبوی اور آثار صحابہ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے۔ مگر اس قابل نہیں ہے کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے ۴؎۔

طلوع اسلام

یہ مضمون مولانا مودودی صاحب کی تحریروں سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں تمام الفاظ انہی کے ہیں بجز ان کے جو خطوط وحدانی میں ہیں۔ .... احادیث کے متعلق بعینہٖ یہی مسلک طلوع اسلام کا ہے صرف اس فرق کے ساتھ کہ وہ کسی ایک فرد کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ جس بات کو اس کی نگہ جوہر شناس سنت رسول قرار دے دے اس کی اتباع ساری امت پر لازم قرار پا جائے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ یہ حق صرف امت کے قرآنی نظام کو حاصل ہے کہ وہ روایات کے اس ذخیرہ کو چھان پھٹک کر دیکھے کہ اس میں کون سی چیز صحیح ہو سکتی ہے اور کون کون سی جزئیات ایسی ہیں کہ جن میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں۔ لیکن آپ دیکھیے کہ اس کے باوجود جماعت اسلامی طلوع اسلام کو مسلسل اور پیہم منکر حدیث اور منکر شان رسالت ٹھہرا کر ایک بہت بڑے فتنے کا موجب قرار دیتی رہتی ہے اور اپنے امیر کو حدیث کا سب سے بڑا حامی اور سنت کا جید متبع قرار دیتی ہے۔ اس کے جواب میں جماعت اسلامی والے کہیں گے کہ یہ اقتباسات مودودی صاحب کی تحریروں سے توڑ مروڑ کر لکھ دیئے گئے ہیں۔ اس کے جواب میں ہم آپ سے صرف اتنا عرض کریں گے کہ ان کتابوں کو نکال کر اپنا اطمینان خود کر لیجئے کہ یہ اقتباسات سیاق و سباق کے مطابق ہیں یا توڑ مروڑ کر لکھے گئے ہیں۔ سچ اور جھوٹ خود سامنے آ جائے گا۔

ہمت ہو پرکشا تو......

سطح بین نگاہیں زندگی کی بے پایاں وسعتوں کو سماعت بصارت، گویائی جیسے حواس تک ہی محدود دیکھتی ہیں۔ لیکن قرآن بتاتا ہے کہ جب زندگی ارتقائی منزل طے کرتی ہوئی پیکر آدم میں نمودار ہوئی تو اس میں ایک ایسا انقلاب آیا جس کا نشان تک زندگی کی نچلی سطح میں نہیں تھا۔ یہ انقلاب انسان کی ذات (PERSONALITY) کا مظہر تھا۔ جس کی نمو انسان کے عزم و ارادہ سے ہوتی ہے۔ جس قدر پختہ عزم اتنی ہی مستحکم انسانی خودی، ویسے تو انسانی عزم کے نمود، آثار و مظاہر ہمیں قدم قدم پہ ملتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات اس کی نمود اس شدت اور تابندگی سے ہوتی ہے کہ انسان محو حیرت رہ جاتا ہے کہ ممکنات زندگی کی پہنائیاں کس قدر حدود فراموش ہیں۔

اگر زندگی کی بے پناہ قوت کان، آنکھ زبان تک ہی محدود ہوتی۔ تو آج دنیا ہیلن ایڈمز کیلر (HELLEN ADAMS KELLER) کا نام بھی نہ جانتی۔ اور نام جانتی بھی کیا وہ شاید بھیک مانگتے مانگتے حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہوتی۔ لیکن۔

جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے
اے مرد خدا ملک خدا تنگ نہیں ہے

اور ملک خدا کی وسعت کا پیمانہ کسی گدا کا لنگڑا پاؤں نہیں ہے بلکہ فرد جری کے عزم و ہمت سے ہوتا ہے جو قدم قدم پر اقدار انسانیہ کے تازہ جہان آباد کرتا جاتا ہے۔ مس کیلر اس کی زندہ مثال ہے۔ مس کیلر ایک اندھی اور بہری عورت ہے جو تہتر سال سے اندھی اور بہری چلی آتی ہے یہ تہتر سال بین ثبوت ہیں اس حقیقت کبریٰ کا کہ جب زندگی اپنی نمو چاہتی ہے تو حواس ظاہری سے محرومی اس عمل کو نہ روک سکتی ہے نہ دراز گوں کر سکتی ہے بلکہ وہ عمل کے لئے مہمیز بن جاتی ہے

موصوفہ ۲۷ جون ۱۸۸۰ء کو ٹسکمبیا (امریکہ) میں پیدا ہوئی وہ ابھی بمشکل انیس مہینے کی ہوئی تھی کہ ایک شدید مرض میں مبتلا ہو کر بصارت اور گویائی سے محروم ہو گئی۔ بچے اندھے ہو جاتے ہیں۔ اندھے پیدا بھی ہوتے ہیں (اور ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کی آنکھیں ہوتی ہیں اور وہ دیکھتے نہیں۔ وہ اندھے ہی نہیں ہوتے اوروں کو بھی اندھا کرتے ہیں) لیکن تین چوتھائی صدی ادھر کون کہہ سکتا تھا کہ ان گنت اندھوں میں سے یہ حقیر و ناتواں بچی جو خود بولنے اور دیکھنے کی نعمتوں سے محروم ہو چکی تھی دنیا کے معذور انسانوں کے لئے آیۂ رحمت بن جائے گی۔ وہ ہمدردی خدمت اور محبت کی قندیل لے کر دنیا کے کونے کونے میں پھرے گی اور اس کرۂ ارض کو منور کرتی جائے گی۔

کیلر چھ سال کی عمر کو پہنچی تو اس کے والدین نے مس این مینسفیلڈ سلیون کو (جو بعد میں شادی کر کے مسز جان میسی مشہور ہوئیں) بچی کی تعلیم کے لئے مقرر کیا مس سلیون کی عمر اس وقت بیس سال تھی۔ وہ خود اندھی ہو گئی تھی لیکن علاج سے اسے روشنی کی چند کرنیں میسر آ گئی تھیں وہ بوسٹن کی اندھوں کی پرکنز انسٹی ٹیوٹ کی فارغ التحصیل تھی۔ کیلر اس وقت تک اندھی اور بہری ہی نہیں تھی۔ گونگی بھی تھی۔ لیکن مس سلیون نے ایک ہی مہینے میں اپنے شاگرد کو بولنا سکھا دیا۔ مس سلیون کی نگرانی میں اندھوں، بہروں کے اسکول میں داخل ہو کر کیلر نے لکھنا پڑھنا اور بولنا ہی نہ سیکھا بلکہ تعلیم میں غیر معمولی ذہانت کا ثبوت دیا۔ ۱۹۰۲ء میں اس نے اپنے سوانح حیات لکھی اور ۱۹۰۳ء میں "رجائیت" (OPTIMISM) کے نام سے ایک اور کتاب لکھی۔ اس کے بعد کم از کم چار کتابیں اور تصنیف کیں ۱۹۰۴ء میں وہ گریجویٹ بن گئی۔ سلیون اور کیلر کا جوڑا خوب تھا۔ ایک اعلیٰ استاد تھی۔ تو دوسری عمدہ شاگرد۔ دونوں نے مل کر ایک نئی دنیا تعمیر کر لی۔ ان کا ساتھ ۱۹۳۶ء میں ٹوٹا۔ جب مس سلیون کا انتقال ہو گیا۔

کیلر کی زندگی۔ اندھوں، بہروں گونگوں اور معذوروں کے لئے وقف ہے۔ اس نے اندھے اور گونگے پن سے جو کچھ کھویا اس سے کہیں زیادہ محنت شاقہ اور بے پناہ جذبات ہمدردی نوع انسانی سے حاصل کیا۔ یہ اس کی دولت ہے جسے وہ دنیا بھر میں لٹاتی پھرتی ہے۔ ان دنوں وہ عالمی دورے پر ہے۔ یہ دورہ فروری میں شروع ہوا تھا اور ۲۳ جون کو اس کی پچھترویں سالگرہ سے چار روز پیشتر ختم ہو گا۔ اس چالیس ہزار میل کے دورہ میں وہ پاکستان، ہندوستان، برما، فلپائن اور جاپان کا چکر کاٹے گی تاکہ ان ممالک کی حکومتوں اور لوگوں کو اس پر آمادہ کرے کہ وہ اندھوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کریں۔ جس سے وہ آزادی اور مسرت کی زندگی گذار سکیں ان علاقوں میں اس کے اندازے کے مطابق کوئی ایک کروڑ اندھے ہیں۔ وہ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے ہی فضا سازگار کرنا نہیں چاہتی بلکہ اس کے لئے بھی کوشاں ہے کہ قابل علاج، اندھاپن عدم توجہی یا ذرائع کی کمی سے مستقل نہ ہو جائے۔ یہ دورہ نجی نہیں بلکہ امریکہ کے اس ادارے کی طرف

سے ہے جو مستمند یا پہلے اندھوں کی خدمت کے لئے بنایا گیا ہے محض یہی تصور کچھ کم خوش آئند نہیں کہ ایک ملک دوسرے ملک کے معذوروں کے لئے امدادی ادارہ قائم کرے لیکن اس پر مستزاد کیلر جیسی کارکن کا موجود ہونا جس کی زندگی کا مقصد معذوروں کی خدمت ہو۔

کیلر کو ہوائی سفر کا بہت شوق ہے اور وہ ہوائی جہاز میں خاص لذت محسوس کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ فضا کی پہنائیوں میں اڑنے والے طیارات کے پائیدانوں پر چڑھنا ایک عجیب تجربہ ہے۔ مجھے اپنے آگے اور پیچھے خلا کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے اور میں کسی قسم کا ڈر محسوس نہیں کرتی۔ یہ حقیقت ہے کہ

بے دولتِ شوق ہے لذتِ پرواز
کر سکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو تاراج

مسز روز ویلٹ نے حال ہی میں کیلر کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا۔

تم جہاں کہیں بھی جاتی ہو وہاں کے لوگوں کی ضروریات کو جانتی ہو اور ان کے مصائب کو سمجھ کر ان کا مناسب مداوا کیا کرتی ہو۔ تمام انسان تمہارے خاندان کے افراد ہیں۔ اور تم خود دیکھو تو انسانیت کا حصہ ہو۔

اس سال ۲۷ جون کو کیلر کی عمر پچھتر سال ہو جائے گی۔ اس عمر میں جہاں عام طور پر آرام کرنے اور "اللہ اللہ" کرنے کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے دنیا میں کشاں کشاں پھر رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت کے ساتھ اس کا جذبۂ خدمت بڑھتا جا رہا ہے۔ کس قدر صحیح کہا ہے اقبال نے کہ

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

عربی اخبارات و رسائل

طلوعِ اسلام کے پروگرام میں یہ بھی ہے کہ اہلِ پاکستان کو دیگر اسلامی ممالک کے کوائف اور تحریکات سے باخبر رکھا جائے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ ان ممالک کے اعلیٰ پایہ کے اخبارات اور رسائل منگائے جائیں۔ ہم نے اس ضمن میں مختلف اسلامی ممالک کے قونصل خانوں کو جو کراچی میں واقع ہیں لکھا کہ وہ مناسب اخبارات کی نشاندہی کردیں اور یہ بھی بتائیں کہ ان اخبارات کو قیمتاً منگانے کا آسان طریقہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک آدھ کے سوا کسی کا بھی جواب نہ آیا۔ اس پر ہم نے ایسے اخبارات کی فہرست خود ہی مرتب کی۔ اور ان کے دفاتر کو لکھا کہ وہ ان اخبارات کو ہمارے نام جاری کردیں۔ اور ان کی قیمت ہم سے وصول کرلیں۔ اس کے جواب میں زیادہ وقت کے باوجود سوائے ایک کے نہ کہیں سے جواب آیا ہے نہ کوئی اخبار یا مجلہ۔ اگر قارئین طلوعِ اسلام میں سے کوئی صاحب اس باب میں ہماری مدد کرسکیں۔ تو ہم ان کے شکر گذار ہوں گے۔ یعنی وہ اس کا انتظام کردیں کہ ہمیں ایران، عراق، سعودی عرب، شام، مصر، مراکش وغیرہ کے مشہور روزنامے، ہفت روزہ اخبارات اور رسائل (جن کی فہرست ہم دیدیں گے) قیمتاً مل جائیں۔

مطبوعاتِ طلوعِ اسلام

معراجِ انسانیت — از پرویز صاحب۔ سیرت صاحبِ قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ نیز عالم کی تاریخ اور تہذیب کے پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط اور حسین جلد مع گرد پوش۔ قیمت بیس روپے۔

ابلیس و آدم — از پرویز صاحب۔ سلسلۂ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق ٭ قصۂ آدم ٭ ابلیس ٭ جنات ٭ ملائکہ ٭ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستورِ پاکستان — جس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے۔ اور حکومت، علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ ۲۲۳ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۲۰۴ صفحات۔ قیمت دو روپے

سلیم کے نام — از پرویز صاحب۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں ان کا شگفتہ دلنشیں اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے — روزمرہ کی زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ چار سو آٹھ صفحات۔ قیمت چار روپے۔

اسبابِ زوالِ امت — از پرویز صاحب۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ۱۵۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے — ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دورِ آزادی کی سچی ہولی تاریخ۔ ۲۵۷ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاجِ شناسِ رسول — یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناسِ رسول! مزاج شناس کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۰۴ صفحات۔ قیمت چار روپے۔

مقامِ حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یک جا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد چار روپے

فردوسِ گم گشتہ — از پرویز صاحب۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۳۱۴ صفحات۔ قیمت چھ روپے

نوادرات — از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ چار سو صفحات۔ قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت — (از پرویز صاحب) مسلمان کے عادات و خصائل کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر پہلو قرآن کے آئینے میں۔ صفحات ۲۹۲۔ قیمت دو روپے

نوٹ

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار۔

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوعِ اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳، کراچی

چارہ ساز

چارہ مویشیاں کی قابلِ اعتماد آڑھت کی دکان

محمد سعید اینڈ کمپنی

۱۸، ٹوپن داس بلڈنگ۔ بادشاہی روڈ۔ کراچی

NIAZ HOSIERY MILLS
INTERLOCKS
TRADE MARK
OVAL 1954
KARACHI
MADE IN PAKISTAN

باب المراسلات

شب برات شب برات پھر آرہی ہے اور اس کے متعلق پھر استفسارات موصول ہو رہے ہیں کہ یہ کس واقعہ کی یاد میں منائی جاتی ہے، اور اس کی دینی حیثیت کیا ہے؟ جیسا کہ طلوع اسلام میں اس سے پہلے بھی لکھا ہے اور "قرآنی فیصلے" میں تفصیل سے بتایا جا چکا ہے، یہ تیوہار نہ کسی واقعہ کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ اور نہ ہی اس کی کوئی دینی حیثیت ہے بس ایک رسم ہے جو متواتر چلی آرہی ہے اس کی بنیاد بھی بعض وضعی احادیث پر ہے۔ چنانچہ شیخ محمد طاہر کے تذکرۃ الموضوعات میں لکھا ہے کہ بعض صوفیانہ کتابوں (مثلاً ابو طالب مکی کی قوت القلوب) یا ثعلبی وغیرہ کی تفاسیر سے جنہوں نے غلط فہمی سے نصف شعبان کی رات کو شب قدر سمجھ لیا۔ لوگوں نے صلوٰۃ الفیہ جاری کردی اور دس دس کی ٹولیوں میں سو سو رکعتیں پڑھنی شروع کر دیں۔ اور عید سے بھی زیادہ شب برات کا اہتمام کرنے لگ گئے یہاں تک کہ اس نے ایک میلے کی شکل اختیار کرلی۔ سب سے پہلے اس کا رواج ۴۴۸ھ میں بیت المقدس میں ہوا۔ پھر سارے شام اور مصر میں پھیل گیا۔ شیخ علی بن ابراہیم نے اپنے ایک رسالہ میں لکھا ہے کہ شب برات میں روشنی کی ابتدا برامکہ سے ہوئی جو مجوسیت چھوڑ کر اسلام لائے تھے انہوں نے دینِ اسلام کی راہ سے اپنی آتش پرستی کی رسم تازہ کی۔ اس نے رفتہ رفتہ آتش بازی کی شکل اختیار کرلی جو مشرق سے مغرب تک پھیل گئی۔ اور یوں شب برات وجود میں آگئی۔

یہ ہے اس تیوہار کی "دینی حیثیت"!

ریڈیو اور قرآن رسالپور سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ محترم پرویز صاحب کے ہفتہ واری قرآن کے خطبات کے متعلق آپ نے اس تجویز سے اتفاق کیا ہے کہ انہیں طلوع اسلام میں بھی شائع کیا جائے۔ لیکن میری تجویز یہ ہے کہ اگر ان خطبات کو ریڈیو سے براڈکاسٹ کیا جائے تو ان کی افادی حیثیت بہت بڑھ جائے۔

طلوع اسلام: اجی حضرت! آپ کس دنیا میں بس رہے ہیں؟ ریڈیو پاکستان اور اس سے قرآن کی تعلیم کا نشر ہونا؟ ایسا ہو گیا تو قیامت آجائے گی۔ ہمارے ریڈیو سے خیر سے نشر ہوں گے طلسم ہوشربا کے افسانے اور امیر حمزہ کی داستانیں۔ جن کی ابتدا قرآن کی کسی آیت سے اسی طرح تبرکاً کر دی جائیگی جس طرح ہم خطوں کے اوپر ۷۸۶ لکھ دیتے ہیں اور اس ۷۸۶ کو خط کے مضمون سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ریڈیو کا مقصد عوام کو خوش رکھنا ہے نہ کہ ان کی ذہنی اور فکری تربیت کرنا۔ عوام کو خوش کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انہیں مذہب کے نام پر کچھ کھلونے دیئے چلے جائیں۔ جس سے ان کا جی بہلتا ہے۔ ہمارے مولوی اور واعظ کے پاس ان کھلونوں کا کافی ذخیرہ موجود ہے! اس لئے ریڈیو پر "درس قرآن" کا سلسلہ جاری ہے۔ اس سے عوام بھی راضی رہتے ہیں اور مولوی صاحبان بھی خوش! اگر ریڈیو پر خالص قرآن کے حقائق بیان ہونے شروع ہو گئے۔ تو اس سے قوم میں اسلامی روح بیدار ہو جائے گی۔ اور اسلامی روح کے متعلق آپ جانتے ہیں کہ کس قدر خطرناک ہوتی ہے —— موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لئے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہمارے ریڈیو سے قرآنِ خالص کے حقائق نشر ہوا کریں۔ تو آپ ملک کی فضا میں اس طرح قرآن کو عام کر دیجئے کہ لوگ ان حقائق کے علاوہ اور کسی چیز سے مطمئن نہ ہوں اور اس طرح ان کے تقاضے اس قدر بڑھ جائیں کہ ریڈیو والے قرآن نشر کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

زندگی کا منتہیٰ مظفر گڑھ سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ آپ زندگی کو جوئے رواں بتاتے ہیں لیکن اس کا آخر کیا ہے۔ کیا یہ ایک دائرے کی صورت میں چکر لگاتی رہے گی۔ یا کچھ اور ہے؟

طلوع اسلام زندگی کے منتہیٰ کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ نہ ہی یہ بات آج ہمارے شعور کی موجودہ سطح کی رُو سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ البتہ قرآن یہ بتاتا ہے کہ زندگی میں رجعت نہیں۔ اس لئے دائرے کی شکل میں چکر لگانے کا تصور غلط ہے۔ زندگی حرکت دوری نہیں یہ ایک صراطِ مستقیم پر آگے بڑھتی ہے اور طبقاً عن طبق بلند ہوتی چلی جاتی ہے

(نوٹ) استفسار بھیجتے وقت قارئین کو اپنا پتہ ضرور تحریر کرنا چاہیے کیونکہ بعض استفسارات ایسے ہوتے ہیں جن کا جواب رسالہ میں دینے کی بجائے انفرادی طور پر دینا بہتر ہوتا ہے لیکن پتہ موجود نہ ہونے کی صورت میں ایسا ممکن نہیں ہوتا۔ —— مدیر

حقائق و عِبر

وزیر اعظم اور درویش معلوم ہوا ہے کہ وزیر اعظم محمد علی نے اپنے پانچ روزہ قیام ڈھاکہ کے دوران ایک درویش سے خفیہ ملاقات کی تھی جو سلہٹ سے ڈھاکہ آئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وزیر اعظم نے بنگال میں وزارت سازی کے سلسلہ میں اس درویش سے مشورہ کیا تھا۔ بعد میں جب یہ درویش واپس گئے تو ڈھاکہ ریلوے اسٹیشن پر اعلیٰ حکام اور وزیر اعظم کے ذاتی عملہ کے ارکان نے انہیں الوداع کہا۔ وزیر اعظم کے اپنے دو آدمی بھی اس درویش کے ساتھ چار نشستوں والے ایک اعلیٰ کلاس کے ڈبہ میں گئے۔ اس سفر کے تمام اخراجات وزیر اعظم نے خود برداشت کئے (روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۸ر مارچ ۱۹۵۵ء)

اس سے پہلے اتنا ہی سنا تھا کہ بڑے بڑے لوگ سٹہ کا نمبر دریافت کرنے کے لئے فقیروں کے ہاں جاتے ہیں۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ معاملہ اس سے آگے بڑھ گیا ہے۔ اور اب امور سلطنت کے لئے بھی انہی بارگاہوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اب حافظ کو شکایت نہیں رہے گی کہ

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا! مخروش

تاریخ شاہد ہے کہ جب حکومتوں کے فیصلے خانقاہوں سے ہونے لگے تو سلطنتیں مٹنا شروع ہو گئیں حقیقت یہ ہے کہ انسان خانقاہوں کی طرف جاتا ہی اس وقت ہے جب وہ عمل سے بیگانہ اور جدوجہد کے نتائج سے مایوس ہو جاتا ہے۔ بہرحال اب بھی اگر کسی کو مملکت پاکستان کے "اسلامی" ہونے میں شبہ ہو تو اس کا کچھ علاج نہیں۔ اور ابھی تو ابتدا ہے۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

جذبہ خدمت اسی اشاعت میں آپ کو مس کیلر کے متعلق ایک مضمون ملے گا جس سے پتہ چلے گا کہ خدمت خلق کا جذبہ انسان کے کردار میں کیا تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ وہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ اب اس کا دوسرا رخ دیکھئے۔

معاصر "ٹائمز آف کراچی" کا ایک کالم نویس لکھتا ہے:-

> اگر اخبار نویس اور اخباری فوٹوگرافر نہ ہوں تو آجکل کی تقریبات بڑی حد تک کم ہو جائیں۔ مجھ سے ایک لیڈی رپورٹر نے ذکر کیا کہ لاہور کے ایک زنانہ کلب نے ایک مرتبہ اسکول کے بچوں میں مٹھائی تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے تصاویر کھینچنے کا انتظام ان لیڈی رپورٹر کے سپرد کیا۔ اتفاق سے، فوٹوگرافر وقت پر میسر نہ آسکے چنانچہ مٹھائی تقسیم کرنے والیاں چار گھنٹے انتظار میں بیٹھی رہیں۔ بالآخر فوٹوگرافروں کے پہنچنے پر پچاس روپے کی مٹھائی تقسیم کی گئی۔ اور پہلو بدل بدل کر تصویریں کھنچوائی گئیں۔ ان تصویروں پر فوٹوگرافروں کے کوئی ایک سو روپے خرچ ہو گئے۔ لیکن اس کی تلافی ہو گئی کیونکہ تصویریں کھنچوانے والیوں نے دو سو روپے کی تصویریں ان سے خرید لیں۔

انہی دنوں مرکزی حکومت نے ماتحت حکومتوں کو ہدایت بھیجی ہیں کہ وہ تقریبات اور ضیافتیں کم کر دیں لیکن ہم نے یہ کہیں نہیں پڑھا کہ اس قسم کی ہدایات بھی جاری ہوتی ہوں کہ منسٹروں کے ساتھ پبلسٹی افیسرز اور فوٹوگرافرز دوروں میں نہ جایا کریں۔ اس لئے کہ اگر پبلسٹی ہی نہ ہوئی تو ضیافت کس کام کی؟

لیکن ہمیں سب سے زیادہ تعجب اپنے اخبارات پر آتا ہے۔ یہ ہمیشہ شکایت کرتے رہتے ہیں کہ ارباب حکومت کفایت شعاری نہیں کرتے۔ لیکن یہ اتنا نہیں سوچتے کہ اس میں خود ان کا اپنا ہاتھ کس قدر ہے۔ اگر ہمارے اخبارات ان حضرات کی مختلف تقاریب کی روئداد شائع کرنا بند کر دیں تو یہ تقریبیں خود بخود ختم ہو جائیں۔ لیکن پھر یہ اخبار والے دعوتیں کہاں سے کھائیں؟

عالمِ اسلامی

مشرق وسطیٰ کی دفاعی تنظیم جس کا سنگ بنیاد پاک ترکی معاہدے کی صورت میں رکھا گیا اور جس کا دوسرا قدم ترکی عراقی معاہدہ ہے اب ایک یقینی منزل میں داخل ہوتی نظر آرہی ہے۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان ترکی عراق، ایران، برطانیہ اور امریکہ عنقریب ایک دفاعی سلسلہ میں منسلک ہو جائیں گے اس ضمن میں متعلقہ دارالخلافوں میں ضروری تیاریاں ہو رہی ہیں امریکہ اس معاملہ میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا ہے یہ بھی قابل فہم ہے مشرق وسطیٰ میں اس کے یقینی حلیف، پاکستان، عراق اور ترکی ہیں جنہوں نے اس سے عسکری معاہدہ بھی کر رکھا ہے ایران کی ہمدردی بھی امریکہ کے ساتھ ہے۔ لیکن امریکہ کو مصر اور اسرائیل کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ وہ یہودیوں کو مشرق وسطیٰ کی دفاعی تنظیم میں شریک نہیں کر سکتا لیکن انہیں یہ تسلی ضرور دینا چاہتا ہے کہ انہیں تنہا نہیں چھوڑے گا۔ لہٰذہ وہ اس سے علیحدہ معاہدہ کر لینا چاہتا ہے۔ مصر کے معاملہ میں امریکہ کی کوشش تو یہ ہے کہ وہ براہِ راست دفاعی تنظیم میں شامل ہو جائے لیکن مصر نے جو موقف پیدا کر لیا ہے، اس کے پیش نظر فی الحال اس کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ لہٰذہ مصر کے پاس خاطر سے امریکہ اس تجویز پر غور کر رہا ہے کہ وہ اس سے علیحدہ معاہدہ کر لے اور خود مشرق وسطیٰ کی دفاعی تنظیم یعنی میڈو[*] میں شریک ہو جائے۔ تاکہ مصر اس طرح بالواسطہ میڈو سے وابستہ ہو جائے۔ یہ تجاویز ابھی موزوں ہو رہی ہیں۔ لیکن توقع ہے کہ جلد ہی یہ واضح ہو کر سامنے آجائیں گی اور ان پر عمل درآمد کیا جا سکیگا۔

مصر کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے اس قسم کے انتظام پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ اس کے لئے راستہ صاف کر رہا ہے۔ ۱۰ر مارچ کو مصری وزیر میجر صلاح سالم نے ایک بیان میں کہا کہ نجب یعنی فلسطین کا جنوبی علاقہ جہاں ان دنوں مصر اور اسرائیل میں چپقلش ہوئی۔ مشرق وسطیٰ کے دفاع کی کلید ہے کیونکہ یہی وہ علاقہ ہے جو سویز کے دفاعی مستقر کو عرب ممالک سے ملاتا ہے جب تک یہ علاقہ مصر کو نہیں مل جاتا کوئی دفاعی منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ان کے بیان کا یہ حصہ معنی خیز ہے۔ "اقوام مغرب یہ چاہتی تو ہیں کہ مصر علاقائی دفاعی تنظیم میں شامل ہو جائے لیکن وہ نہیں سمجھتیں کہ جب تک سویز اور ترکی میں مواصلات نہیں ہوں گے۔ شمال سے ہونے والے حملہ کا تدارک نہیں کیا جا سکیگا! اور سویز ہی وہ اہم اڈہ ہے جہاں سے ایسا کیا جا سکتا ہے۔" اس سے پتہ چلتا ہے کہ مصر کو میڈو کی شرکت پر کوئی اصولی اعتراض نہیں رہا بلکہ بعض عملی مشکلات اس کے پیش نظر ہیں اگر مصر حقائق کو واقعی یوں بے نقاب دیکھ سکے تو ممالک اسلامیہ کے اتحاد کی فوری شکل پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ بھی قابل ذکر ہے کہ مصر اور شام کا رویہ عراق کے معاملہ میں معتدل بلکہ دوستانہ ہو رہا ہے جو شامی سرکاری وفد بغداد گیا تھا وہ مطمئن واپس آگیا ہے اور اسے یقین ہو گیا ہے کہ عراق عربی مفاد کو پس پشت نہیں ڈالے گا۔ مصر میں بھی عراق کی مخالفت کم ہو گئی ہے کیونکہ اسے اس کا احساس ہو گیا ہے کہ وہ عراق کو علیحدہ کر کے عربی وحدت برقرار نہیں رکھ سکیگا۔ اور اس میں اس کا نقصان ہوگا۔ چنانچہ قاہرہ سے بھی یہ اعلانات ہوئے ہیں کہ عراق عرب لیگ کے لائحہ عمل پر کاربند رہے گا۔

شمالی افریقہ کے مسلمانوں کا ابتلا ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ آزادی کی ابتدائی مراعات حاصل کرنے کیلئے بھی ان بیچاروں کو ابھی بہت قربانی دینا ہوگی ہو کیوں نہ، وہ قریباً تنہا لڑ رہے ہیں مسلمان ممالک ان کی ہمدردی کا دم ضرور بھرتے ہیں لیکن عملاً ان کی مدد کو نہیں پہنچ سکے۔ اگر اب بھی مسلمان ممالک متحد ہو جائیں تو وہ ان مظلومین کو آزادی سے ہمکنار کرنے کیلئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ فرانس نے تیونیشیا سے چھوٹے مذاکرات شروع کر دیئے ہیں لیکن الجیریا کا معاملہ معلق ہے۔ وہ وہاں بدستور جبر و تشدد سے کام لے رہا ہے۔ اس علاقہ میں نومبر ۱۹۵۴ء سے خاص طور سے ہنگامے ہو رہے ہیں! اس کی وجہ یہ تھی کہ فرانس نے تیونیشیا سے تو داخلی خود مختاری کا وعدہ کیا تھا لیکن الجزائر اور مراکش کے لئے کچھ نہ کیا حالانکہ سب کے معاملات یکساں ہیں۔ چنانچہ اب فرانس نے الجزائر میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا فرانس آزادی کے سیلاب کے سامنے بند باندھ سکتا ہے؟ اسے جس ذلت سے ہند چینی سے نکلنا پڑا ہے اسی طرح یہاں سے نکلنا ہوگا فرق صرف یہ ہے کہ ہند چینی کو سرخ چین کی امداد حاصل تھی لیکن مغرب اقصیٰ والے بے یار و مددگار ہیں لیکن تاریخ شاہد ہے کہ آزادی کا جذبہ جب بیدار ہوتا ہے تو وہ طاقتور سے طاقتور حکومت کو بھی تختہ الٹ کر رکھ دیتا ہے۔

بین الاقوامی جائزہ

اس وقت انسان ہلاکت کی ایسی وادی میں داخل ہو چکا ہے جس سے بظاہر کوئی رجعت یا مفر نہیں، اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہاں سے انسان کہاں جائے گا؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ایک عجیب ہول اور بیچارگی کا عالم ہے۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔

انسان کو وادی موت میں لا کھڑا کرنے والی چیز اس کی اپنی سائنسی ترقی ہے۔ سائنس نے اسے محیر العقول طاقت عطا کر دی ہے لیکن انسان کا وحی سے بیگانہ ذہن، اس کا اس سے بہتر استعمال نہیں سوچ سکتا کہ اپنے حریف کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے ایٹم بم کی ایجاد سے پیشتر سوال محض یہ تھا کہ ایسے تباہ کن اسلحہ تیار کر لئے گئے ہیں اور سمجھا جاتا ہے کہ اگر جنگ ہوگی تو دنیا میں ایسی ہلاکت پھیلے گی۔ جس کی نظیر تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ لیکن پہلے ایٹم بم اور بعد میں ہائیڈروجن بم نے ایک نئی مصیبت برپا کر دی ہے۔ اب انسان کو تباہی کے لئے جنگ کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اس وقت جو ایٹمی تجربے ہو رہے ہیں، انہی سے فضائے عالم میں ایسا بخار زہر (RADIOACTIVE POISON) پھیل جائے گا کہ ایک وقت کے بعد بغیر جنگ کے انسان اور اس کی تہذیب معدوم ہو جائے گی۔ ایک سائنسدان نے کہا ہے کہ انسانی جسم پر اس زہر کا جو تدریجی اثر ہوگا وہ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا جائے گا۔ تا آنکہ کسی متنفس کی افزائش بلکہ زندگی ناممکن ہو جائے گی۔

شاید اقبال نے اس شعر میں اسی دور کی تصویر پیش کی ہے۔

دلِ گیتی انا المسموم فریادش
خرد گوید کہ ما عندی بہ تریاق ولا راق

خرد مندان مغرب ہائیڈروجن بم کے منحوس سائے میں لندن میں ۲۵ر فروری سے جمع ہیں۔ تاکہ اسلحہ کی تحدید کی کوئی صورت پیدا کریں گو تفصیلات منظر عام پر نہیں آئیں تاہم وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائے۔ یہ حیران کن نہیں۔ ایسے مذاکرات جنگ کے خاتمہ کے بعد شروع ہوئے تھے۔ لیکن اب تک ان کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا۔ اقوام مغرب کی طرف سے جو تجویز پیش ہوتی ہے۔ اسے روس مسترد کر دیتا ہے۔ اور جو کچھ روس کہتا ہے، اسے اقوام مغرب نہیں مانتیں۔ اور حال یہ ہے کہ دونوں یہ چاہتے ہیں کہ ایٹمی اسلحہ کا استعمال ممنوع قرار دے دیا جائے۔ روس ایٹمی اسلحہ کے لحاظ سے امریکہ سے پیچھے ہے لیکن اس کی فوج زیادہ ہے۔ لہٰذہ وہ ایٹمی اسلحہ کو فی الفور ممنوع قرار دے کر افواج ایک تہائی کم کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ اگر ایٹمی اسلحہ کی ممانعت ہو گی تو امریکہ کی روس پر برتری ختم ہو جائیگی۔ اور افواج کم کر دی گئیں تو عسکری اعتبار سے روس کی برتری یقینی ہو جائے گی۔ ان حالات میں یہ یقینی ہے کہ موجودہ مذاکرات بے نتیجہ ثابت ہوں گے۔

ادھر یہ مذاکرات ہو رہے ہیں ادھر اقوام مغرب نے ایک اہم موڑ مڑا ہے۔ معاہدات پیرس فرانس کی سینیٹ نے بھی منظور کر لئے ہیں گویا اب مغربی یورپی یونین کی بنیاد پڑ جائے گی اس تصدیق کا اثر مغرب اور مشرق کے تعلقات پر بھی پڑے گا روس نے بڑی کوشش کی کہ یہ تصدیق نہ ہو سکے لیکن وہ ناکام رہا وہ اقوام مغرب کو مشترکہ کانفرنس کی دعوت دیتا رہا۔ لیکن ادھر سے یہی جواب ملتا رہا کہ معاہدات پیرس کی تصدیق کے بعد ایسی کانفرنس کا انعقاد کیا جائے گا۔ فرانس اور برطانیہ ایسی کانفرنس کے حق میں تو تھے ہی اب امریکہ بھی اس کا قائل نظر آتا ہے گو اسے اپنے حلیفوں سے تھوڑا سا اختلاف ہے ۲۳ر مارچ کو صدر آئزن ہاور نے کہا کہ گذشتہ دو سال میں روس میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ان سے یہ امید پیدا ہوتی ہے کہ نئی روسی قیادت سے تمہیدی گفتگو بھی رنگ لائیں۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ رئیسان مملکت کی بجائے دوسرے نمائندے آپس میں ملیں اور اگر اس طرح بات آگے بڑھائی جا سکے تو وہ دنیا کے کسی کونے میں اس کے لئے جانے کے لئے تیار ہوں گے۔

خرد کی قوت اور اس کے ساتھ ہی اس کی بے چارگی جس حد تک بڑھی ہے اور جس حد تک پہنچی ہے آسمان کی آنکھ نے اس سے پہلے شاید ہی یہ نقشہ دیکھا ہو۔ کیسا عجیب ہے یہ تضاد لیکن کس قدر مبنی علی الحقیقت!!

[*] میڈو: MIDDLE EAST DEFENCE ORGANISATION · M.E.D.O

دفتری بدنظمیاں

مندرجہ بالا عنوان کے تحت طلوع اسلام کے لمعات میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ اسے نہایت دلچسپی سے پڑھا گیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں۔ ہمارے پاس بہت سی تجاویز اور بہت سے مشورے آ رہے ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ طلوع اسلام میں دفتری بدنظمیوں کے لئے ایک جداگانہ باب کا اضافہ کیا جائے۔ اس باب میں عام اخباری انداز کے مطابق پگڑیاں اچھالنے، یا تنقید خوانی کرنے سے کام نہ لیا جائے۔ بلکہ نہایت سنجیدہ اور اصولی طور پر کوشش کی جائے کہ حکومت کی مشینری میں جہاں جہاں قابل اصلاح نقائص ہوں انہیں نمایاں کیا جائے اور حتی الامکان ان کی اصلاحی تدابیر پیش کی جائیں۔ اسی طرح جہاں جہاں قابل ستائش اقدامات نظر آئیں ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ تاکہ دوسرے لوگوں میں ان کی تقلید کا جذبہ پیدا ہو۔ اس سلسلہ میں قارئین طلوع اسلام کا عملی تعاون ہمارے لئے شکریہ کا موجب اور مملکت کی بہی خواہی کا باعث ہوگا۔ آپ کو جہاں جہاں کوئی انتظامی خرابی نظر آئے۔ اس سے ہمیں مطلع کیجئے۔ لیکن اس کا خیال رکھئے کہ آپ کی تنقید ذاتی ہو نہ تخریبی بلکہ وہ اصولی اور تعمیری ہو۔ اس کی بھی احتیاط برتئے کہ واقعات میں کوئی غلطی نہ ہو۔ مراسلہ میں اپنا نام اور پتہ ضرور لکھئے اگر آپ چاہیں گے تو آپ کا نام شائع کر دیا جائیگا۔ ورنہ اسے اپنے تک محدود رکھا جائے گا۔ ایک مرتبہ پھر سن لیجئے کہ آپ کی شکایت یا تنقید اساسی ہی ہوگی۔ دیانت اور غیر جانبداری کی آئینہ دار ہونی چاہیے جو طلوع اسلام کی خصوصیات ہیں۔

اس سلسلہ کی ابتداء ڈھاکہ کے ایک مراسلہ سے کی جاتی ہے۔ (ادارہ)

۹ مارچ کا شمارہ زیر نظر ہے اداریہ "دفتری بدنظمیاں" ایک قومی فریاد ہے۔ میں گزشتہ بیس سال سے اس پر غور کر رہا ہوں کہ حکومت کے دفاتر تجارتی دفاتر کے اصول پر کیوں نہیں چلائے جا سکتے۔ لیکن تقلید کا جو بوسیدہ غلاف ہماری اجتماعی زندگی پر چڑھا ہوا ہے۔ اس سے ہمارے دفاتر مستثنیٰ کیوں ہوں حالانکہ وہی قوم (انگریز) جس نے یہ طریقہ نظم و نسق دیا تھا اپنے ہاں ان بدنظمیوں کو روا نہیں رکھتی۔ پاکستان میں یہ مسئلہ زیادہ اہم نظر آیا۔ اس لئے کہ کسی حکومت کے قیام کے لئے ابتدائی دور میں جس عجلت اور کارفرمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ یہاں سرے سے مفقود نظر آئی۔ اس سلسلہ میں بعض نکات میری سمجھ میں آتے ہیں اگر درخور اعتنا ہوں تو کسی شمارے میں ان پر بھی لکھئے۔

(۱) پاکستان میں نظم و نسق کے نقائص کا تجزیہ کرتے وقت اس ماحول اور ان روایات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جن کے تحت پہلے ہمارے کارکنان حکومت کام کیا کرتے تھے۔ یہ حقیقت اب کتنی ہی تلخ کیوں نہ معلوم ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسلمان جو حکومت کے ملازم تھے انگریز اور ہندو سے بالعموم مرعوب تھے۔ انگریز نوٹ تو ان سے لکھواتا تھا لیکن فیصلہ اپنے لئے محفوظ رکھتا تھا۔ اس انگریزی پالیسی نے ان ملازمین کو کارفرمائی کی اس ضروری صفت سے عام طور پر محروم کر دیا جسے قوتِ فیصلہ کہتے ہیں اب حالت یہ ہے کہ یہاں ملازمین کی اکثریت قوتِ فیصلہ نہیں رکھتی۔ اور اس بارے میں سخت بزدلی واقع ہوئی ہے۔ غور و فکر جانچ پڑتال بڑی اچھی چیز ہے لیکن بعض بڑے افسروں کے متعلق دیکھا گیا ہے کہ فائل ہفتوں میز پر پڑا رہا اور بہت ہوا تو چند استفسارات کے بعد واپس آ گیا۔ حالانکہ حقائق اپنی جگہ پر تھے پھر جب سال بعد تصفیہ ہوا تو وہی جو ایک سال پہلے ہونا چاہیے تھا۔ اب تو یہ بیماری اتنی عام ہے کہ کسی طبقہ کا ملازم بھی فیصلہ کی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ فائل ایک میز سے دوسری میز پر منتقل ہوتی رہتی ہے اور سائل بیچارہ حیران و پریشان گھومتا رہتا ہے۔

(۲) انگریز نے جو قاعدے بنائے اور جو ضابطے مدون کئے وہ ایک خاص پالیسی کے تحت تھے کوئی آزاد مملکت ایسے مہمل قواعد کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ جو ہمیں ورثہ میں ملے۔ اسے ارباب نظر کی تنگ نظری کہئے۔ تقلید جامد کا شعبدہ کہئے یا احساس کمتری کا نتیجہ کہ آج بھی بہت سے قواعد و ضوابط ایسے رائج ہیں جو ایک آزاد و خود مختار مملکت کے شایانِ شان نہیں۔ بعض قاعدے تو نہ صرف حکومت کی مشینری کو پیچیدہ بناتے ہیں۔ بلکہ رعایا کے لئے بھی خاصی دردسری کا باعث ہیں۔ ایک ملازم سرکار نے کوشش کی کہ ایک قاعدہ بدل دیا جائے اور ثابت کیا کہ ترمیم زیادہ سہولت بخش ہے لیکن اس کی سخت حوصلہ شکنی کی گئی۔ اب ان کا عقیدہ ہے کہ حکومت پاکستان بھی ملا کی شریعت کی طرح انگریز کے بنائے ہوئے قواعد کو ناقابل ترمیم خیال کرتی ہے۔ ایک معاملہ میں ذاتی مشاہدہ ہے کہ ایک ملازم سرکار نے طریقہ کار بدلنے کی سفارش کی۔ جس کی بنا پر ۵۰ فیصد کفایت ہوتی تھی۔ لیکن اس تحریک کو محض اس لئے رد کر دیا گیا کہ ارباب اقتدار میں طریقہ نافذہ انگریز بدلنے کی ہمت نہیں تھی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ملازمین صرف لکیر پیٹنے کے مقولہ پر عمل کرتے ہیں۔ انہوں نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ دلچسپی باقی نہیں صرف مکھی پر مکھی مارتے چلے جاتے ہیں اور حکومت خوش ہے کہ نظم و نسق قدیم معیار پر آ رہا ہے۔ حکومت کی ذہنیت کا اندازہ کیجئے کہ اس نے قبل از تقسیم کارکردگی والا معیار قرار دیا ہے۔ حالانکہ دنیا ایٹم بم سے ہائیڈروجن کی عمر بھی طے کر چکی۔ شرم تو جب آتی ہے جب بھارت کی تبدیلی کو یہاں معمولی ترمیم کے ساتھ اپنایا جاتا ہے۔ حالانکہ صورت حال برعکس ہونی چاہیے تھی۔ ہمیں چاہیے تھا کہ بھارت کو سبق دیتے۔

۳۔ دنیا کی تمام متمدن حکومتیں یہ کوشش کرتی ہیں کہ ان کے ملازم اگر خوش نہیں تو ناخوش تو نہ رہیں۔ لیکن پاکستان میں کسی محکمہ کے ملازم سے ملئے۔ وہ شاکی نظر آئے گا۔ سات سال گزرنے کے بعد بعض دفاتر میں ابتدائی مراحل قیام طے نہیں پا سکے کہیں فرنیچر نہیں۔ کسی عمارت میں غسل خانہ نہیں۔ کسی کی چھت قابل ترمیم تو کہیں پینے کے پانی کا انتظام بھی نہیں۔

ملازمین سرکار میں بددلی کی کئی وجوہات ہیں۔

(الف) اعلیٰ افسروں کی خود دماغی۔ ماتحت یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ آج بھی انگریز حاکم سے مخاطب ہے۔

(ب) باہمی اعتماد کا فقدان

(ج) چھوٹے اور بڑے ملازمین کے درمیان معاشرتی سرکاری تفاوت۔ انتظام مملکت کے لئے طبقاتی تقسیم ضروری سہی لیکن سرکاری معاملات میں اس کا احساس ہونا نقصان کا باعث ہوتا ہے یہاں چھوٹا افسر بڑے افسر سے سرکاری معاملات میں دل کھول کر بات نہیں کر سکتا اس طرز عمل کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی جاتی۔ حالانکہ کسی دفتر کو کامیابی سے چلانے کا راز یہی ہے کہ قواعد کی پابندی کے ساتھ ساتھ افسریت کی جھلک بھی نظر نہ آئے بلکہ دونوں طبقوں کے ملازمین یہ محسوس کریں کہ وہ ایک خاندان کے فرد ہیں۔ اور ان کا مفاد مشترک ہے۔

خدانخواستہ اگر حکومت پر کوئی نازک وقت آ جائے۔ تو یہی نمک خواران سرکار اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کو تیار ہو جائیں گے۔ جیسا کہ زبان کی شورش کے سلسلہ میں حکومت مشرقی پاکستان کے ساتھ ہوا۔ چھوٹا اور بڑا ہر ملازم سرکار قلم پھینک کر باہر آ گیا۔ اور حکومت کی مشینری معطل ہو گئی۔ اس کی بنیادی وجہ اور تھی۔ لیکن پس منظر میں یہ علت بھی کارفرما تھی

ملازمین کے ساتھ جس غفلت کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے اور ان کی فلاح و بہبود کے سلسلہ میں جو تغافل برتا جاتا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حکومت کے ساتھ خود اس کے ملازمین کو بھی ہمدردی نہیں۔ مغربی اور مشرقی پاکستان میں تعلیمی سال مختلف اوقات میں شروع ہوتے ہیں۔ لیکن ملازمین کے تبادلے بمصلحت انتظام مملکت کے تحت کئے جاتے ہیں۔ ایک علاقے سے دوسرے علاقہ میں متبادل ملازمین ملتے رہتے ہیں لیکن کوئی ہیڈ ماسٹر کوئی کالج کا پرنسپل ان سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ تعلیم کی جو تجارت پاکستان میں ہوتی ہے وہ ایک علیحدہ موضوع ہے، اور کوئی ایسا قاعدہ نہیں کہ متبادلہ ملازمین کے بچوں کو اسکول یا کالج میں بے وقت داخلہ مل سکے۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ جن کی بنا پر ملازم بددل، ناخوش اور متنفر رہتے ہیں۔ جس کا راست اثر حکومت کے نظم و نسق پر پڑتا ہے

بعض امور تو بہت معمولی ہیں۔ جن پر ارباب اقتدار کی ذرا سی ہمدردانہ توجہ حکومت کی کارکردگی میں اضافہ کا موجب ہو سکتی ہے لیکن کون سمجھائے اور کسے سمجھائے؟

میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ سیر حاصل تبصرہ نہیں۔ بعض پہلو میں نے دانستہ چھوڑ دیئے ہیں اور اسی سلسلہ میں بعض دلچسپ ذیلی مسائل بھی زیر بحث آ جاتے ہیں۔ جن کو میں نے بخوف طوالت نظر انداز کر دیا ہے۔

اسلامی معاشرت
مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ، سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات
صفحات ۱۹۲ قیمت دو روپے

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ہوگا اسی قدر قرانی فکر عام ہوگی اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ہے۔ یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا پچیس روپے کی ساھانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تاآنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ہوجائے۔ اس طرح - - -

- آپ کی پیشگی رقم سے ہمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اب شامل ہوجائیے۔

معاملہ کی ضروری باتیں

- طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ہے۔ یہ بھی آپ سے ایسا ھی برتاؤ کریگا۔
- حساب میں بعض اوقات غلطی ہوسکتی ہے۔ ایسی غلطی باھمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجیے۔
- رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے۔ کتابوں کے لئے الگ۔
- مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے۔ نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے۔
- پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو ھفتہ پہلے اطلاع دیجئے۔
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک ھفتہ کے اندر دیجئے۔ بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ - کراچی - ۳

فردوسِ گم گشتہ

دورِ حاضرہ کے نوجوان طبقے کے دلوں میں حسن عقابی روح کی بیداری کے
آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ اس کے بال و پر کی بالیدگی میں
"مفسرِ قرآن" و "ترجمانِ اقبال" جناب پرویز
کے فکرِ عمیق اور اسلوبِ بلیغ کا حصہ نمایاں ہے۔
"فردوسِ گم گشتہ" اسی صاحبِ نظر کے فکر و اسلوب کا دلکش مجموعہ ہے
جو ملت کی متاعِ گم شدہ کی بازیابی کی راہ بتاتا ہے۔ اور ہر حساس
قلب کو جس میں تخلیقِ نو کی آرزو موجزن ہے، پکار پکار کر کہتا ہے کہ

صورت گری را ز من بیاموز
شاید کہ خود را باز آفرینی

ضخامت ۴۱۳ صفحات مجلد مع گرد پوش قیمت -/۶
علاوہ محصول ڈاک

Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Adabi Press, Robson Road, Karachi.
Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1, Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi. Editor: KHURSHID ALAM

جلد ۸ — کراچی: ہفتہ ۹ اپریل ۱۹۵۵ء — قیمت چار آنہ
شمارہ ۱۰ — سالانہ دس روپے

قرآن نے کیا کہا؟

شرک یہی نہیں کہ تم مٹی اور پتھر کے بت بنا کر انہیں سجدہ کرنے لگ جاؤ۔ یہ بھی شرک ہے کہ تم زندگی کے مختلف شعبوں میں مختلف قوانین تسلیم کرلو۔ آسمانوں پر خدا کا قانون اور زمین پر انسانوں کا قانون۔ مسجد کی چار دیواری تک خدا کا قانون اور دکان پر اپنا قانون۔ شراب کی بھٹیوں اور قمار خانوں پر خدا کا قانون لیکن حکومت کے مالیات پر انسان کا خود ساختہ قانون۔ وقال اللہ لا تتخذوا الھین اثنین۔ حالانکہ خدا کا ارشاد ہے کہ دو الگ الگ ہستیوں کا اقتدار کہیں نہ مانو۔ انما ھو الہ واحد۔ اقتدار صرف اکیلے خدا ھی کا ہے۔ یاد رکھو۔ ولہ ما فی السموت والارض۔ خارجی کائنات میں اور اس دنیا میں ہر شے اس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہے۔ ولہ الدین واصباً۔ اطاعت صرف اسی کے قانون کی دائم و لازم ہے۔ افغیر اللہ تتقون (۱۶/۵۱-۵۲)

تو کیا تم اس کے قانون کے علاوہ کسی اور کے قانون کی نگہداشت کروگے ؟

طلوع اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ....

۱. تنہا انسانی عقل زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔

۲. یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوع انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔

۳. حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ جو روایات قرآن کے مطابق ہوں گی صحیح ہوں جو اس کے خلاف ہیں غلط ہے۔

۴. حضور نبی کریمؐ انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن بعض سازشوں نے ہماری تاریخ میں ایسی چیزیں شامل کر رکھی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضورؐ کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔

۵. قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

۶. اس عالمگیر نظام زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں (انہیں قانون شریعت کہا جاتا ہے) یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

۷. اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اسے ربوبیت عامہ یعنی تمام نوع انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۸. ربوبیت عامہ کے مقصد عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے "قرآنی نظام ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ....

اب پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں قرآنی نظام ربوبیت نافذ ہو جائے تاکہ صفات خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی دبی ہوئی صلاحیتیں کامل نشوونما پا سکیں اور اس طرح "زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"۔

اگر آپ طلوع اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوع اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ ہنگامی حالات کے بعد ★ کرنل ناصر کی خدمت میں ★ افغانستان ★ تاریخی شواہد ★ مجلس اقبال ★ عورت کا قرآن
★ اسلام کی سرگزشت ★ بزم طلوع اسلام ★ سلیم کے نام ★ اندرون ھند ★ ستاروں کی گزرگاہیں ★ باب المراسلات
★ حقائق و عبر ★ نقد و نظر ★ بین الاقوامی جائزہ ★ عالم اسلامی

As -/4/-

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ھیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ھے۔ ظاہر ھے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ھوگا اسی قدر قرانی فکر عام ھوگی اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ھے۔یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا پچیس روپے کی ماھانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تاآنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ھوجائے۔ اس طرح - - -

- آپ کی پیشگی رقم سے ھمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ھوئے تو اب شامل ھوجائیے۔

معاملہ کی ضروری باتیں

- طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ھے۔ یہ بھی آپ سے ایسا ھی برتاؤ کریگا۔
- حساب میں بعض اوقات غلطی ھوسکتی ھے۔ایسی غلطی باھمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجیے۔
- رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے۔ کتابوں کے لئے الگ۔
- مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے۔ نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے۔
- پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو ھفتہ پہلے اطلاع دیجئے۔
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک ھفتہ کے اندر دیجئے۔ بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳۔ کراچی۔ ۳

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار

طلوع اسلام

جلد ۸ ۹ اپریل ۱۹۵۵ء نمبر ۱۴

ہنگامی حالات کے بعد

گورنر جنرل نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو غیر معمولی جرأت اور تدبر سے مجلس دستور ساز کو توڑا تو اس پر ملک کے گوشے گوشے سے احسنت، مرحبا کا غلغلہ بلند ہوا اور دیکھا جائے تو ایسا ہونا ہی چاہیئے تھا کیونکہ قوم مکمل تباہی کے غار تک پہنچ چکی تھی۔ یہ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اگر گورنر جنرل یہ (بظاہر انتہائی) قدم نہ اٹھاتے تو پاکستان کی وحدت اور سالمیت داستان ماضی بن چکے ہوتے۔ اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ اس اقدام کی حیثیت مدافعانہ تھی۔ اس سے وہ عظیم خطرہ تو ٹل گیا جو ملک کے سر پر منڈلا رہا تھا لیکن اس سے آئندہ کی روک تھام کا کوئی انتظام نہ ہو سکا۔ اس مثبت اقدام کی ضرورت بالکل ظاہر تھی۔ اس سے ماسبق اٹھارہ مہینوں سے ہم پکار پکار کر اس کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اپریل ۱۹۵۳ء میں گورنر جنرل نے اسی قسم کی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ناظم الدین وزارت کو برطرف کیا تھا جو پیر تسمہ پا کی طرح ملت کے رگ گلو کے لئے نشتر بن رہی تھی۔ یہ برطرفی سلک ملت پر احسان تھا لیکن چونکہ وہ منفی اقدام مثبت اقدام کا پیش خیمہ ثابت نہ ہو سکا اس لئے اس کا اثر بھی زائل ہو گیا اور چند ہی مہینوں بعد پہلے سے بدتر صورت حال پیدا ہو گئی۔ یہ غنیمت ہے کہ گورنر جنرل نے بکمال ژرف نگاہی یہ بھانپ لیا کہ اب سیاست کی ساری تگ و دو کا محور ذاتی اور عاجلہ مفاد ہے۔ لہٰذا ان سے یہ توقع عبث ہے کہ وہ جنگ زرگری ختم کر کے ملکی مفاد کے حصول میں کوشاں ہوں گے۔ چنانچہ انہوں نے ملک کی قسمت ابن الوقت اور موقع پرست سیاسیین کے سپرد کرنے کی بجائے اپنی تدبیر سے کام لیا اس کے بعد جن عقدوں کی کشود دشوار تر ہوتی جا رہی تھی وہ ان کے ناخن گرہ کشا کی بدولت کھلتے نظر آنے لگے۔

یہ عقدے کھلنا ہی چاہتے تھے کہ سیاست کے پٹے ہوئے مہرے پھر آگے بڑھے اور قانون و جمہوریت کے نام پر وہ کچھ کرنا چاہا جس سے دونوں کی مٹی پلید ہوئی۔ یہ از بس غنیمت ہے کہ فیڈرل کورٹ نے دونوں کی لاج رکھ لی۔ اس فیصلے سے دو امور ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اول: مجلس دستور ساز مطلق العنان جماعت نہ تھی اور اس کے فیصلے گورنر جنرل کی منظوری کے بغیر قانون نہیں بن سکتے تھے۔ دوم: پاکستان میں، بحالات موجودہ، اختیارات کا سرچشمہ گورنر جنرل ہے۔ چونکہ مجلس دستور ساز اپنے تئیں مطلق العنان ہونے پر بضد تھی اس لئے گورنر جنرل نے اپنے اختیارات کے ماتحت اسے توڑ دیا۔ عدالت نے اختیار کے استعمال پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

اب صورت حال یہ ہے کہ ملک میں مجلس دستور ساز کا وجود نہیں نئی مجلس معرض وجود میں لانے کے لئے انتخابات عمومی کی ضرورت ہے جو وقت طلب معاملہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس صورت حالات سے نکلنے کے لئے کرنا کیا چاہیئے؟ ظاہر ہے کہ اس کے لئے ایک طرف کرنے کا کام یہ ہے کہ ملک کی نمائندہ جماعت کو معرض وجود میں لانے کے لئے جملہ مراحل کو کم سے کم وقت میں طے کرنے کا انتظام کیا جائے اور دوسری طرف یہ کہ نئی مجلس کی ترتیب اور پارلیمانی اجلاس تک کے عرصہ میں کاروبار حکومت چلایا جائے۔ یہ واضح ہے کہ نظام حکومت خواہ ملوکانہ ہو، خواہ آمرانہ، خواہ جمہوری اس میں ایک آخری اقتدار (FINAL AUTHORITY) کی موجودگی ناگزیر ہے جس کے فیصلے ملک کا قانون قرار پائیں اور اس کے خلاف کوئی مرافعہ نہ ہو۔ آخری اقتدار کے تصور سے کوئی نظام غیر جمہوری نہیں ہو جاتا۔ یہ صورت ہر نظام میں موجود ہوتی ہے۔ البتہ جمہوری اور غیر جمہوری نظام میں فرق یہ ہوتا ہے کہ اول الذکر میں ہیئت حاکمہ (انفرادی یا جماعتی) نہ منتخب ہوتی ہے نہ بدلی جا سکتی ہے اور آخر الذکر میں وہ ملک و قوم کی منشا کے مطابق ہوتی ہے اور بدلی بھی جا سکتی ہے۔ پاکستان میں بحالات موجودہ گورنر جنرل کا فائنل اتھارٹی قرار پا جانا بظاہر آمریت کی دلیل نظر آتی ہے۔ اور بدخواہان پاکستان جو تودۂ سینۂ ملت بیضا پر سل کی طرح مسلط ہیں، طرح طرح سے اندرون ملک و بیرون ملک بھی شر انگیز پروپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ لیکن ادنیٰ تعمق پر یہ حقیقت سامنے آ سکتی ہے کہ ان کی حیثیت کسی طرح آمرانہ نہیں کہلا سکتی انہیں مجرد فائنل اتھارٹی ہونے کی حیثیت سے ڈکٹیٹر نہیں کہا جا سکتا کیونکہ یہ مقام جمہوریت میں بھی رئیس مملکت کو حاصل ہوتا ہے۔ بالخصوص ان حالات میں کہ مجلس مقننہ کا وجود نہ ہو۔ مزید براں گورنر جنرل نئی مجلس مقننہ کے متشکل کرنے کے لئے ضروری انتظامات کر رہے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ذاتی آمریت کے لئے راستہ صاف نہیں کر رہے بلکہ اس ذمہ داری کے پیش نظر جو عدالت کے فیصلے نے ان پر عائد کر دی ہے، وہ ملک کو نئی مجلس منتخب کرنے کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ اس صورت حال کو کما حقہٗ سمجھ لیا جائے تو یہ بات بخوبی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ گورنر جنرل نے ۲۷ مارچ کو جس "ہنگامی صورت حال" کا اعلان کیا وہ موجودہ صورت حال کا قانونی نام ہے اور بس۔ اس سے نہ جمہوریت کی نفی ہوتی ہے نہ آمریت کا جواز نکلتا ہے۔ اور اس سلسلے میں جو غوغا آرائی کی جا رہی ہے اس کی حیثیت ارباب غرض کی شر انگیزی سے زیادہ نہیں۔

یہ تسلیم کر لیا جائے کہ بحالات موجودہ ملک میں فائنل اتھارٹی گورنر جنرل ہیں تو ان کے تازہ آرڈیننس کے باقی دو حصے بھی صاف ہو جاتے ہیں اور ان پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی۔ گورنر جنرل نے ایک یونٹ کی تشکیل اور مسودہ آئین اور متعلقہ امور سے متعلق ضروری اختیارات سنبھالنے کا اعلان کیا ہے۔ یہ اعلان قابل فہم اور ناگزیر نتیجہ ہے ان کی اس قانونی پوزیشن کا کہ ملک میں وہی فائنل اتھارٹی ہیں۔ اس میدان میں بھی گورنر جنرل نے کسی آمریت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بلکہ انہی امور سے متعلق فیصلے کرنے اور انہیں نافذ کرنے کا اعلان کیا ہے جن پر ملک میں عمومی اتفاق پایا جاتا ہے۔ جن پاکستانیوں نے آزادی کے بعد کے کوائف سیاسی کا قومی نقطہ نگاہ سے مطالعہ کیا ہے وہ اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ملک کی نجات مغربی پاکستان کی وحدت اور مشرق و مغرب میں از روئے توافق (CONFEDERAC) مساوات و توازن کے قیام میں ہے۔ یہ استنباط گذشتہ سات سال کی سیاست کی رفتار عمومی سے ہی نہیں کیا گیا بلکہ تحریک پاکستان کا تقاضا بھی یہی تھا۔ ہمارا مطالبہ یہ نہیں تھا کہ فلاں فلاں صوبہ ہمیں دے دو۔ مطالبہ یہ تھا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انہیں ہندوستان سے الگ کر دو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا حتیٰ کہ پنجاب و بنگال کے صوبوں میں سے بھی ہمیں وہی علاقہ ملا جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس سے واضح ہے کہ صوبوں کی حدیں پاکستان کے مطالبہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتی تھیں لیکن ارباب سیاست کے اغراض مشئومہ نے ملت پر ان اتفاقی لکیروں کو مقدم بنا دیا اور صوبوں کی انتظامی حد بندیوں کو قلوب و اذہان میں اس طرح جاگزیں کر دیا کہ ایک ملت کہلانے والے مسلمان اپنے آپ کو سندھی، بنگالی، پنجابی، پٹھان، اور کیا کیا کچھ کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ نسلی

وصوبائی تعصب کی یہی آگ تھی جس نے سارے پاکستان کو جہنم میں تبدیل کر دیا تھا اور آئین کی تسوید کو جو آزاد و مہذب ملک کا پہلا لازمہ ہوتا ہے الجھا الجھا کر بھول بھلیاں بنا دیا تھا۔ گورنر جنرل نے اسی آگ کو بجھایا اور اسی گتھی کے سلجھانے کے سامان مہیا کئے روح پاکستان اسی کے لئے کراہ رہی تھی اور گورنر جنرل نے اسی کرب انگیز دعوت پر لبیک کہی۔

ہم اس وقت یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ طلوع اسلام کا موقف شروع سے یہی رہا ہے کہ پاکستان کا مطالبہ بطور ایک خطۂ ارض کے حصول کے نہیں کیا جا رہا بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس خطۂ زمین کو قرآنی طرز حیات کی تجربہ گاہ بنایا جائے۔ لہٰذا طلوع اسلام اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتا جب تک کہ پاکستان میں قرآنی نظام نافذ نہیں ہو جاتا۔ لیکن طلوع اسلام اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کر سکتا کہ قرآنی نظام کے نفاذ کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان بحیثیت ایک جغرافیائی ملک کے بھی متحد و مستحکم ہو کیونکہ پاکستان برقرار رہے گا تو قرآنی نظام بھی نافذ ہو سکے گا، اور اگر، خدانخواستہ، یہی محفوظ نہ رہا تو قرآنی مملکت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ طلوع اسلام حکومت کے ہر اس اقدام کی تائید کرتا ہے جس سے پاکستان کی وحدت کی بنیاد مضبوط تر ہوتی ہے اور اس کے استحکام اور سالمیت کو تقویت پہنچتی ہے۔ گورنر جنرل کے اقدامات سے ہم اسی لئے بالعموم مؤید ہیں کہ ہماری بصیرت کے مطابق وہ پاکستان کو سالمیت اور استحکام کی طرف لے جا رہے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ ہم حکومت کے ہر فیصلہ کو قرآن کے مطابق سمجھتے ہیں یا مرکزی حکومت نے جو مسودہ آئین مرتب کیا ہے، (اور جس کی تفاصیل ابھی شائع نہیں ہوئیں) وہ ہمارے نزدیک عین اسلامی ہے اور ہم اس کے فوری نفاذ کے طالب ہیں۔ ہم چاہتے صرف یہ ہیں کہ چونکہ اس سلسلے میں پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی ہے، اور اب عدالت کے فیصلے کے بعد پوزیشن نکھر کر سامنے آگئی ہے، اس لئے حکومت کو بلا مزید تاخیر اپنے منصوبے منظر عام پر لے آنے چاہئیں تاکہ ملک اور قوم کو یہ معلوم ہو جائے کہ حکومت نے جو مسودہ آئین تیار کیا ہے وہ کیا ہے اور اسے منظور کرانے کی کیا شکل پیش نظر ہے۔ اب جبکہ گورنر جنرل نے اس سلسلہ میں ضروری اختیارات سنبھال لئے ہیں، ہمیں توقع ہے کہ بہت جلد پوری تفاصیل ملک کے سامنے رکھ دی جائیں گی۔ یہ آئین کس حد تک اسلامی ہے، یا قابل قبول ہے، اس کا اندازہ تفاصیل سامنے آنے پر ہی لگایا جا سکے گا۔ اور ہم اس ضمن میں اپنی رائے کا اظہار اس وقت کریں گے۔

اب ہم گورنر جنرل کے آرڈی ننس کی تیسری شق یعنی وحدت مغرب کو لیتے ہیں۔ اس کی جو جزئیات سرکاری اعلامیہ میں شائع کی گئی ہیں ان کا ملخص یہ ہے کہ، نیا صوبہ گیارہ ڈویژنوں اور پچاس ضلعوں پر مشتمل ہوگا، اس کا دار الحکومت سردیوں میں لاہور ہوگا اور گرمیوں میں ایبٹ آباد کا علاقہ۔ عدالت عالیہ بھی لاہور میں ہوگی البتہ اس کا ایک بنچ پشاور میں ہوگا اور ایک کراچی میں تاکہ قانونی چارہ جوئی کے لئے ہر ایک کو لاہور جانے کی ضرورت نہ پڑے۔ مزید سہولت کے لئے مناسب مقامات پر سرکٹ بھی قائم کئے جائیں گے جہاں حسب ضرورت سرکٹ جج ضروری مقدمات کے فیصلے کریں گے۔ ترقیاتی منصوبوں کے بروئے کار لانے کے لئے ایک مشترکہ ہیئت قائم کی جائے گی جو نیم آزاد ہوگی۔ ملازمتوں میں بھرتی مغربی پاکستانی اساس پر ہوگی لیکن پسماندہ علاقوں کے لوگوں کا مناسب تحفظ کیا جائے گا اور انہیں ملازمت کے لئے خاص طور پر تیار کیا جائے گا۔ یہ تفاصیل زیادہ تر وہی ہیں جو اس سے بیشتر اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں اور ان پر تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ طلوع اسلام میں بھی انہیں زیر بحث لایا جا چکا ہے۔ اب چونکہ وحدت کا منصوبہ ایک یقینی درجے میں داخل ہو گیا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اس کے مقصد منشا کو پوری طرح سامنے رکھا جائے اور اس کی تکمیل میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے۔ ہم نے بارہا یہ لکھا ہے کہ جغرافی یا انتظامی حدبندیاں سہولت یا منافعت کی غرض سے ہوتی ہیں لیکن اگر وہ یہاں تک دل نشیں ہو جائیں کہ دلوں میں بھی حدبندیاں قائم ہو جائیں اور قوم ان اضافی نسبتوں میں تقسیم ہو کے رہ جائے تو یہی حدبندیاں انتہائی مذموم ہو جاتی ہیں اور اس قابل کہ انہیں حرف غلط کی طرح محو کر دیا جائے۔ پاکستان میں تخریبی عناصر نے ان لکیروں کو خوب اچھالا ہے اور ان کے نام پر جسد سیاست میں بڑا خطرناک زہر داخل کر دیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان حدبندیوں کا مٹا دینا ہی تقاضائے دانش ہے لیکن یہ جاننا چاہیئے کہ یہ بہر حال ایک تمہیدی قدم ہے اور اگر اس تمہید کے بعد مثبت اور تعمیری کارناموں کو نظر انداز کیا گیا تو یہ قابل قدر اقدام بھی بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گا۔ لہٰذا ہم گورنر جنرل اور ان کے ان رفقاء کی خدمت میں جو مغربی صوبے کے قیام پر مامور ہیں چند گزارشات پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔

ہم نے اس سے پہلے مشورہ دیا تھا کہ ضلعوں اور کمشنریوں کی تحدید اس طریقے سے کی جائے کہ مختلف صوبوں کے متصل علاقے ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہو جائیں کہ ان کی حدبندی کی لکیریں ڈھونڈے سے بھی نہ ملیں۔ یہ غنیمت ہے کہ بعض کمشنریوں میں ایسا کر دیا گیا ہے لیکن عمومی اعتبار سے موجودہ حدبندیوں کو بحال رکھا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کسی طرح مستحسن نہیں کہلا سکتا۔ کیونکہ جن لکیروں نے ہمارے دلوں تک کو تقسیم کر دیا ہے وہ چھوٹے پیمانے پر باقی رہیں تو جس فتنے کا سر کچلنے کا دعوے کیا گیا ہے وہ بدستور باقی رہے گا۔ ہمارا مطالبہ یہی نہیں کہ ان حدبندیوں کو یکسر خلط ملط کر دیا جائے بلکہ آئندہ آئین میں یہ گنجائش رکھنی چاہیئے کہ مغربی پاکستان کے باشندے جس حلقے سے چاہیں مجلس مقننہ کے امیدوار کھڑے ہو سکیں۔

دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ ملک میں سیاسی پارٹیوں کا وجود ختم کر دیا جائے۔ دیکھا جائے تو اس وقت سیاسی پارٹیاں عملاً ختم ہو چکی ہیں۔ ان کے خاتمہ کا مطلب محض یہ ہوگا کہ جو لاشے ارباب سیاست اٹھائے اٹھائے پھر رہے ہیں انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا جائے۔ سیاسی پارٹیاں ملت کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کا یقینی ذریعہ ہیں۔ یہ تقسیم صوبائی تقسیم سے کسی طرح کم مضرت رساں نہیں۔ اگر ایسا کر دیا جائے تو فضا وحدت سے معمور ہو جائے گی کیونکہ اہل پاکستان کی [illegible] کا مرجع ملک ہوگا یا آئیڈیالوجی، صوبہ یا پارٹی نہیں۔ اس کے لئے سب سے پہلے مسلم لیگ کو ختم کرنا ہوگا۔

تیسرا مشورہ یہ ہے کہ نظام و نصاب تعلیم کو شروع سے اس طرح ڈھالا جائے کہ نونہالان قوم کشادہ نظر، عالی ظرف بنیں اور انہیں تنگ دائروں اور علاقائی نسبتوں سے متاثر نہ ہو۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے قلب و نظر کی تطہیر اور سیرت کی تشکیل قرآن کریم کی تعلیم اور صحیح سیرت نبوی اور آثار صحابہؓ کی رو سے کی جائے جو قرآنی تعلیم کے عملی پیکر تھے۔ ہم نے تعلیم کے بدلنے کا بارہا مشورہ دیا ہے مگر افسوس کہ اس پر کچھ توجہ نہیں دی گئی۔ اب وقت ہے کہ نظام تعلیم کو ملی مقاصد کے مطابق بنایا جائے۔

ہم اس سے پہلے یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ ملازمتوں میں جو موجودہ صوبوں کا تناسب رکھا گیا ہے وہ بڑا خطرناک ہے اس کے نتائج ویسے ہی تباہ کن ہوں گے جیسے موجودہ صوبائی کوٹے سے ہوئے۔ اس سے جو صوبے مٹیں گے وہ ملازمتوں میں قائم ہو جائیں گے اور ذہنیتیں صوبائی تعصب سے ملوث رہیں گی۔ ہمارے نزدیک کرنے کا کام یہ ہے کہ جو علاقے کم تعلیم یافتہ ہیں یا جہاں ترقی کے مواقع کم ہیں ان کی ترقی پر خصوصی توجہ دی جائے تاکہ وہاں کے باشندے بربنائے اہلیت ملازمتوں میں آسکیں۔ اس کے لئے پسماندہ علاقوں کو قدرے انتظار ضرور کرنا پڑے گا لیکن اس سے ایک تو انہیں مناسب تعلیم و تربیت مل جائے گی دوسرے ملازمتوں کو معیار کارکردگی بہتر دیا جائے گا۔

خاتمے سے پہلے ہم یہ شکوہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مغربی پاکستان کی انتظامی کونسل نے جو سب کمیٹی بدیں مقصد مقرر کی تھی کہ وہ مناسب پروپیگنڈہ سے قوم کی نفسیات وحدت کے قالب میں ڈھالے، اس نے ابھی تک کوئی ایسا کارنمایاں نہیں کیا جس سے پتہ چلے کہ اسے اپنے فرائض منصبی کا کماحقہٗ احساس ہے یا ان سے عہدہ برآ ہونے کا مطلوبہ اہلیت رکھتی ہے۔ یہ سب کمیٹی وحدت کے حق میں فضا سازگار کرنے میں بڑا اہم کام کر سکتی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ یہ باقاعدہ سرگرم کار ہو اور اپنا مفوضہ فریضہ بطریق احسن ادا کرے۔ ایسی فضا شروع سے ہی پیدا کرنے کی کوشش نہ کی گئی تو ہمیں ڈر ہے کہ وحدت کی یہ مبارک کوشش بے نتیجہ ہو جائے گی۔

وزیر اعظم مصر کی خدمت میں

مصر کے صدر اور وزیر اعظم، جناب جمال عبدالناصر آئندہ ہفتے پاکستان تشریف لا رہے ہیں۔ بالفاظ صحیح تر آپ ایشیائی افریقی کانفرنس میں شرکت کے لئے انڈونیشیا جاتے ہوئے دو تین روز کے لئے یہاں قیام فرمائیں گے۔ یہ بات ہمارے لئے موجب مسرت ہے کہ ہمیں ایک ایسے مہمان کے استقبال کا موقع مل رہا ہے جن کے انقلابی کارنامے کے مسلمانان پاکستان بڑے مداح ہیں۔ انہوں نے بڑی ثابت قدمی کا ثبوت دیتے ہوئے طویل مدت کے بعد مصر کو ملوکیت کی لعنت سے

پاک کیا۔ گو وہ ابھی تک اپنے ہاں اپنے دعوے کے مطابق جمہوری طرزِ حکومت کی طرح نہیں ڈال سکے لیکن ان کے خلوص نیت اور ولولۂ عمل کی بابت شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ خدا کرے کہ وہ اپنی موجودہ مشکلات پر قابو پاکر اپنے ہاں صحیح اسلامی جمہوریت کا نظام قائم کرسکیں۔ پاکستان میں کرنل ناصر کا قیام دو تین روز کے لئے ہے اور ظاہر ہے کہ اس قلیل مدت میں وہ پاکستان و اہلِ پاکستان کے قلبی جذبات کو پوری طرح نہیں سمجھ سکیں گے۔ لیکن ان محدود لمحوں میں بھی وہ پاکستان کے دل کی دھڑکنیں ضرور محسوس کرسکیں گے اور اس کا اندازہ لگا سکیں گے کہ اہلِ پاکستان کے دل میں اپنے مصری بھائیوں کے لئے کتنے گہرے جذبات موجزن ہیں۔

فوجی انقلاب نے مصر کے لئے حرکت و عمل کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ کیونکہ جن مسائل نے اس کی توجہات قومی کو الجھا رکھا تھا اُن سے بہت حد تک اسے نجات مل گئی ہے۔ وہ برطانیہ سے سوڈان کے بارے میں بھی تصفیہ کرچکا ہے اور سویز کے بارے میں بھی۔ ان دو تنازعات کے حل سے وہ اندرونی تعمیر و ترقی اور استحکام کے لئے بھی فارغ ہوگیا ہے اور اقوام عالم کی صف میں اپنے شایانِ شان پارٹ ادا کرنے کے قابل ہوگیا ہے۔ ہمیں اس کی بے پایاں خوشی تھی اور ہم انتظار کر رہے تھے کہ اب مصر مسلمانوں کے دوسرے ممالک کے لئے وجہ تقویت اور جامعیت ثابت ہوگا لیکن افسوس کہ ہماری امیدیں موہوم ثابت ہوئیں۔

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

نئے مصر اور اس کی نئی قیادت نے حقائق اور حقوق دونوں کو نظر انداز کرکے غیروں سے دوستی کی پینگیں بڑھانا شروع کردیں۔ گذشتہ تین سالوں میں مصر نے بڑی حد سے ہندوستان کا ساتھ دیا اور اپنی عنانِ سیاست اس کے ہاتھ میں دینے تک سے گریز نہ کیا۔ خود کرنل ناصر نے علانیہ طور پر کہا کہ وہ اور پنڈت نہرو ایک ہی طرح سوچتے ہیں اور ان کی بھی خارجہ پالیسی وہی ہے جو پنڈت جی کی ہے۔ ہمیں اس بیان سے جو متعدد بار دہرایا گیا ہے۔ قلبی دکھ ہوا۔ کیونکہ ہندوستان وہ ملک ہے جس نے پاکستان کو ختم کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ یہی نہیں بلکہ وحدت اسلامیہ کو ناکام بنانے کے لئے بھی اس نے کچھ کم زور نہیں لگایا۔ یہ بڑی حد تک اس کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ افغانستان بلاوجہ پاکستان کا دشمن بن بیٹھا ہے اور پاکستان کے خلاف اوچھی حرکتوں سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ یہ صورتِ حال کسی ذی ہوش مسلمان کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہوسکتی۔ بالخصوص پاکستان کے لئے جس کی دعوت کا نقطۂ اساسی یہی ہے کہ مسلمان بحیثیت مسلمان ملت واحدہ ہیں اور جغرافیائی نسبتیں مسلمانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کرسکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان نے مصر اور دیگر ممالک اسلامیہ کے مسائل کو بالکل اپنے مسائل سمجھا اور ان کے مطالبات قومی کی پوری پوری تائید کی۔ عربی جسد سیاست پر "اسرائیل" ایک رستا ہوا ناسور ہے۔ پاکستان نے ہر موقع پر اس کی مذمت کی ہے اور آج تک اس حکومت کو تسلیم نہیں کیا۔ جہاں تک سویز اور سوڈان میں مصر کے مؤقف کا تعلق تھا، پاکستان نے اس کی پوری پوری حمایت کی۔ اس حمایت میں حکومت پاکستان بھی شامل ہے اور اہلِ پاکستان بھی۔ لیکن اس کے برعکس مصر نے کسی پاکستانی معاملہ میں پاکستان کی حمایت نہیں کی۔ ہمیں مصر سے حقیقی برادرانہ شکایت ہے کہ اس نے کشمیر کے بارے میں مطلقاً ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ کشمیر تنہا ہمارے لئے ہی زندگی اور موت کا سوال نہیں۔ یہ تصفیہ حل ہو جائے تو پاکستان دنیائے اسلام کی وحدت اور استحکام کے لئے بہترین خدمات انجام دے سکتا ہے۔ مصر کی حکومت نے نہ اسے پاکستانی مسئلہ سمجھ کر ہمارا ساتھ دیا اور نہ اسے وسیع تر پس منظر میں دیکھ کر اس کی اہمیت کو محسوس کیا۔

پاکستانی مؤقف کی تائید تو ایک طرف، مصر نے ان اقدامات مخلصانہ کی بھی مخالفت کی جو پاکستان نے عالم اسلامی کو باہم متحد کرنے کے لئے کئے۔ آج کی عالمی سیاست کے پس منظر میں مسلمان ممالک کی پوزیشن کو دیکھا جائے تو اس سے انکار کرنا ناممکن ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے بہترین چارہ کار یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں اور ایک مشترکہ لائحہ عمل طے کرلیں۔ وہ یوں متحد ہو جائیں تو مشرق و مغرب کی عالمی کشمکش میں توازن پیدا کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ مزید برآں وہ اپنے اندرونی استحکام اور بیرونی دفاع کے لئے بہتر سے بہتر انتظامات کرسکیں گے۔ ہمارے نزدیک تو اس اتحاد و تعاون کے لئے یہی بات کافی ہونی چاہیئے تھی کہ یہ ممالک مسلمان ہیں اور اس اعتبار سے وہ جس حد تک ایک دوسرے کا ساتھ دے سکتے ہیں کسی اور کا نہیں دے سکتے۔ لیکن اس کے ساتھ جغرافیائی اور علاقائی مفاد کا تقاضا بھی یہی ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ مصر نے ان حقائق کو ٹھکرایا اور ایک طرف دشمنِ وحدت اسلامیہ، یعنی ہندوستان سے رشتہ جوڑا اور دوسری طرف اپنی حکمت عملی کو نسلی بنیاد پر استوار کیا، خود ہندوستان نے اس نسبت کو ہوا دی کیونکہ وہ اس کے ذریعے مصر کو پاکستان سے علیحدہ کرسکتا تھا۔ اقوام عرب میں عربی نسلیت کا چرچا خصوصیت سے پہلی جنگ عظیم کے دوران میں ہوا، جب انگریزوں نے انہیں اس نقطہ پر جمع کرکے ترکوں کے خلاف لڑایا۔ قطع نظر اس بحث سے کہ اس کا دشمنانِ اسلام نے کیا فائدہ اٹھایا، ایک حد تک یہ کہا جاسکتا ہے کہ چالیس سال ادھر کے حالات میں نسل کا علم بلند کرنے کے لئے کوئی چیز وجہِ جواز ہو سکتی تھی تو بھی آج جبکہ ممالک عربیہ آزاد ہو چکے ہیں انہیں عربی نسل کی بنا پر اکٹھا کرنا ناممکن العمل بھی ہے اور خلافِ مصلحت بھی۔ مصر کی نسل پرستی کو دیگر ممالک عربیہ میں بجا طور پر ہوسِ قیادت کا دوسرا نام دیا گیا۔ یہ ایک رنجیدہ حقیقت ہے کہ عرب لیگ جس کا مقصد عرب ممالک کو ایک سٹیج پر اکٹھا کرنا تھا کچھ وقت کے بعد مصری عزائم کی آلہ کار بن کے اپنے پیش نظر مقصد کے حصول سے قاصر رہ گئی۔ عملاً اس نوکِ نشتر کی زد دور تک گئی ہے کیونکہ عرب لیگ کی ناکامی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بین العرب رقابتوں میں اضافہ ہوگیا ہے اور مصر کی حکمت عملی سے تنگ آکر بعض عرب ممالک اپنے تحفظ و بقا کی اور صورتیں پیدا کرنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ عراق نے تو برسوں مصر کا منہ دیکھ دیکھ کر بالآخر امریکہ سے فوجی امداد بھی کرلی ہے اور ترکی سے معاہدہ بھی۔ ذرا غیر جانبداری سے دیکھا جائے تو جو کام عرب لیگ سے نہیں ہو سکا وہ عراق کے اس نئے اقدام سے ممکن العمل ہوگیا ہے، کیونکہ اس سے عالم عرب ہی نہیں بلکہ عالم اسلامی کے اتحاد کے لئے راستہ صاف ہوگیا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ مصر حقائق کو برای العین دیکھتے ہوئے عراق کا ساتھ دے گا اور وحدت عالم اسلامی کی جو بنیاد رکھی گئی ہے اسے قصرِ بلند بنانے میں دوسروں کا ہاتھ بٹائے گا۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر قلبی اذیت ہوتی ہے کہ مصر نے وہ راہ اختیار کی جس سے خود عربوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ وہ زیادہ سے زیادہ شام اور سعودی عربیہ کو ساتھ ملا سکا ہے لیکن جس مشترکہ معاہدے کا بلند بانگ دعویٰ کیا گیا تھا اس کی تفاصیل آج تک طے نہیں ہوسکیں۔ اگر مصر کو اس میں کامیابی بھی ہو جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ایک طرف مصر ہوگا جو وحدت عالم اسلامی کے خلاف کام کرتا ہوگا۔ دوسری طرف عراق ہوگا جو مشرق وسطیٰ کی مشترکہ دفاع کے لئے کوشاں ہوگا۔ تیسری طرف لبنان، اردن وغیرہ، ہوں گے جو عراق کو ہمدردی سے دیکھیں گے اور مصر کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ گویا خود عرب تین گروہوں میں بٹ جائیں گے۔ ہم محترم کرنل ناصر سے باادب پوچھتے ہیں کہ عالم اسلامی کو چھوڑیئے، عالم عرب کو بھی چھوڑیئے، کیا اس میں مصر کا کچھ بھی بھلا ہوگا؟ اگر اس میں مصر کا کچھ بھی بھلا نہیں اور سب کا نقصان ہے تو کیا یہ لازم نہیں آتا کہ اس نقصان دہ پالیسی کو ترک کر دیا جائے؟

اب یہاں سے جناب کرنل ناصر انڈونیشیا تشریف لے جائیں گے۔ جس ایشیائی افریقی کانفرنس میں وہ شریک ہو رہے ہیں، اس کا چیف ایکٹر سرخ چین ہوگا اور دوسرا ایکٹر ہندوستان۔ ان دونوں کے مابین ایشیا کی قیادت کے لئے جنگ ہو رہی ہے۔ لیکن دونوں کا مفاد عاجلہ فی الحال ایک دوسرے کی تائید میں پنہاں ہے۔ اس مقصد کیلئے وہ "ایشیا ایشیا والوں کے لئے" اور "غیر جانبداری" کے نعرے لگا رہے ہیں۔ ان کی چال یہ ہے کہ اقوام مغرب ایک طرف ہو جائیں تو ایشیائی سٹیج ان کے قبضہ میں آجائے گا۔ ہمیں افسوس ہے کہ مصر دانستہ یا نادانستہ طور پر ہندوستان کو یہ گھناؤنا کھیل کھیلنے میں مدد دے رہا ہے۔ یوں تو مصر کی پالیسی ہی نام نہاد "غیر جانبداری" کی ہو گئی ہے لیکن انہی دنوں قاہرہ سے خاص طور پر اعلان کیا گیا ہے کہ مصر ایشیائی افریقی کانفرنس میں ہندوستان کے تصورِ غیر جانبداری کی تائید کرے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کانفرنس میں مسلمان ممالک کوئی متحدہ محاذ قائم نہیں کرسکیں گے اور مصر اُلٹا ہندوستان کی ہاں میں ہاں ملاکر اس محاذ کو عملاً قائم ہونے سے روکیگا۔ حالانکہ اس وقت اتفاق سے مسلمان ممالک کو جو اکٹھے ہونے کا موقع مل رہا ہے اسے تبادلۂ خیالات کا عمدہ ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔

ہم نے یہ چند گزارشات انتہائی خلوص دل سے کی ہیں۔ ہمارے لئے اس سے زیادہ اذیت کی بات کوئی اور نہیں ہوسکتی کہ ایک مسلمان ملک دوسرے مسلمان سے کٹ کر

رہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مخالفین نے اپنی مطلب برآریوں کے لئے ہمارے خلاف بہت کچھ پروپیگنڈہ کر رکھا ہے اور کرتے رہتے ہیں لیکن اب مسلمان ممالک آزاد ہیں اور انہیں یہ موقع مل گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے براہِ راست ملیں اور قریب سے دیکھ کر ایک دوسرے کو سمجھیں۔ اب کوئی وجہ نہیں کہ ہم دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیلیں یا اُن کا آلۂ کار بنیں۔ ہم مصر سے خصوصیت سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ پاکستان کو سمجھنے کی کوشش کرے پاکستان اس کا دشمن نہیں حقیقی دوست ہے۔ ہمارے قلب میں ہوسِ قیادت کا شائبہ تک نہیں۔ ہم علیٰ وجہ البصیرت عالمِ اسلامی کی نجات اتحاد و تعاون میں سمجھتے ہیں۔ اور اس لئے اس کے لئے کوشاں ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں مصر سے شکایت ہے تو اس کی نوعیت بالکل برادرانہ ہے۔ مصر کی پالیسی ہمارے نزدیک غلط بھی ہو گی تو ہم افہام و تفہیم سے اسے راہ پر لائیں گے۔ لیکن قطعاً کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائیں گے جس سے انہیں کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ انہی جذباتِ اخوت نے ہمیں مجبور کیا ہے کہ ہم مصر کو جتا دیں کہ مصر ہی نے تو دنیا کو بتایا تھا کہ گوسالہ پرست سامری جوانوں کو سیدھے راستے سے بہکاتا ہے، بڑا فریب کار ہے۔ اس کی باتوں میں نہ آجانا۔ یہ جہاں دکھائی دے اس سے دور دور رہنا اور "لامساس" کہنا۔ اور اب وہی مصر گوسالہ پرست سامریوں کے اتباع میں نجات ڈھونڈ رہا ہے! آسمان کی آنکھ نے اس سے بڑا انقلاب کم ہی دیکھا ہو گا۔ ہم اپنے اس مہمانِ عزیز سے صرف اتنی گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ حقائق پر غور کریں اور سوچیں کہ

ببیں کہ از کہ بریدی و با کہ پیوستی!

کابل کی اشتعال انگیزی

ہندوستان کے جہاں سر پر ڈورے ڈال کر اپنے مسلمانوں کی قومی سیاست کی راہ سے ہٹا لیا ہے وہاں افغانستان کو بھی مسحور کر کے پاکستان کے دشمنوں کی صف میں کھڑا کر رکھا ہے۔ افغانستان وہ ایک بدبخت ملک ہے جس نے شروع ہی میں اپنا ووٹ پاکستان کی رکنیت اقوام متحدہ کے خلاف دیا تھا۔ اس وقت سے کر آج تک اس نے پاکستان دشمنی کو ہی اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنائے رکھا ہے۔ غیر ذمہ دار افغانی حکمرانوں نے اپنے ملک میں اور ان کے بدنام نمائندوں نے دیگر ممالک میں پاکستان کے خلاف ہمیشہ زہر اگلا ہے۔ اس کی وجہ وقتاً فوقتاً یہ بتائی جاتی رہی کہ پختونوں کا وہ علاقہ جس کا وجود ان کے نہاں خانۂ دماغ میں تھا۔ اور جو پختونستان کہلاتا تھا۔ اسے غیر جمہوری طریق سے پاکستان نے غصب کر رکھا ہے۔ ڈھٹائی کی حد یہ ہو کہ افغانستان جیسا دقیانوسی ملک جس کی موجودہ حکومت جمہوریت کی مستقل توہین ہے۔ پاکستان کو جمہوریت کا واسطہ دیتا ہے۔ افغانستان کا مطالبہ یہ ہو کہ یہ موہوم علاقہ اس کو دیدیا جائے ادھر یہ بیہودہ مطالبہ کیا جا رہا ہے اور ادھر پاکستان سے طرح طرح کی تجارتی مراعات حاصل کی جاتی رہی ہیں۔ پاکستان ان کی کمینہ حرکات کو درگذر کرتے ہوئے انہیں مراعات دیتا چلا آیا ہے افغانستان کی تجارت بیرونی دنیا سے پاکستان کے ذریعہ ہو سکتی ہے اور اس کی پوری آسانیاں اسے میسر ہیں۔ اب افغانستان نے مزید رعایتوں کی تجویز پیش کر رکھی ہے جو زیر غور تھی کہ کابل کے پاکستانی سفارت خانہ پر بلوا کرا دیا گیا۔ کابل کے سرکاری بیان میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ پاکستانی سفارت خانہ پر حملہ عوام کا رضاکارانہ احتجاج تھا لیکن یہ حقیقت ساری دنیا جانتی ہے کہ وہاں کے عوام حکومت کے استبداد سے اس قدر سہمے ہوئے ہیں کہ وہ بے چارے جمہوری احتجاج کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا یہ باور کرنے میں شبہ ہی نہیں رہ جاتا کہ یہ حملہ حکومت نے کرایا ہے۔ اس طرح کے حملے جلال آباد اور قندھار میں بھی ہوئے ہیں۔

پاکستان میں اس غنڈہ گردی پر بجا طور پر شدید غم و غصہ کا اظہار کیا گیا ہے، اور افغانستان کے خلاف سخت کارروائی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ حکومت پاکستان نے مطالبہ کیا ہے کہ افغانستان معافی مانگے نقصان کا ہرجانہ ادا کرے، اور آئندہ کے لئے اس کی ضمانت دے کہ اس کی حدود میں پاکستانی محفوظ رہیں گے، سفارتی ضوابط و قواعد سے۔ یہ مطالبہ معقول ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ افغانستان کو اپنے خلوص نیت کا ثبوت دینے کے لئے کم از کم یہ ضرور کرنا چاہیئے۔ لیکن اس معاملہ کا صرف ایک پہلو ہے۔ اول تو وہاں کے جاہل اور بددماغ حکمرانوں سے یہ توقع عبث ہے کہ وہ شریفانہ طور پر اصلاحِ احوال کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ لیکن اگر وہ ایسا کر بھی لیں تو بھی یہ اصولی سوال اپنی جگہ رہتا ہے کہ دشمن کے ہاتھ میں کھیلنے والے اس احمق ملک سے آئندہ کیا برتاؤ کیا جائے افغانستان کے مسلسل رویہ نے ثابت کر دیا ہے کہ اس سے حسن اخلاق و مروت کا سلوک بیکار ہے وہ اسے کمزوری پر محمول کرتا ہے۔ اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ ہر سوز کے اس تلخ تجربہ کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ افغانستان کے متعلق رویہ سخت رکھا جائے اسے جو رعایتیں دی گئی ہیں وہ واپس لے لی جائیں اور آئندہ جب تک اس کے مزاج درست نہیں ہو جاتے اس کی کوئی بات نہ سنی جائے۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہو گا کہ افغانستان کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے، اور اس کے کردار پر کڑی نظر رکھی جائے ہمیں افسوس ہے کہ ہماری حکومت نے اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داری کو پورا نہیں کیا جو ہمارے نمائندے کابل میں متعین ہوتے رہے ہیں وہ عموماً پبلک میں یہی بیانات دیتے رہے ہیں کہ افغانستان سے ہمارے تعلقات بہتر ہو رہے ہیں۔ اور اب یوں ہو جائے گا اور یوں ہو جائے گا۔ خود موجودہ سفیر کرنل شاہ نے بھی اس سلسلہ میں بڑی امیدیں پیدا کر رکھی تھیں۔ اگر ہمارے نمائندے اس غلط فہمی میں دیانتداری سے مبتلا ہے، تو یہ ان کی سطح بینی اور کم نظری کا ثبوت ہے اور اگر سمجھتا تو تم کہ انہوں نے تصویر کا روشن رخ دکھا کر حکومت کو صحیح حالات سے بے خبر رکھا، تو پھر ہم کہیں گے کہ حکومت نے مجرمانہ تغافل سے کام لیا اور بروقت اصلاحِ احوال کے لئے کچھ نہیں کیا یہی ہو سکتا ہے کہ حالات کا صحیح اندازہ نہ ہمارے نمائندوں نے لگایا ہو۔ اور نہ ہماری حکومت کو حقیقت حال کا پورا علم ہو، ان میں سے کوئی شکل بھی ہو اب اس کی تلافی کی یہی صورت ہے کہ حقیقت حال کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور اگر کابل سے سفارتی تعلقات باقی رہیں تو ایسا انتظام کیا جائے کہ حکومت وہاں کی حقیقی فضا سے باخبر رہے نہ حکومت نہ خود دھوکے میں مبتلا ہو نہ ملک کو دھوکہ میں مبتلا کرے، اور ضرورت ہو تو سخت گیر اقدام سے بھی دریغ نہ کرے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو جو شور و داویلا کیا جا رہا ہے وہ بیکار محض ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ بدقسمتی سے پاکستان کی خارجی سیاست شروع ہی سے غلط راہوں پر پڑ گئی۔ اور اگرچہ اب تھوڑے عرصے سے اسے صحیح خطوط پر لانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ لیکن جو نقصان ہو چکے ہیں اُن کی تلافی کے لئے اس سے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ بالخصوص ہندوستان اور افغانستان کے معاملہ میں

(باقی صفحہ پر)

بین الاقوامی جائزہ

بین الاقوامی سیاست میں نقاطِ تصادم پورے نمایاں ہوتے جاتے ہیں اور یہ محسوس ہونا شروع ہو گیا ہے کہ عارضی اور وقتی نام نہاد معاہداتِ امن وہ فضا پیدا کرنے سے قاصر ہیں جس میں اطمینان سے سانس لیا جا سکے، کوریا میں التوائے جنگ ہوا تھا تو بڑے اطمینان کا اظہار کیا گیا تھا۔ یہ تھا بھی قابلِ فہم۔ تین سال کی جنگ کے بعد ہتھیار رکھے گئے تھے، اور صلح کی امیدیں پیدا ہو چلی تھیں۔ لیکن عملاً وہاں پھر جنگ کی سی فضا پیدا ہو رہی ہے شمالی کوریا میں جنگی تیاریاں ہو رہی ہیں جو خلافِ معاہدہ ہیں امریکہ ان سے تنگ آ کر سرے سے معاہدے کو ہی ختم کر دینا چاہتا ہے۔ کوریا سے نیچے فارموسا کا آتش فشاں اس ماہ میں منعقد ہونے والی ایشیائی افریقی کانفرنس کے بعد پھوٹ سکتا ہے، ہند چینی میں آٹھ سال کی مسلسل جنگ کے بعد امن کی صورت پیدا ہوئی مگر وہاں کے حالات بھی تشویشناک ہوتے جاتے ہیں، اشتراکی علاقوں میں جنگی تیاریاں ہو رہی ہیں، اور غیر اشتراکی علاقوں میں خانہ جنگی ہو رہی ہے۔ غرض مشرقِ بعید وہ لاوا ہے جس کا نتیجہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یورپ میں جرمنی اور آسٹریا کے مسائل بدستور لاینحل ہیں روس نے بھی اقوامِ یورپ کی طرح اپنے ممالک کی فوجی کمان ایک کرنے کی طرح ڈال دی ہے اگرچہ عملاً وہاں کی فوجی کمان اب بھی ایک ہی ہاتھ میں ہے، انگلستان میں تحدید اسلحہ سے متعلق جو مذاکرات ہوئے ہیں، وہ بے نتیجہ ثابت ہو رہے ہیں

اس صورتِ حال کا نتیجہ کیا ہو گا؟ امن یا صلح؟ چوٹی کے سیاست دان سب اس پر متفق ہیں کہ دول عظمیٰ کی جس کانفرنس کی ضرورت مدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ اسے دیر تک ملتوی نہیں کرنا چاہیئے انگلستان کے وزیر اعظم چرچل ایک عرصہ سے چار ممالک امریکہ، روس برطانیہ اور فرانس کے رئیسانِ مملکت کی کانفرنس پر زور دے رہے ہیں مگر اس کا موقعہ نہیں آیا۔ اس کا موقف یہ تھا کہ جب تک جرمنی آسٹریا وغیرہ میں عملاً صلح جوئی کا مظاہرہ نہیں کرتا ایسی کانفرنس بے کار ہو گی اب جبکہ معاہدات پیرس کی تصدیق جرمنی اور فرانس دونوں نے کر دی ہے تو امریکہ کے رویہ میں بھی تبدیلی آ گئی ہے اب انگلستان اور امریکہ کے نقطہ ہائے نگاہ میں یہ فرق ہے کہ برطانیہ اسے شروع کرنا چاہتا ہے اور امریکہ پیچھے ہے جون میں یو۔ این۔ او کی جشنِ نو سالہ سان فرانسسکو

تاریخی شواہد

(۱۰)

انکارِ رشد و ہدایت کا کے سلسلہ میں دوسرا اہم گوشہ عذاب الٰہی کا فلسفہ ہے اس کی تفصیلی بحث کا تو یہ مقام نہیں۔ لیکن یہاں اجمالی اشارات ضروری سمجھے گئے ہیں کیونکہ دعوتِ آسمانی کے سلسلے میں شروع سے اخیر تک یہ ٹکڑا مشترک ہے۔

قومِ نوحؑ کی غرقابی کے واقعہ پر سرسری مورخانہ نگاہ صرف اتنا بتا سکے گی کہ پانی کا بلا انگیز طوفان آیا اور سوائے ان لوگوں کے جو ایک کشتی میں سوار تھے، سب غرق ہو گئے۔ ان کی بستیاں نذرِ سیلاب ہو گئیں۔ سارے علاقے میں کوئی متنفس باقی نہ رہا۔ جہاں اس شدت کا سیلاب آتا ہے ایسا ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض محققین نے اس امر کی تحقیق کی بھی کوشش کی ہے کہ اس طوفان (DELUGE) کا طبعی سبب کیا تھا۔ مثلاً (SUSS) کا خیال ہے کہ:

"خلیج فارس کا ساحل کسی عظیم الشان آتش فشاں لہر سے ٹکرایا اور اس کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا طوفان باد و تند (CYCLONE) شامل ہو گیا۔"

(Encyclopaedia of Religions & Ethics)

لیکن ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کریم ان واقعات کا ذکر کس انداز سے اور کس مقصد کے لئے کرتا ہے۔ قومِ نوحؑ کے سلسلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان کی تباہی سیلاب سے ہوئی۔ اس کے بعد قوم عاد۔ قوم ثمود۔ قوم لوط وغیرہ کے ضمن میں ہم دیکھیں گے کہ ان کی تباہی زلزلہ کے جھٹکوں۔ کوہ آتش فشاں کی شرر باریوں اور آندھی کے جھکڑوں وغیرہ سے ہوئی۔ یعنی خارجی کائنات کے طبعی حوادث ان کی تباہی کا موجب بنے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ حوادث ان کی بداعمالیوں کا نتیجہ تھے یا انہیں ان کی تباہی کا موجب بنا دیا گیا تھا؟ اس کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ آج بھی زلزلے آتے ہیں۔ آتش فشاں پہاڑ پھٹتے ہیں۔ سیلاب بڑے بڑے ملکوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ آندھیوں کے طوفان چلتی ہوئی ریل گاڑیوں کو اٹھا کر دریاؤں میں پھینک دیتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ حوادث کسی قوم کے اعمال کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کسی خاص خطۂ زمین کے انسانوں نے بدعملیاں شروع کیں اور ان پر اس قسم کا طبعی حادثہ وارد ہو گیا۔ یا یہ کہ اس قسم کے حوادث میں صرف بدعمل لوگ ہی تباہ ہوتے ہوں نیک اعمال والے اس سے محفوظ رہتے ہوں۔ یہ طبعی حوادث دنیا کے ہر خطے میں آتے رہتے ہیں اور ان میں اچھے اور برے ہر قسم کے انسان تباہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ یہ حوادث کسی قوم کے غلط اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں اور نہ ہی ان سے صرف بداعمال لوگ تباہ ہوتے ہیں۔

ابتداءً میرا بھی یہ خیال تھا کہ ان حوادث اور ان اقوام کے اعمال میں ایک بنیادی ربط تھا لیکن قرآن پر مزید غور و تدبر نے میری راہ نمائی اس طرف کی ہے کہ یہ حوادث ان کے اعمال کا نتیجہ نہیں ہوتے تھے۔ البتہ یہ ان کی تباہی کا ذریعہ بن جاتے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے حادثہ کا علم، اس رسول کو قبل از وقت مل جاتا تھا اور اُس سے کہہ دیا جاتا تھا کہ وہ یا تو اس سے محفوظ رہنے کی کوئی تدبیر کرے یا اُس سے پہلے اس جگہ سے نکل کر اپنے ساتھیوں سمیت کسی دوسری جگہ چلا جائے۔ چنانچہ ہم نے حضرت نوحؑ کے تذکرہ میں دیکھا ہے کہ انہیں اس آنے والے طوفان کا علم قبل از وقت دیدیا گیا اور کہہ دیا گیا کہ وہ اس سے بچنے کے لئے کشتی بنا لیں۔ وہ اپنے مخالفین کے سامنے کشتی بنانے میں مصروف تھے۔ لیکن چونکہ ان مخالفین کا انداز ہی یہ ہو گیا تھا کہ وہ ان کی ہر بات کو غلط سمجھتے اور اس کی تکذیب کرتے تھے، اس لئے وہ بجائے اس کے کہ حضرت نوحؑ کی بات کو سچا سمجھ لیتے، الٹا ان کا مذاق اُڑانے لگے چنانچہ سیلاب اپنے وقت پر آیا۔ حضرت نوحؑ اور ان کی جماعت اس کشتی کے ذریعے اس تباہی سے محفوظ رہ گئے اور باقی قوم غرق ہو گئی۔ لہٰذا ان حوادث کے ذریعے ان اقوام کی تباہی میں اگر کوئی مافوق الفطرت عنصر تھا تو اس رسول کو آنے والے حادثہ کا علم قبل از وقت دیدیا جاتا تھا اور وہ اپنی اور اپنی جماعت کی حفاظت کا مناسب انتظام کر لیتا تھا لیکن نبی اکرمؐ کے زمانہ میں مخالفین کی تباہی کے لئے یہ ذریعہ اختیار نہیں کیا گیا۔ اور چونکہ نبی اکرمؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آ سکتا اس لئے اب اس قسم کے حوادث کے قبل از وقت علم مل جانے کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ لہٰذا اب قوموں کی تباہی کی یہ صورت اس شکل میں باقی نہیں رہی جس شکل میں یہ اقوام سابقہ کے سامنے آیا کرتی تھی۔ قرآن نے قوموں کی موت اور زندگی کے ابدی قوانین دیدیئے ہیں اور یہ بتا دیا ہے کہ جو قوم ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے گی اسے زندگی کی خوشگواریاں نصیب ہو جائیں گی جو ان کے خلاف جائے گی وہ تباہ اور برباد ہو جائے گی۔ جو قوم اپنے معاشرے کی عمارت غلط بنیادوں پر استوار کرتی ہے، وہ اپنے غلط نظام کی وجہ سے تباہ ہو جاتی ہے اس کی تباہی خود اس غلط معاشرہ کی بنیادوں کے اندر مضمر ہوتی ہے۔ اس کا نام قانون مکافاتِ عمل ہے یعنی قوموں کے اجتماعی اعمال ان کی زندگی اور موت کا باعث بنتے ہیں اور یہ نتائج خدا کے اس قانون کے مطابق مرتب ہوتے ہیں جن میں کوئی رد و بدل نہیں کر سکتا۔ نہ ہی کسی میں یہ قوت ہے کہ وہ ان قوانین کے نتائج کو بدل دے۔ قوموں کے عروج و زوال کے فیصلے اس غیر متبدل قانون کے مطابق ہوتے ہیں اور اسی کو ان کی "تقدیر" کہا جاتا ہے۔

لہٰذا اقوام سابقہ کی تباہی اور اقوام حاضرہ کی ہلاکت کے سلسلہ میں اس اہم حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ قرآن اقوام سابقہ کا تذکرہ اس لئے کرتا ہے کہ بتایا جائے کہ انہوں نے صحیح نظامِ زندگی کی دعوت کو نہ مانا اور اس دعوت دینے والوں کی مخالفت کی اور وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ اصل مقصد ان کی غلط روشِ زندگی کی طرف توجہ منعطف کرانا ہے (اس مقام پر ان اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ان امور کے تفصیلی مباحث اپنے مقام پر آئیں گے)

حضرت نوحؑ نے دعا کی تھی کہ:

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ
مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۝ (۷۱/۲۶)

اور نوح نے دعا کی۔ اے اللہ ان نہ ماننے والوں میں سے ایک کو بھی زمین پر باقی نہ چھوڑ۔

بعض لوگ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ طوفان عالمگیر تھا اور تمام صفحۂ ارض اس کی لپیٹ میں آ گیا تھا اور روئے زمین پر کوئی ذی روح باقی نہیں رہا تھا سوائے حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کے جو کشتی میں سوار تھے۔ یہ خیال صحیح نہیں اور دانستہ یا غیر شعوری طور پر تورات سے مستعار لیا گیا ہے۔ تورات (کتاب پیدائش) میں لکھا ہے کہ

"خداوند خدا نے کہا کہ میں چالیس دن اور رات متواتر مینہ برساؤں گا اور ہر اس ذی روح کو جسے میں نے پیدا کیا ہے روئے زمین سے فنا کر دوں گا۔" (پیدائش ۷/۴) چنانچہ چالیس شب و روز کی بارش کے بعد ایک سو پچاس دن تک طوفان کا پانی موجیں مارتا رہا اور ساتویں مہینے سفینۂ نوح اراراط کی پہاڑیوں پر جا کر رُکا۔ اور دسویں مہینے جا کر پہاڑ کی چوٹیاں دکھائی دیں۔ (پیدائش ۸/۲۴ ز ۸/۵) اور جب زمین نئے سرے سے خشک ہوئی تو جو جاندار کشتی نوح میں تھے ان کے علاوہ اور کہیں کوئی متنفس باقی نہ تھا (پیدائش ۷/۲۱-۲۳) لیکن قرآن کریم نے کہیں ایسا نہیں کہا۔ برعکس اس کے یہ ظاہر ہے کہ حضرت نوحؑ کا مخاطب اپنی قوم سے تھا۔ ان کی دعوت اُن ہی کے لئے تھی اور اس دعوت کی تکذیب بھی انہی کی طرف سے ہوئی۔ لہٰذا یہ عذاب بھی انہی مکذبین پر وارد ہوا۔ باقی دنیا کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا؟ طوفانِ نوحؑ کی آماجگاہ وہی وادی تھی جہاں یہ قوم آباد تھی۔

نظامِ ربوبیت

نوعِ انسانی کا سب سے مشکل مسئلہ معاش کا مسئلہ ہے۔
انسانی فکر اس مسئلے کے حل میں آج تک کس طرح ناکام رہا ہے اور
قرآن اس کا کیا حل دیتا ہے

یہ کتاب قرآنی نظامِ ربوبیت کا منشور ہے
جو عنقریب چھپ کر تیار ہو جائے گی

عورت کا قرآن

(۹)

(۹) لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (حشر ع ۳)

اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو دیکھتے کہ وہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا۔

(۱۰) هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ اَنْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّاۤ اَهْدٰى مِنْهُمْ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ (انعام ع ۲۰)

اور یہ بڑی خیر و برکت والی کتاب نازل کی ہے سو اس کا اتباع کرو اور اپنے آپ کو اس سے ہم آہنگ بنا لو تاکہ تم پر رحمت ہو۔ کبھی تم لوگ یوں کہنے لگتے کہ کتاب تو صرف ہم سے پہلے جو دو فرقے (یہود و نصاریٰ) تھے اُن پر نازل ہوئی تھی اور ہم اُن کے پڑھنے پڑھانے سے بالکل بے خبر تھے۔ یا پھر یوں کہتے کہ اگر ہم پر کوئی کتاب نازل ہوتی تو ہم اُن سے زیادہ راہ پر ہوتے۔ سو اب تو تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل جو رہنمائی کا ذریعہ اور سراسر رحمت ہے۔

(۱۱) وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (اعراف ع ۲۴)

جب قرآن پڑھا جایا کرے تو تم اس کی طرف کان لگا دو اور خاموش رہا کرو تاکہ تم پر رحمت ہو۔

(۱۲) فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ (زمر ع ۲)

سو اے رسول! میرے بندوں کو خوش خبری سنا دیجئے، اُن کو، جو اس کلام کو کان لگا کر سنتے ہیں پھر اُس کی اچھی اچھی باتوں پر عمل کرتے ہیں کہ یہی ہیں جو اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں اور یہی ہیں جو صاحب عقل ہیں۔

(۱۳) فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ (نحل ع ۱۳)

سو جب تم قرآن پڑھنا چاہو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔ یقیناً ان لوگوں پر اس کا قابو نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں، اور اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اُس کا قابو تو صرف اُنہی لوگوں پر چلتا ہے جو اُس سے تعلق رکھتے ہیں اور اُن لوگوں پر بھی جو مشرک ہیں۔

(۱۴) وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا (بنی اسرائیل ع ۱۲)

اور قرآن کے مضامین کو ہم نے الگ الگ کرکے ٹھہرا دیا ہے تاکہ تم اس کو لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کے پڑھو اور ہم نے اس کو نازل کرنے میں بھی تدریجاً نازل کیا ہے۔

(۱۵) وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (مزمل ع ۱)

اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کے پڑھا کرو۔

(۱۶) فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (مائدہ ع ۱۲ و تغابن ع ۲)

پھر اگر تم اعراض کرو گے تو یہ جان رکھو کہ رسول کے ذمہ تو صرف، صاف صاف پہنچا دینا تھا۔

(۱۷) وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِى اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (فرقان ع ۳)

اور رسول نے کہا کہ "اے میرے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو بالکل ہی چھوڑ دیا"

فَذَكِّرْ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ اِنَّ اِلَيْنَاۤ اِيَابَهُمْ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (غاشیہ ع ۱)

سو تم سمجھا دو اس لئے کہ تم نصیحت کرنے والے اور سمجھانے والے ہو۔ تم کو اُن پر حاکم یا داروغہ مقرر نہیں کیا گیا ہے پھر جو روگردانی کرے گا تو اللہ اس کو بھاری سزا دے گا۔ ان کو پھر پھر کر ہمارے قوانین ہی کی طرف بالآخر لوٹنا ہے۔ پھر اُن کا حساب چکا دینا ہمارے قوانین کے ذمہ ہے (کہ وہ ان کے اعمال کے صحیح نتائج مرتب کریں)

اسلام

(۱) لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (بقرہ ع ۲۲)

"نیکی اور بھلائی کی راہ یہ نہیں ہے کہ تم نے (عبادت کے وقت) اپنا منہ پورب کی طرف پھیر لیا یا پچھم کی طرف کر لیا۔ یا اسی طرح کی دیگر رسومات ادا کر دیں) یا اسی طرح کی دیگر رسومات ادا کرا دیں) بھلائی کی اور نیکی کی راہ تو ان لوگوں کی راہ ہے جو:-

(۱) جو اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، الکتاب (یعنی قرآن پر) اور خدا کے تمام نبیوں پر ایمان لاتے ہیں۔

(۲) جو اس کی محبت کے باوجود مال دیتے ہیں رشتہ داروں کو اور ان لوگوں کو جو معاشرہ میں تنہا رہ گئے ہیں یا جن کی صلاحیتیں رک کر رہ گئی ہیں اور مسافروں کو اور ضرورتمندوں کو۔ اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کرتے ہیں۔

(۳) جو نظام صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور لوگوں کو ان کی نشوونما بہم پہنچاتے ہیں

(۴) جو اپنی بات کے پکے ہوتے ہیں۔ جب زبان ہار دیتے ہیں تو اسے پورا کر کے رہتے ہیں۔

(۵) جو تنگی و مصیبت کی گھڑی ہو، یا خوف و ہراس کا وقت، ہر حال میں ڈگمگاتے نہیں بلکہ توازن بدوش چلتے رہتے اور اپنی راہ میں ثابت قدم رہتے ہیں۔

سو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں جو نیکی کی راہ میں سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو اپنے آپ کو قوانین الٰہیہ سے ہم آہنگ رکھنے والے ہیں۔

معاشرتِ اسلام
مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ
سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات
صفحات ۱۹۲ قیمت دو روپے

مجلسِ اقبال

(۴)

سرچشمۂ اسلام یعنی قرآن، حدیث و تصوف کے لفظ تک سے نا آشنا ہیں۔ یہ لفظ دوسری صدی ہجری میں عربی زبان میں داخل ہوا۔ مستشرقین یورپ و دیگر محققین جن میں سے کوئی کہتا ہے کہ تصوف فلسفۂ اشراق سے لیا گیا ہے، کوئی اس کا ماخذ کلیساؤں کی رہبانیت کو قرار دیتا ہے۔ ان کی تحقیقات لکھنے کا نہ یہ موقع ہے نہ اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش ہے، تاریخ اسلام بھی ہمارے سامنے ہے۔ آں سے جہاں تک معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ ..... ابتدا میں جو اہلِ زہد تارک الدنیا اور گوشہ گیر ہو کر عبادت اور ریاضت میں مصروف رہتے تھے ان کو لوگ صوفی کے نام سے پکارنے لگے۔ یعنی جیسا کہ پیرزادہ صاحب نے فرمایا ہے۔

پیش طاق صوفیاں احساں بود
اتباع سنت دستر آں بود

اس زمانہ میں تصوف اخلاص کا نام تھا جس کو حدیث شریف میں "احسان" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، یہی وہ تصوف ہے جس کی مدح غزالی وغیرہ ائمۂ اسلام نے لکھی ہے۔

لیکن جب تاتاریوں کے حملے شروع ہوئے اور چنگیز و ہلاکو نے ایک قیامت صغریٰ برپا کر دی تو ان کی ہولناک خونریزیوں سے اُمت کے فاتحانہ جذبات مٹ گئے، دنیا کی طرف سے ان کے دل سرد ہو گئے، طبیعتوں کا جوش اور ولولہ جاتا رہا، حوصلے پست اور ہمتیں سست ہو گئیں۔ زوال و فنا کے نقشے آنکھوں کے سامنے پھر گئے، میلانِ خاطر زہد اور ترکِ دُنیا کی طرف بڑھ گیا، اور سرمایہ توکل و قناعت کو لے کر گوشۂ عافیت میں بیٹھنا پسند آیا۔ عالم فانی کے جاہ و جلال کی وقعت نگاہوں میں نہ رہی، بوریائے فقر سریر سلطنت سے زیادہ عزیز سمجھا گیا۔ کلاہ نمدی کو تاج زر پر ترجیح دی گئی اور پکار اُٹھے

گوشۂ عافیت و کنج قناعت گنجیست
کہ بشمشیر میسر نشود سلطاں را

بفراغِ دل زمانے نظرے بہ ماہ رُئے　　بہ ازانکہ چتر شاہی ہمہ عمر ہائے ہوئے

مئے دو سالہ و معشوق چاردہ سالہ　　ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جاں درو درجست
کلاہ دل کش است اما بترک سر نمی ارزد

ذوقِ علم طبائع سے یہاں تک مسلوب ہو گیا کہ "شیوۂ قلندری" کے مقابلہ میں "رہ و رسم پارسائی دور و دراز" نظر آنے لگی۔ عالم ذوق میں حلقہ یاراں میں "خلوت در انجمن" ہونے لگی۔ اور سجادہ ہی پر "سفر در وطن" کی کٹھن منزلیں طے کی جانے لگیں۔ شریعت اور حقیقت دو جداگانہ راستے قرار پائے اور ان میں پوست اور مغز کی تفریق کی گئی۔ علماء و فقہا محجوب و بے بصر سمجھے گئے۔ یہ اثرات اگر صرف ایک ہی جماعت تک محدود ہوتے تو نقصان نہ ہوتا۔ لیکن شاعری کے ساز پر یہ ترانہ کچھ اس انداز سے چھیڑا گیا کہ تمام ملک اس صدا سے گونج اُٹھا اور ادبیات اسلامیہ میں ایک قسم کے جمود اور رہبانیت کا اثر ساری ہو گیا۔

شوکت اسلام کے زوال کے اسباب یوں تو پہلی ہی صدی ہجری سے شروع ہو گئے تھے مثلاً سیاست کی خرابی، یعنی وہ جمہوریت جو اسلام لے کر آیا تھا جس نے ہر مسلمان کو آزاد اور خود مختار بنا دیا تھا ہاتھوں سے جاتی رہی، اور اس کے بجائے استبدادی حکومت قائم ہو گئی، جس نے تمام امت کو غلام بنا دیا۔ مسلمان بے گناہ قتل کر دیئے جاتے تھے۔ ائمہ و علماء جو اپنے اپنے زمانہ کے روشن چراغ تھے، بیشتر زیر عتاب، زیر خنجر یا زیر طوق و زنجیر رکھے جاتے تھے اور حق گو زبانیں سفاکی سے خاموش کر دی گئی تھیں کہ ان مظالم کے خلاف ایک لفظ نہیں نکال سکتی تھیں۔ اس طرح پر "مسلم" حریت عمل سے محروم کر دیا گیا۔ پھر علمی تقلید جس سے حریت فکر بھی جاتی رہی۔ یہ شکنجہ ایسا سخت تھا کہ ایک زمانہ میں یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی کہ اہل علم اس خوف سے کہ کہیں کوئی دشمن ان کے اوپر تہمت لگا کر قتل نہ کرا دے اپنی صحت عقیدہ کی سند قاضی سے لے کر ہر وقت اپنے پاس رکھتے تھے لیکن اس میں شک نہیں کہ اسلام میں اس بیرونی عنصر کے شمول سے جو جمود پیدا ہوا اس نے بھی بہت کچھ ان اسباب زوال کو تقویت دی۔ اور خاص کر ہندوستان میں تو اسلام کی حالت اور بھی خراب ہوئی۔ یہاں تک کہ ایک غیر مسلم شخص یعنی تو میت کا مشہور مبصر ڈاکٹر لیبان اپنی کتاب تمدن ہند میں یہاں کے مسلمانوں کی نسبت یہ لکھنے پر مجبور ہوا کہ:

> وہ اسلام جو اس وقت ہند میں رائج ہے اس کی حالت بھی بالکل ویسی ہی ہو گئی ہے جیسے ہند کے اور مذاہب کی۔ اس میں مساوات بھی قائم نہیں جس کی وجہ سے اوائل میں اس کو اس قدر کامیابی ہوئی تھی۔

پھر ایک جگہ لکھتا ہے:

> ہندوستان کے اسلام کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اس مذہب کی یہاں آکر کیسی مٹی خراب ہوئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے رموز بے خودی میں موجودہ مسلمانوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں کچھ بھی شاعرانہ مبالغہ نہ سمجھنا چاہیئے۔

مسلم از سرِ نبی بے گانہ شد　　باز ایں بیت الحرم بت خانہ شد
از منات ولات و عزیٰ و ہبل　　ہر یکے دارد بتے اندر بغل
شیخ ما از برہمن کافر تر است　　زانکہ او را سومنات اندر سر است
رخت ہستی از عرب برچیدہ　　در خمستانِ عجم خوابیدہ
شل ز برفاب عجم اعضائے او　　سرد تر اشک او صہبائے او
ہم چو کافر از اجل ترسندہ　　سینہ اش فارغ ز قلب زندہ

قرآن شریف میں نص قطعی موجود ہے۔ "ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا" پھر آخر کیا وجہ ہے کہ ہم اس سے محروم ہو گئے؟ میرے خیال میں اس کا جواب صرف یہی ہے جو قرآن شریف دیتا ہے: "ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا" ڈاکٹر صاحب نے بہت صحیح فرمایا ہے۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن　　نیست ممکن جز بقرآں زیستن
صوفیِ پشمینہ پوش و حال مست　　از شراب نغمۂ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش　　در نمی سازد بقرآں محفلش

طلوع اسلام کی مدد کیسے کر سکتے ہیں

- اپنے احباب کو طلوع اسلام کا خریدار بنائیے۔
- اپنے شہر میں طلوع اسلام کی ایجنسی قائم کیجیے۔
- کسی مقامی ایجنٹ کو تیار کیجیے کہ وہ طلوع اسلام کا لٹریچر منگائے۔
- ممکن ہو تو اپنے علاقہ سے طلوع اسلام کے لئے اشتہار مہیا کیجیے۔

اسلام کی سرگزشت

جزیرۂ عرب اور قبائل عرب کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں۔ عربوں کے دیگر ممالک و اقوام کے ساتھ تجارتی تعلقات اور سرحدوں میں عرب کی متمدن و مہذب مملکتوں کے قیام کا تذکرہ بھی کیا جاچکا ہے۔ جن میں شعر و ادب کے اضمحلال سے گفتگو کی جارہی تھی۔ موجودہ اشاعت میں عربوں میں یہودیت و نصرانیت کے فروغ سے بحث کی گئی ہے۔

بہرحال ابتدائی عیسوی صدی میں یہودی مستعمرات، تیماء، فدک، خیبر، وادی القریٰ اور یثرب میں موجود تھے جن میں سے اہم ترین مستعمرہ یثرب ہی کا تھا۔ یثرب کے یہود تین قبیلوں پر مشتمل تھے بنو نضیر، بنو قینقاع اور بنو قریظہ۔

یہودی لوگ جزیرۂ عرب میں جہاں بھی انھوں نے قیام کیا زراعت کے اندر مہارت رکھنے میں مشہور تھے۔ جیسا کہ خود یثرب میں بھی یہ لوگ زراعت کے علاوہ مختلف معدنی صنعتوں مثلاً لوہاری سناری اور اسلحہ سازی میں مشہور تھے۔

سنہ ۳۰۰ء کے لگ بھگ یثرب میں یمن سے آئے ہوئے دو قبیلے اوس اور خزرج بھی موجود تھے۔ مگر یہودی اس سے پہلے اس شہر کو آباد کر چکے تھے۔ ابتداءً یہودیوں اور اوس خزرج کے درمیان تعلقات خوشگوار تھے۔ لیکن ہجرت سے پہلے یہ تعلقات خراب ہو چکے تھے جس کی وجوہ مؤرخین نے بہت مختلف بیان کی ہیں۔

یہودیوں نے جزیرہ کے جنوب میں بھی اپنے مذہب کی اشاعت میں نمایاں کام کیا تھا۔ حتیٰ کہ یمن کے بہت سے قبائل یہودی بن چکے تھے۔ ان یہودی ہو جانے والوں میں سے مشہور ترین ہستی ذونواس کی گذری ہے جو یہودیت نوازی اور نجران کے عیسائیوں سے جنگ کرنے میں بہت مشہور تھا۔ اس کا سبب مورخین نے یہ بیان کیا ہے کہ نجران میں ایک یہودی رہتا تھا جس کے دونوں بیٹوں کو نجران کے عیسائیوں نے ظلماً قتل کر دیا تھا۔ اس یہودی نے ذونواس سے فریاد کی اور یہودیت کا واسطہ دلا کر اہل نجران کے خلاف ——— جو نصرانی تھے ——— اس سے مدد مانگی۔ ذونواس نے اس یہودی فریادی اور یہودیت کی خاطر نجران پر حملہ کر دیا[1]۔

بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ ذونواس کا یہ حملہ وطنی مفاد کے ماتحت تھا۔ بات یہ تھی کہ نجران کے نصرانی اہل حبشہ کے حلیف تھے۔ حبشہ کی حکومت نجران میں نصرانیت کی ایک حامی جماعت تیار کر رہی تھی۔ اس نے اس نصرانیت کو یمن کے داخلی حالات میں مداخلت کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ ذونواس اور اس کی قوم نے اس حبشی اثر و نفوذ کو ختم کر دینا چاہا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ذونواس نے نجران کے نصاریٰ کو قتل کر دیا تو بقیۃ السیف نے حبشہ ہی سے مدد مانگی اور اس نے ان کو امداد بہم پہنچائی۔ آپس میں کئی جنگیں ہوئیں۔ اور ہاتھیوں والی فوج کی جنگ ——— عام فیل جس کا ذکر قرآن کریم میں سورۂ فیل میں آیا ہے ——— اس سلسلہ کی ایک کڑی تھی جس کا ذکر کرنے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔

یہودی جزیرۂ عرب کے جن شہروں میں مقیم تھے انھوں نے زیادہ تر تورات کی تعلیمات و بیانات پھیلا رکھے تھے۔ مثلاً دنیا کی پیدائش کی تاریخ، حشر و نشر اور حساب و کتاب اور میزان۔ انھوں نے مفسرین تورات کی تفسیریں۔ اور ان سے متعلق افسانے اور خرافات بھی سارے عرب میں پھیلا دیئے تھے ——— بالکل اسی طرح جیسا کہ بعد میں ——— کعب الاحبار اور وہب بن منبہ کی قسم کے لوگوں نے جو یہودی تھے اور بعد میں مسلمان ہو گئے تھے، قرآن کی تفسیروں میں ان افسانوں اور خرافات کو داخل کیا ہے۔ عربی زبان پر بھی یہودیوں کے کافی اثرات تھے۔ ان لوگوں نے عربی زبان میں بہت سے ایسے الفاظ داخل کر دیئے تھے جن کو ان سے پہلے عرب لوگ جانتے بھی نہ تھے۔ اسی طرح ایسی دینی اصطلاحات بھی زبان میں داخل کر دی تھیں جن کا عربوں کو کوئی علم نہیں تھا۔ جیسے جہنم، شیطان، ابلیس وغیرہ ذالک۔

اس پر یہ اضافہ اور کر لیجئے کہ یہودیت، جب جزیرۂ عرب میں داخل ہوئی ہے تو وہ یونانی تہذیب سے بڑی حد تک متاثر ہو چکی تھی۔ کیونکہ انھوں نے یونانی اور رومی حکومت کے ماتحت صدیاں گذاری تھیں۔ علاوہ ازیں یہودیت اسکندریہ اور بحر ابیض کے کنارہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ جو یونانی تہذیب کا مرکز تھے یہودی علماء دین میں ایسے لوگ موجود تھے جو یونانی فلسفہ کو سیکھ کر فلسفی آداب سے مسلح ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یونانی فلسفہ یہودیت میں بالکل اسی طرح سرایت کرتا چلا گیا۔ جس طرح رومی قانون کے بعض مبادی اس میں سرایت کرتے چلے گئے تھے۔

بالڈوین نے اپنی کتاب "معجم الفلسفہ" میں لکھا ہے کہ مغرب و مشرق کا اختلاط اسکندریہ میں ہوا اور مدنیت، علوم اور دین کے بارے میں رومی، یونانی اور شامی آراء کا امتزاج ان تمام امور میں مشرق اقصیٰ کی آراء کے ساتھ ہوا جس نے ایک بالکل ہی نئی چیز پیدا کر دی تھی۔ جس کی موجد مغرب کی بحث و تفتیش اور مشرق کا الہام تھا۔ یہیں دین کو فلسفہ کے ساتھ مستحکم اتصال حاصل ہوا جس کے نتائج میں ایسے دینی عقائد ظاہر ہونے لگے جن کی بنیاد نہ خالص فلسفہ پر تھی اور نہ خالص دین پر، بلکہ جن میں دونوں کا اپنا حصہ تھا۔ یہ دو چیزوں سے پیدا ہوا۔

[1] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۴۸۸

بزم طلوع اسلام

۲۶ر مارچ کے طلوع اسلام میں وضاحت کی جاچکی ہے کہ بزم کا عہدیدار صرف ایک ہونا چاہیے جو "ترجمان" کہلائے وہی بزم کے اجلاس کا انتظام کرے اور "طلوع اسلام" سے خط و کتابت بھی کرے۔ یہ پوری طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ بزم طلوع اسلام کا مقصد قرآنی فکر کی اشاعت و ترویج ہے نہ کہ مراتب و مناصب کی تقسیم، غرض کام سے ہے نہ کہ نام سے۔ لہٰذا آپ کام ایک ہی صاحب کے سپرد کیجئے، اس مزید وضاحت کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اب بھی بعض بزمیں صدر اور سکریٹری وغیرہ کے نام سے مراسلت کرتی ہیں۔

گجرات سابقہ اشاعت میں یہ اعلان کیا جاچکا ہے کہ گجرات میں بزم کی تشکیل ہو گئی ہے۔ اس کے ترجمان بابو محمد حسین صاحب، شملہ اسٹور چوک شاہ دولہ ہیں۔ اب اطلاع موصول ہوئی ہے کہ بزم نے چوک شاہ دولہ میں لائبریری بھی قائم کر لی ہے اور ہفتہ وار اجتماع کا بھی انتظام کر لیا ہے یہ اجتماع ہر اتوار کو ساڑھے چار بجے بعد از دوپہر لائبریری میں منعقد ہوتا ہے۔

ملتان تعجب ہے کہ ملتان جیسی جگہ میں بزم متشکل نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال اس سلسلہ میں کوشش شروع ہو گئی ہے مقامی حضرات اختر علی صاحب، معرفت شاہ محمد اینڈ سنز آٹو موبائیل انجینئرز، بیرون پاک دروازہ سے رابطہ پیدا کریں۔

طلوع اسلام کا دفتر

۲۳/۱ فاؤلر لائن نیپئر بارکس میں واقع ہے

صدر کی طرف سے آنے والے حضرات نیپئر بارکس میں داخل ہو کر بجائے سیدھے جناح اسپتال کی طرف جانے کے بائیں ہاتھ ڈرگ روڈ کی طرف مڑ جائیں تو تھوڑے سے فاصلہ پر بائیں ہاتھ کو پی، ڈبلیو، ڈی کے انکوائری آفس کے عقب میں طلوع اسلام کا دفتر ہے۔

اسی دفتر میں ہر اتوار کو صبح ۹ بجے محترم پرویز صاحب قرآن پر لیکچر دیتے ہیں۔

کراچی میں طلوع اسلام کی سول ایجنسی

طاہر پبلشرز

بندر روڈ، بولٹن مارکیٹ کے پاس ہے، مقامی ایجنٹ مطلوبہ پرچے ان سے براہ راست حاصل کریں

سلیم کے نام

(صوفیائے کرامؒ)

تم نے عزیزم! وقت تو بہت لیا لیکن مجھے خوشی ہوئی کہ یہ بات تمہاری سمجھ میں آگئی کہ تصوف اپنی اصل کے اعتبار سے غیر قرآنی تصور ہے۔ اب رہا تمہارا یہ سوال کہ ہمارے صوفیائے کرام کی (بالخصوص وہ جن کا ہندوستان میں بہت چرچا ہے) علمی اور فکری سطح کیا تھی، اور قرآن پر ان کی نگاہ کہاں تک تھی؟ تو اس کے لئے پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے جو بزرگ دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں ان کے متعلق جب بھی گفتگو کی جائے گی، تو انہی کتابوں کی رُو سے کی جائے گی جنہیں ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ان کتابوں کی دو ہی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ یا وہ ان حضرات کی نہیں ہیں اور انہیں ان کی طرف غلط منسوب کیا جاتا ہے، تو اس صورت میں ان کے متعلق ہم بھی وہی کہیں گے جو حضرت موسیٰؑ نے فرمایا تھا کہ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتَابٍ (۲۰/۵۲) اور اگر یہ کتابیں فی الواقعہ انہی کی ہیں تو ان سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان حضرات کی علمی اور ذہنی سطح کیا تھی۔ تم نے بالخصوص حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ، خواجہ قطب عالمؒ، بابا فرید گنج شکرؒ اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے متعلق دریافت کیا ہے۔ ان حضرات کی مستقل تصانیف کوئی نہیں البتہ ان کے ملفوظات کے مجموعے ہیں۔ ان ملفوظات کی صورت یوں ہے کہ ایک پیر کے ملفوظات ان کے خلیفہ قلمبند کرتے ہیں۔ وہ ان کی مجلس میں جاتے ہیں، اور ان کے ارشادات کو محفوظ کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ ایک مجموعہ مرتب ہو جاتا ہے۔ مثلاً خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے پیر و مرشد تھے خواجہ عثمان ہارونیؒ۔ انہوں نے خواجہ ہارونیؒ کے ملفوظات قلمبند فرمائے ہیں۔ اس مجموعہ کا نام ہے انیس الارواح۔ خواجہ اجمیریؒ کے ملفوظات کو ان کے خلیفہ خواجہ قطب الدین اوشی کاکیؒ (خواجہ قطب عالمؒ) نے جمع کیا ہے۔ اس کا نام ہے دلیل العارفین۔ خواجہ قطب عالمؒ کے ملفوظات کو بابا فرید گنج شکرؒ نے مرتب فرمایا تھا۔ اس مجموعہ کا نام ہے فوائد السالکین۔ حضرت بابا فریدؒ کے ملفوظات کو خواجہ نظام الدین اولیاؒ[1] نے جمع کیا تھا۔ اس کا نام ہے راحت القلوب۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات کو امیر خسرو نے مرتب کیا تھا۔ مجموعہ کا نام ہے راحت المحبین۔ تم نے دیکھا کہ اس طرح ان ملفوظات کے ہر مجموعہ کو دہری سند حاصل ہو جاتی ہے۔ ایک تو ان کی جن کے یہ فرمودات ہیں، اور ایک ان کی جنہوں نے ان ارشادات کو جمع اور مدوّن فرمایا۔ مثلاً انیس الارواح میں خواجہ عثمان ہارونیؒ کے فرمودات ہیں، اس اعتبار سے انہیں ان کی سند حاصل ہے، اور ان فرمودات کو جمع کیا خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے۔ اس اعتبار سے اس مجموعہ کو ان کی سند حاصل ہے۔ یہ مجموعے طبع شدہ ہیں، اس لئے انہیں از خود دیکھا جا سکتا ہے، اور چشتیہ خاندان کے متوسلین تو ان مجموعوں کو ورد وظائف کی طرح یاد کرتے اور دہراتے رہتے ہیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ تم خود ان مجموعوں کو دیکھتے، تاکہ تمہیں ان کے علمی پایہ کا براہ راست اندازہ ہو جاتا۔ لیکن تمہاری تو حالت یہ ہو چکی ہے کہ لا دو، لا دو، لا دینے والا ساتھ دے، تم انہیں از خود کہاں پڑھو گے! اس لئے یہ ڈیوٹی بھی مجھے ہی سرانجام دینی پڑے گی لیکن میں ان مجموعوں کو بہ تمام و کمال تو خط میں منتقل کر نہیں سکتا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ان کے بعض اقتباسات نقل کر دوں۔ ان سے باقی مجموعہ کے متعلق خود اندازہ لگا سکو گے۔ یہ مجموعے فارسی میں ہیں لیکن چونکہ تمہیں فارسی پر آشنا عبور نہیں، اس لئے ان کا اردو ترجمہ ہی لکھنا پڑیگا۔ یہ ترجمہ مسلم پریس دہلی کا چھپا ہوا ہے۔ اقتباسات لفظاً بلفظ نقل کرائے جائیں گے۔ تاکہ ان کی صحت میں کوئی شبہ نہ رہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں ایسے معاملات میں کتنی احتیاط برتا کرتا ہوں۔ اچھا تو سنو۔

انیس الارواح | پہلا مجموعہ ہے انیس الارواح یعنی خواجہ عثمان ہارونیؒ کے ارشادات کا مجموعہ جسے خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے مرتب فرمایا۔ خواجہ صاحب اپنے پیر و مرشد کے متعلق فرماتے ہیں کہ

"میرے ہمسایہ میں میرا ایک پیر بھائی تھا جب اس کا انتقال ہوا۔ لوگ تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر دفن کر کے واپس چلے گئے۔ میں اس کی قبر پر بیٹھا رہا۔ عالم مشغولی میں کیا دیکھتا ہوں کہ دو فرشتے عذاب کے اس کے پاس آئے اور چاہتے تھے کہ عذاب کریں۔ اتنے میں حضرت پیر و مرشد تشریف لائے، اور ان دونوں فرشتوں کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا کہ اسے عذاب مت کرو۔ یہ میرا مرید ہے۔ وہ حسب الارشاد واپس چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں واپس آئے اور عرض کی باری تعالیٰ کا فرمان یہ ہے کہ اگرچہ یہ شخص آپ کا مرید تھا لیکن آپکے طریقہ سے

---

[1] یہ تسلسل خط مطبوعہ طلوع اسلام بابت دسمبر ۱۹۵۲ء۔ [2] اولیاؒ ولی کی جمع ہے۔ لیکن چونکہ ان کا یہی نام مشہور ہے اس لئے میں نے بھی اسی طرح لکھ دیا ہے۔

برگشتہ تھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ حال ایسا ہی ہے مگر اس نے اپنی ذات کو میرے پلے میں باندھا تھا۔ اس کی حمایت میرے ذمہ ضروری ہے۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ان فرشتوں کو حکم ہوا کہ واپس چلے آؤ۔ اس شخص کو عذاب نہ کرو۔ ہم نے اسے حضرت کی خاطر عزیز ہونے کے سبب سے بخشدیا ہے۔"

اس کے بعد خواجہ صاحب نے اپنے پیر و مرشد کی معیت میں ایک سفر کا حال لکھا ہے۔ جس میں (بدخشاں میں) ایک بزرگ کو دیکھا جن کی عمر ایک سو چالیس برس کی تھی۔ ان کا ایک پاؤں جڑ سے کٹا ہوا تھا۔ اس کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ

"میں ایک مدت سے اس صومعہ میں معتکف ہوں۔ اس سے کبھی ایک قدم بھی خواہش نفس سے باہر نہیں نکالا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ہوائے نفسانی سے یہ بریدہ پاؤں باہر نکلا اور دوسرا نکال کر ارادہ روانگی کا تھا کہ ہاتف نے آواز دی: "اے مدعی! ہمیں عہد بار کہ فراموش کردی"۔ یہ آواز سنکر متنبہ ہوا اور اپنی عہد خلافی سے پشیمان۔ چھری میرے پاس موجود تھی۔ فی الفور میان سے نکالی اور اس پاؤں کو جو باہر نکالا تھا کاٹ کر پھینک دیا۔"

اب مجالس کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ ایک دن گفتگو دربارہ چاند و سورج گرہن ہوئی، آپنے فرمایا:

"حضرت ابن عباسؓ نے رسول اللہ سے روایت کی ہے کہ جب آدمیوں سے گناہ زیادہ سرزد ہوتے ہیں فرشتوں کو اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ چاند اور سورج کو پکڑو اور اس کے کسی جزو کل کو کسی قدر عرصہ کے لئے بے نور کر دو کہ اس سے خلق کو عبرت ہو۔"

ایک مجلس میں فرمایا کہ

"اگر خاوند کے جسم سے پیپ اور خون رواں ہو اور عورت اسے صاف کرنے کے لئے اپنے منہ سے چاٹے، تو بھی خاوند کا حق کما حقہٗ ادا نہ ہوگا۔"

ایک مجلس میں فرمایا کہ

"حضرت عیسٰیؑ کا دسترخوان سرخ رنگ کا تھا۔ وہ آسمان سے نازل ہوا تھا۔ جو شخص سرخ دسترخوان پر روٹی کھاتا ہے بروز حشر حضرت جبریلؑ اس کے لئے براق معہ حلہ بہشتی لائیں گے۔"

ایک مجلس میں اہل جنت کے متعلق گفتگو ہوئی تو فرمایا کہ

"رسول اللہ سے پوچھا گیا کہ آپ ہمیں اہل جنت کے خورد و نوش سے خبر دیجئے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے مجھکو اس ذوالجلال و الاکرام کی جس نے مجھے پیغمبری دی ہے کہ مرد بہشت میں سو مرتبہ کھانا کھائے گا اور سو ہی مرتبہ اپنی عیال سے محبت کریگا۔ کسی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ جب اس قدر کھانا پینا ہوگا تو انہیں قضائے حاجت بھی ہوگی یا نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، وقت قضائے حاجت جسم سے ایک ریح خارج ہوگی جس کی خوشبو مشک کی مانند کی جائے گی۔"

دلیل العارفین | اب اس مجموعہ کو لو جو خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے ملفوظات پر مشتمل ہے جنہیں خواجہ قطب عالمؒ نے مرتب فرمایا تھا۔ میں یہ کہنا بھول گیا کہ خواجہ عثمان ہارونیؒ قصبہ ہارون کے رہنے والے تھے، جو نیشاپور کے قریب واقعہ ہے۔ اور خواجہ اجمیریؒ قصبہ سنجر میں پیدا ہوئے تھے جو سیستان میں واقعہ ہے۔ آپ کی وفات ۶۳۳ھ میں اجمیر میں ہوئی تھی۔ آپ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ

"فقہ اکبر میں بروایت امام اعظم ابو حنیفہؒ لکھا ہے کہ ایک کفن چور جس نے چالیس سال تک کفن چرائے تھے، قضائے الٰہی سے مر گیا۔ اس کے مرنے کے بعد لوگوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ بہشت بریں میں خراماں ہے۔ پوچھا یہ درجہ اس نے کہاں سے حاصل کیا۔ جواب دیا کہ نماز پڑھنے اور صبح کی نماز سے اشراق تک مصلے پر قرار پکڑنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے میرے سارے گناہ بخشدیئے۔"

ایک مجلس میں فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ[1] کی تفسیر فرمایا کہ ویل ایک کنواں یا میدان دوزخ میں ہے۔ اس سے زیادہ کسی دوزخ میں عذاب نہیں۔

ایک مجلس میں عذاب قبر کے متعلق گفتگو کے دوران میں فرمایا کہ

"ایک بزرگ بصرہ کے ایک قبرستان میں بیٹھے تھے۔ ہمارے متصل ایک مردے کو عذاب قبر ہو رہا تھا اس بزرگ نے جب یہ حال دیکھا تو زور سے نعرہ مار کر زمین پر گر پڑے۔ ہم نے اٹھانا چاہا تو معلوم ہوا کہ جان قالب سے پرواز کر گئی ہے۔ پھر تھوڑی سی دیر میں بدن انکا پانی ہو کر ناپید ہو گیا۔ اسی طرح فرمایا کہ درویش قوالی سنتے سنتے زمین پر گر پڑے۔ خرقہ ان کا زمین پر پڑا رہا اور جسم اس کے اندر سے غائب ہو گیا۔"

ایک مجلس میں خواجہ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ

"بروز قیامت انبیاء اولیا سب قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ ان کے کندھوں پر کمبل

---

[1] تباہی (ویل) ہے ان نمازیوں کے لئے جن کی نمازیں تیر بے ہدف کی طرح بے نتیجہ رہ جائیں۔

پڑے ہوں گے۔ ہر ایک کمبل میں کم و بیش ایک لاکھ ٹانکے کے دھاگے اور ایک لاکھ بالشتکے ہوں گے۔ ان کے مرید اور بچے ان کے ان ٹانکوں کو پکڑیں گے اور اس وقت تک پکڑے رہیں گے جب تک خلق ہنگامۂ محشر سے فارغ نہ ہوں۔ پھر حق تعالیٰ انھیں پل صراط پر پہنچا دیگا اور وہ مع اپنے مریدوں کے اس تیس ہزار برس کے راستے کو ایک دم زدن میں برکت پکڑے رہنے اس گلیم کے طے کریں گے۔ اور دروازہ بہشت پر پہنچکر دارالنعیم میں داخل ہونگے۔

ایک اور مجلس میں فرمایا کہ

"جب رسول اللہ کا وصال ہوا تو آپ نے اصحاب کہف کا غار دیکھا۔ انھیں سلام کیا۔ حق تعالیٰ نے سب کو زندہ کیا اور جواب سلام دلوایا۔ آپ نے مذہب اسلام کی دعوت دی اور انھوں نے اسے بصدق دل منظور کیا"۔

ایک مجلس میں فرشتوں کے متعلق ارشاد فرمایا کہ

"اللہ نے ایک فرشتہ باسیل نام پیدا کیا ہے۔ اس کا ایک ہاتھ مشرق میں ہے اور دوسرا مغرب میں۔ تسبیح اس فرشتہ کی ہے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ وہ روز و شب پر موکل ہے۔ اس کے سامنے ایک تختی پر بہت سے خطوط سیاہ و سفید ہیں۔ وہ ان خطوط کی درازی اور کوتاہی سے رات دن چھوٹا بڑا کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو رات، دن گھٹتے بڑھتے جاتے ہیں۔ یہ فرما کر آپ زار و قطار رونے لگے۔ اور عالم بیہوشی آپ پر طاری ہوا۔ پھر فرمایا کہ حق تعالیٰ نے کوہ قاف کو پیدا کیا ہے۔ اور تمام عالم اس کے احاطہ کے اندر آباد ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں بھی اس کا ذکر ہے۔ فرمایا: قٓ۔ والقرآن المجید ...... پھر فرمایا کہ وہ پہاڑ زمین سے چالیس گنا زیادہ وسیع ہے۔ ایک گائے اپنے سر پر رکھے ہے۔ دماغی اس گائے کی تیس ہزار سال کی راہ ہے۔ سر اس کا مشرق میں اور دُم مغرب میں ہے۔ پھر فرمایا کہ خواجہ مودود چشتیؒ نے جس مجلس میں یہ بات بیان کی تھی اس میں ایک درویش حاضر تھے۔ انھیں اس سے اپنے دل میں کچھ شک گزرا۔ حضرت خواجہ سر بمراقبہ ہوئے۔ اور وہ اور وہ درویش اپنے اپنے خرقوں سے گم ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں واپس آئے تو اس درویش نے قسم کھا کر کہا کہ مجھے حضرت خواجہ نے کوہ قاف دکھا دیا ہے۔ اب مجھکو کوئی شبہ نہیں رہا"۔

ایک مجلس میں فرمایا کہ

"جس روز اللہ تعالیٰ نے دوزخ کو پیدا کیا ہے، اس روز ایک سانپ بھی پیدا کیا اور اس سانپ سے ارشاد فرمایا کہ اے سانپ! ہم تجھے امانت سپرد کرتے ہیں، منظور ہے یا نہیں۔ سانپ نے جواب دیا۔ مجھے بسر و چشم منظور ہے۔ حکم ہوا منہ کھول دے۔ اس نے منہ کھولا۔ فرشتوں کو حکم ہوا کہ دوزخ کو لا کر اس سانپ کے منہ میں رکھدو۔ فرشتوں نے دوزخ لا کر اس سانپ کے منہ میں رکھدی اور منہ باندھ دیا۔ اب دوزخ اس سانپ کے منہ میں ہے ساتویں زمین کے نیچے۔ اگر دوزخ سانپ کے منہ میں زیر زمین نہ ہوتی تو تمام عالم جل جاتا"۔

ایک مجلس میں الحمد شریف کے فضائل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ

"میں اور خواجہ عثمان ہارونی سفر میں تھے۔ دجلہ کے کنارے پہنچے۔ دریا طغیانی پر تھا۔ میں فکر میں ہوا کہ کس طرح پار اتریں اور جلد عبور کرنے کی ضرورت تھی۔ حضرت خواجہ نے فرمایا کہ آنکھیں بند کرو۔ میں نے آنکھیں بند کیں۔ تھوڑی دیر میں کھولیں۔ خود اور حضرت خواجہ کو دجلہ کے اس پار پایا۔ میں نے دریافت کیا کہ کس طور عبور فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ الحمد شریف کو پانچ مرتبہ پڑھکر قدم پانی میں رکھا اور پار اتر گئے"۔

ایک مجلس میں فرمایا کہ

"جب حضرت آدم سے لغزش ہوئی تو تمام چیزیں حضرت کو دیکھکر رونے لگیں لیکن چاندی اور سونا نے آنسو نہ نکالے اور خدا سے عرض کی کہ ہم اس کے حال پر نہ روئیں گے جو تیرا گناہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ عرض سنکر قسم کھائی اور کہا کہ میں تمھاری قیمت مقرر کر دوں گا اور بنی آدم کو تمہارا خادم بنا دوں گا"۔

اس کے بعد فرمایا کہ جنگل میں ایک درویش رحلت کردہ کی لاش کو دیکھا کہ ہنس رہی تھی۔ پوچھا تم تو مر چکے ہو اب کیونکر ہنستے ہو۔ جواب دیا کہ محبت حق تعالیٰ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

سلیم میاں! باتیں تو بہت سی لکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن خط میں اتنی گنجائش کہاں ہے۔ ہر لئے مختصر اقتباسات پر ہی کفایت کر رہا ہوں۔

فوائد السالکین اب تم فوائد السالکین کو دیکھو جو خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کاکیؒ کے ملفوظات پر مشتمل ہے جنھیں ان کے خلیفہ خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ نے مرتب فرمایا تھا۔ خواجہ صاحب قصبہ اوش کے رہنے والے تھے جو ماوراء الہند کا ایک قصبہ ہے۔ آپ کے متعلق لکھا ہے کہ آپ کی والدہ پندرہ پارہ کی حافظ تھیں، اور ایام حمل میں قرآن شریف کی تلاوت میں مصروف رہتی تھیں۔ اس لئے آپ پیدائش ہی سے پندرہ پارہ کے حافظ تھے۔

آپ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ

"بدخشاں میں ایک بزرگ تھے۔ انھوں نے حاکم وقت کو حکم دیا کہ ایک خانقاہ تیار کرو۔ اس نے خانقاہ تیار کرائی تو آپ نے حکم دیا کہ ہر روز بازار سے ایک کتا خرید کر لائیں۔ حسب الحکم روز کتے خرید کر لاتے۔ آپ ان کا ہاتھ پکڑ کر سجادہ پر بٹھاتے اور فرماتے خدا کے سپرد کیا۔ آخرالامر وہ کتے ایسے ہو گئے کہ ہر ایک ان میں کا پانی پر چلتا تھا اور جس کسی کو وہ نقش دیدیتا، اچھا ہو جاتا"۔

ایک مجلس میں فرمایا کہ

"میں اور قاضی حمید الدین ایک سفر میں تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا بچھو ہے، جو دریا کی جانب روانہ ہو رہا ہے۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو لئے۔ دریا پر پہنچے تو دریا زور شور سے رواں تھا اور کوئی کشتی وغیرہ موجود نہ تھی۔ ہم نے اللہ سے دعا کی کہ اگر ہم نے اپنا کام کمال کو پہنچا لیا ہو تو دریا ہمیں راہ دیدے۔ ناگاہ دریا شق ہو گیا اور درمیان دریا راہ ہو گئی۔ ہم اس راہ میں روان ہو کر پار اتر گئے وہ بچھو ہمارے آگے آگے تھا۔ بچھو ایک درخت کے تلے پہنچا جس کے سائے میں ایک مرد سو رہا تھا، اور ایک اژدھا اس شخص کو کاٹنے کے لئے آ رہا تھا۔ بچھو نے سانپ کے ڈنک مارا، سانپ مر گیا۔ اور بچھو غائب ہو گیا۔ وزن اس سانپ کا ہزار من کا ہوگا۔ ہم اس شخص کے قریب گئے تو معلوم ہوا کہ وہ شرابی ہے۔ شراب پی کر قے کی ہے اور بدمست پڑا ہے۔ ہم متعجب ہوئے کہ ایسے نافرمان شخص پر اللہ نے ایسی آرائش فرمائی ہے۔ جونہی یہ اندیشہ ہمارے دل میں گذرا، ہاتف غیبی نے آواز دی کہ اگر ہم پارساؤں پر اپنی توجہ مبذول رکھیں تو غریبوں کا حامی کون ہوگا"۔

ایک مجلس میں فرمایا کہ خواجہ عثمان ہارونیؒ کے ایک مرید نے آپ سے کہا کہ میرے ہمسایہ نے میرے مکان سے متصل ایک چوبارہ بنوایا ہے جس سے میرا مکان بے پردہ ہو گیا ہے۔ آپ نے دریافت کیا کہ وہ شخص یہ جانتا ہے یا نہیں کہ تم میرے مرید ہو۔ اس نے کہا کہ وہ اس سے واقف ہے۔

آپ نے یکایک زبان مبارک سے فرمایا کہ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ کوٹھے پر سے گر نہیں پڑتا۔ اور اس کا مہرۂ گردن ٹوٹ نہیں پڑتا۔ اس اثنا میں وہ مرید اپنے گھر کو گیا۔ راستے میں سنا کہ وہ شخص کوٹھے سے گر پڑا ہے اور اس کی گردن کا مہرہ ٹوٹ گیا ہے۔

پھر فرمایا کہ بغداد شریف میں ایک شخص کو جرم قتل کی سزا میں قتل کرنے لگے اور قاعدے کے موافق اس کا منہ قبلہ رخ کرنے لگے تو اس نے اپنا منہ قبلہ سے پھیر کر اپنے پیر کے مزار کی طرف کر لیا۔ جلاد نے کہا، کہ مرتے وقت اپنا رخ قبلہ کی طرف کرنا چاہیے۔ اس شخص نے کہا کہ تو اپنا کام کر۔ میں نے اپنا منہ اپنے قبلہ کی طرف کر لیا ہے۔ وہ دونوں اسی حیص بیص میں تھے کہ خلیفہ کا قاصد آیا اور اس نے کہا کہ اس شخص کا جرم خلیفہ نے معاف کر دیا ہے۔ اس پر خواجہ قطب عالمؒ نے فرمایا کہ دیکھو۔ اس شخص کی خوش عقیدگی نے اسے قتل سے صاف بچا لیا۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ

"حضرت خواجہ مودود چشتیؒ کو جب اشتیاق خانہ کعبہ کا غالب ہوتا تو فرشتے سرزمین چشت میں لے آتے کہ خواجہ صاحب زیارت سے مشرف ہوں"۔

راحت القلوب اب سلیم! اس مجموعہ کی طرف آؤ جو ان سب میں بڑا ہے۔ یعنی راحت القلوب۔ اس میں خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کے وہ ملفوظات ہیں جنھیں خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے مرتب فرمایا تھا۔ خواجہ گنج شکرؒ اجودہن کے رہنے والے تھے۔ محرم ۶۶۴ھ میں وفات پائی۔ آپ کا مزار پاکپتن (ضلع منٹگمری) میں ہے۔ آپ کے لقب (گنج شکر) کی وجہ تسمیہ میں بہت سے اقوال ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ ایک دفعہ آپ کہیں جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک بنجارہ گزرا جس کے بوروں میں شکر لدی ہوئی تھی۔ آپ نے پوچھا کہ بوروں میں کیا ہے۔ اس نے ازراہ ظرافت کہا کہ نمک ہے۔ گھر جا کر بورے الٹے تو ان سب میں نمک ہی نمک تھا۔ وہ روتا ہوا حاضر خدمت ہوا تو آپ نے فرمایا کہ بہت اچھا وہ شکر تھی تو شکر ہو جائے گی۔ چنانچہ وہ شکر بن گئی۔

ایک مجلس میں گفتگو دربارۂ خرقۂ درویش ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ

"جب رسول اللہ معراج سے واپس آئے تو آپ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ مجھے فرمان الٰہی ہوا ہے کہ خرقۂ درویش اس شخص کو دوں جو میرے سوال کا جواب شافی دے۔ اس کے بعد آپ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ سے یہ سوال کیا کہ اگر یہ خرقہ تمہیں دے دیا جائے تو تم کیا کرو گے۔

حضرت صدیقؓ نے کہا کہ میں سب کچھ خدا کی راہ میں نثار کردوں گا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں عدل و انصاف کروں گا۔ مظلوموں کی داد کو پہنچوں گا۔ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ میں حیا اور سخاوت اختیار کروں گا لیکن ان میں سے کسی کا جواب اطمینان بخش نہ تھا۔ اس کے بعد آپ نے حضرت علیؓ سے سوال کیا کہ اگر یہ خرقہ تمھیں دیدیا جائے تو تم کیا کروگے۔ آپ نے جواب دیا کہ اگر مجھے خرقہ عطا کردیا جائے، تو میں بندگانِ خدا کی پردہ پوشی کروں گا۔ چنانچہ آپ نے وہ خرقہ حضرت علیؓ کو دیدیا۔"

ایک دفعہ فرمایا کہ

"خواجہ ابوسعید ابوالخیر ایک دفعہ ذکرِ خدا میں مشغول تھے کہ ہر بال کی جڑ سے خون رواں ہونے لگا اہلِ خانہ نے ایک کاسہ چوبیں نشست کے نیچے رکھ دیا کہ جو خون بہے وہ کاسہ میں جمع ہوجائے۔ آپ کے جسمِ مبارک سے اس قدر خون رواں تھا کہ تھوڑے ہی عرصے میں وہ کاسہ بھر گیا، اور اہلِ خانہ نے وہ خون پی لیا۔"

ایک مجلس میں فرمایا کہ

"نواحِ غزنی میں میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ نہایت ضعیف اور لاغر تھے۔ ان کی عادت تھی کہ ہر شب ایک سو بیس رکعات نماز نفل ادا فرماتے تھے۔ لیکن عارضۂ شکم کی وجہ سے ہر دو رکعت کے بعد انھیں قضائے حاجت کی ضرورت ہوتی تھی۔ آپ قضائے حاجت کے واسطے تشریف لے جاتے۔ واپس آکر غسل فرماتے اور دوگانہ ادا کرتے۔ پھر قضائے حاجت ہوتی اور غسل کرکے دوگانہ ادا کرتے۔ مختصر آیہ کہ اس شب وہ ساٹھ مرتبہ نہائے اور اپنا وظیفہ ادا کیا۔ آخر بار جب نہانے تشریف لے گئے تو میان آب ہی انتقال فرمایا۔ سبحان اللہ! کیا مضبوط اور راسخ العقیدہ تھے۔"

ایک دفعہ فرمایا کہ

"جب مغلوں نے یمن کا محاصرہ کیا تو والیٔ یمن حضرت خواجہ ابواللیث کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کے ہاتھ میں ایک پتلی سی چھڑی تھی۔ آپ نے وہ خلیفہ کو عطا فرمائی، اور ارشاد فرمایا کہ غروبِ آفتاب کے وقت مغلوں پر شبخون مارنا۔ اس نے ایسا ہی کیا اور جونہی وہ لکڑی لشکرِ مغل پر پھینکی تھی ہزیمت واقع ہوئی اور وہ گرتے پڑتے بھاگ گئے۔"

اسی طرح ایک مرتبہ ارشاد ہوا کہ ایک سیاح نے مجھ سے یہ حکایت بیان کی تھی کہ میں نے شہرِ دمشق کو اجاڑ پایا اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں کے بعض باشندوں نے وظیفہ ترک کردیا تھا ناگاہ مغلوں کا لشکر ان کے شہر میں آیا اور شہر کو ویران کردیا۔

چونکہ سلیم! یہ ایک تاریخی بات ہے کہ جو درمیان میں آگئی ہے، اس لئے تمھاری اطلاع کے لئے اتنا بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یمن پر مغلوں کا حملہ بالکل خلافِ واقعہ ہے۔ باقی رہا مغلوں کا دمشق پر حملہ۔ سو دمشق پر پہلی بار تیمور کے مغلوں نے حملہ کیا تھا، جو خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے قریباً سو سال بعد کا واقعہ ہے۔

ایک مجلس میں فرمایا

"ایک نوجوان واصلانِ حق میں سے تھا۔ جب عمر اس کی تمام ہوئی۔ ملک الموت نے اس کو شرق سے غرب تک ڈھونڈا لیکن نہیں پتہ پایا (مجبوراً اپنے مقام پر آکر سجدہ میں سر رکھا اور خدا سے درخواست کی کہ وہ اس نوجوان کا پتہ بتا دیں) حکمِ خدا ہوا کہ اس نوجوان کو فلاں خرابہ میں تلاش کرو لیکن ملک الموت کو اس کا وہاں بھی کچھ پتہ نہ چلا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اے ملک الموت! تم ہمارے دوستوں کی روح قبض نہیں کرسکتے اور نہ ان کو دیکھ سکتے ہو۔ وہ لوگ میرے پاس ہیں۔"

ایک مرتبہ فرمایا کہ

"شیخ جلال الدین رومی کبھی روم میں نماز نہیں پڑھتے تھے۔ جب نماز کا وقت آتا آپ غائب ہوجاتے۔ آخر معلوم ہوا کہ آپ شرعاً و تعظیماً خانہ کعبہ میں نماز پڑھتے ہیں۔" ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک جوگی حضرت (بابا فرید) کی خدمت میں آیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ کوئی کرامت دکھاؤ۔ یہ سنکر وہ ہوا میں اڑنے لگا۔ آپ نے اپنی جوتیاں ہوا میں چھوڑ دیں۔ وہ اس جوگی کے سر سے اونچی چلی گئیں اور اس پر لگنے لگیں۔ چنانچہ جوگی معترف ہوا کہ جس شخص کی جوتیوں کا یہ مرتبہ ہوگا وہ کس مرتبے کا ہوگا۔"

ایک مرتبہ آپ نے اپنی ریاضت کے متعلق بتایا کہ

"میں تیس سال عالمِ تفکر میں کھڑا رہا۔ بالکل نہیں بیٹھا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس تیس سال میں میں نے کچھ کھایا ہو۔"

ایک مجلس میں حضرت عمرؓ کے مناقب بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ

"ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک دہی بیچنے والا راستے میں کھڑا رو رہا ہے۔ اس نے کہا کہ میرا دہی زمین پر گر گیا تھا۔ زمین اسے پی گئی ہے۔ کیا آپ اسے روا رکھ سکتے ہیں۔ یہ سنکر آپ نے درہ اٹھا کر نعرہ مارا کہ زمین! تو دہی واپس دیتی ہے یا نہیں۔ یہ سنتے ہی زمین پھٹ گئی اور دہی اوپر نکل آیا۔ اس دہی والے نے اپنا سبوچہ دہی سے بھر لیا اور چل دیا۔"

اسی طرح فرمایا کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ اپنا خرقہ سی رہے تھے اور پشت آپ کی جانبِ آفتاب تھی پشت مبارک آپ کی تمازتِ آفتاب سے گرم ہوگئی تو آپ نے نگاہِ غضب سے آفتاب کی طرف دیکھا معاً فرشتوں کو حکم ہوا کہ نورِ آفتاب کا محو کریں کہ حضرت عمرؓ کے ساتھ گستاخی سے پیش آیا ہے۔ فرشتوں نے فی الفور تعمیل کی اور نورِ آفتاب سے لے لیا۔ جملہ جہان تاریک ہوگیا۔ رسول اللہؐ اس زمانہ میں حیات تھے۔ از حد غمناک ہوئے۔ فرمانے لگے کہ شاید قیامت قائم ہوگئی، جو نورِ آفتاب سے لے لیا گیا۔ یہی گفتگو ہو رہی تھی کہ حضرت جبریل نازل ہوئے اور بیان کیا کہ یارسول اللہؐ! قیامت قائم نہیں ہوئی (بلکہ آفتاب کا نور حضرت عمرؓ کی گستاخی کی وجہ سے چھین لیا گیا ہے۔ رسول اللہؐ نے حضرت عمرؓ کو طلب فرمایا اور شفاعت کی۔ حضرت عمرؓ نے سورج کو معاف کردیا۔ فی الفور جہان روشن ہوگیا۔

ایک مجلس میں فرمایا کہ

"عہدِ رسول اللہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص کے ہاں دو بچے توام پیدا ہوئے۔ یہ خبر آنحضرتؐ کو پہنچائی گئی اور عرض کیا گیا کہ ان کے جدا کرنے کی ترکیب فرمائیے۔ آپ متفکر تھے کہ حضرت جبریل تشریف لائے اور کہا کہ یارسول اللہ! ان کے سروں میں ایک ہی کنگھا کرنا چاہیئے، علیحدہ ہوجائیں گے۔ ایسا ہی کیا گیا اور وہ الگ الگ ہوگئے۔"

ایک مرتبہ فرمایا کہ سورۂ ملک کا نام توریت میں ماثورہ ہے، اور ماثورہ کا ترجمہ (فارسی میں) عذابِ گور سے باز رکھنے والا ہے۔

ایک مجلس میں فرمایا کہ جب خواجہ عبداللہ سہیل تستریؒ کا انتقال ہوا ہے تو شہر میں یہودیوں کی ایک جماعت سخت منکر تھی۔ ان میں سے ایک یہودی نے جنازہ سے قریب آکر کہا کہ اگر آپ مجھے اس وقت تلقین کریں تو میں مسلمان ہوتا ہوں اور میرے ساتھ ہزار آدمی اور مسلمان ہوں گے۔ وہ یہ بات پوری نہ کرچکا تھا کہ آپ نے کفن سے ہاتھ باہر نکالا اور دونوں آنکھیں کھول کر کہا: اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ چنانچہ اس پر وہ سب مسلمان ہوگئے۔

اسی طرح جب خواجہ قطب الدین مودود چشتیؒ کا انتقال ہوا ہے اور لوگوں نے چاہا کہ جنازہ اٹھائیں تو جنازہ خود بخود ہوا میں معلق ہوکر چلنے لگا۔ دفن کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ جنازہ کو فرشتے اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ بیان کرکے آپ نعرہ مار کر بیہوش ہوگئے اور دیر تک بے ہوش رہے۔

ایک مجلس میں فرمایا کہ

"ایک روز حضرت رسول اللہؐ مع اصحاب ایک جا تمکن تھے۔ معاویہؓ، یزید کو اپنے کندھے پر سوار کئے ہوئے گزرے۔ رسول اللہؐ نے تبسم کیا کہ سبحان اللہ! دوزخی بہشتی کے کندھے پر سوار ہے۔ یہ ارشاد والا حضرت علیؓ نے سنا۔ دریافت کیا: رسول اللہؐ! فرمائیے کہ پسرِ معاویہ کیونکر دوزخی ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ اے علیؓ! یزید بدبخت وہ ہے جو میرے حسنؓ و حسینؓ اور ان کی تمام اولاد کو شہید کرائے گا امیر المومنین حضرت علیؓ اٹھے اور تلوار میان سے کھینچی اور چاہا کہ یزید پلید کو مار ڈالیں۔ آنحضرتؐ مانع ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ حکم باری تعالیٰ کا ایسا ہی ہے۔ مخالفت تقدیر کی نہ کرنی چاہیئے۔"

سلیم! تمھاری اطلاع کے لئے اتنا بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یزید کی پیدائش ۲۶ھ میں ہوئی تھی یعنی رسول اللہؐ کی وفات کے بھی سولہ برس بعد۔

اب چند ایک مثالیں "راحت المحبین" سے بھی سن لو۔ یہ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات

راحت المحبین | ہیں جنھیں امیر خسروؒ نے مرتب کیا تھا۔ خواجہ صاحب بدایوں کے رہنے والے تھے ۷۲۵ھ میں دہلی میں وفات پائی۔ وہیں آپ کا مزار ہے۔ جہاں تم بلیسیوں مرتبہ گئے ہو۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام بہشت سے کوہ سراندیپ میں (جو اب لنکا یا جزیرہ سیلون کے نام سے مشہور ہے) اترے۔ تین (سو) برس تک اپنی لغزش کی بنا پر روتے رہے۔ چنانچہ گوشت پوست ان کے رخساروں کا بہہ گیا تھا۔ اور چڑیوں نے ان کے رخساروں میں گھونسلے بنا لئے تھے۔ اور ان کو اس کی خبر تک نہ تھی۔ آپ کے آنسوؤں سے زمین اس قدر تر ہوگئی کہ اس پر گھاس اگ آئی اور اتنی بلند ہوگئی کہ آپ کا وجودِ مبارک اس میں پوشیدہ ہوگیا۔

ایک دفعہ فرمایا کہ جب روز حضرت یوسف ؑ کو ان کے بھائیوں نے کنوئیں میں ڈالا ہے۔ اور ایک

بھیڑیئے کو پکڑ کر حضرت یعقوبؑ کی خدمت میں لے گئے کہ اس نے یوسف کو ہلاک کیا ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے اس بھیڑیئے سے پوچھا کہ تو نے یوسف کو ہلاک کیا ہے۔ اس نے کہا کہ نہیں (یعنی نہیں) آپ نے دوبارہ اس سے دریافت کیا کہ تو جانتا ہے کہ یوسف کہاں ہے۔ اس نے جواب دیا "حضرت مجھے معلوم نہیں۔ اگرچہ میں جانور ہوں لیکن عیب جوئی اور عیب گوئی نہیں کرتا۔"

پھر فرمایا کہ حضرت ایوبؑ نے خدا سے دعا کی کہ مجھے بارہ ہزار زبانیں دے تاکہ ہر زبان سے تیرا ذکر کروں۔ اللہ نے ان کی دعا قبول کی اور انھیں کیڑوں میں مبتلا کر دیا۔ چنانچہ ان کے جسم میں بارہ ہزار کیڑے تھے۔ حضرت نوح کے متعلق فرمایا کہ وہ ہر رات میں ایک ہزار رکعت نماز نفل ادا کیا کرتے تھے۔ اور قریب صبح سر سجدہ میں رکھ کر عاجزی کیا کرتے تھے۔ اس وقت آپ کے ہر بن مو سے خون جاری ہو جاتا اور ہر قطرہ سے جو زمین پر گرتا نقشِ تسبیح پیدا ہو جاتا۔ آپ کی کشتی کے متعلق فرمایا کہ اس کے لئے جبریلؑ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار تختے مہیا کئے، اور اسی طرح ایک لاکھ چوبیس ہزار کیلیں آسمان سے نازل کیں۔ ہر تختہ پر ایک ایک رسول کا نام لکھا تھا۔ حضرت محمدؐ کے نام کے بعد چار تختے خالی رہ گئے۔ آپ نے کہا کہ اب ان پر کس کا نام لکھا جائیگا۔ وحی ہوئی کہ رسول اللہ کے چار یار ہوں گے۔ ان کے اسماء کے بغیر کشتی تیار نہیں ہو سکے گی۔ پھر فرمایا کہ آپ نے حضرت آدم کی نعش (جو صفا اور مروہ کے درمیان تھی) نکال کر اس کشتی میں رکھی۔ آپ کی کشتی میں ابلیس بھی سوار ہو گیا آپ نے اسے نکالنا چاہا تو ارشادِ خداوندی ہوا کہ اسے نہ نکالو۔ ہم نے اسے انقراضِ عالم تک مہلت دے رکھی ہے

ایک مرتبہ فرمایا کہ

"حضرت عیسٰی آخری زمانہ میں دنیا میں اتریں گے اور اپنے معجزہ سے ایک مردہ زندہ کریں گے۔ وہ ابوطالب ہوں گے۔ وہ مسلمان ہو کر کلمۂ شہادت پڑھیں گے۔" (ابوطالب حضرت علیؓ کے والد تھے)

ایک مرتبہ آپ سے پوچھا گیا کہ یہ کیا بات ہے کہ جب آدمی نماز میں مصروف ہوتا ہے اسے اگلی پچھلی بھولی ہوئی باتیں یاد آجاتی ہیں۔ فرمایا کہ میں نے حدیث شریف کی کتب میں دیکھا ہے کہ الصلوٰۃ نور یعنی نماز روشنائی ہے۔ وقتِ نماز کوئی شے پنہاں نہیں رہ سکتی۔ پس آدمی جب نماز پڑھنے لگتا ہے تو اسے سب بھولی ہوئی باتیں یاد آجاتی ہیں۔

حضرت ابراہیم کے متعلق فرمایا کہ آپ کے والد نے نمرود کے ڈر سے انھیں ایک غار میں پھینک دیا تھا۔ چنانچہ آپ اس غار میں چودہ برس تک رہے۔ جس آگ میں آپ کو ڈالا گیا تھا اس کے متعلق فرمایا کہ اس کی تپش ساٹھ کوس تک جاتی تھی۔ نمرود کے متعلق فرمایا کہ جس مچھر نے اسے ہلاک کیا تھا وہ لنگڑا تھا۔

حضرت یوسف کے متعلق فرمایا۔ ایک مرتبہ انھوں نے حضرت یعقوب کو دیکھ کر تعظیم کے لئے گھوڑے سے اترنا چاہا لیکن اس میں ذرا دیر لگ گئی۔ اس پر جبریل تشریف لائے اور حضرت یوسف سے کہا کہ تم نے گھوڑے سے اترنے میں دیر لگا دی ہے۔ اس لئے تمہاری اولاد میں کوئی پیغمبر نہیں ہوگا۔

حضرت سلیمان کے متعلق فرمایا کہ ان کے باورچی خانہ میں ستر ہزار اونٹ روزانہ نمک لاتے تھے اور وہ روزانہ خرچ ہو جاتا تھا۔ حضرت موسیٰ کے متعلق فرمایا کہ جب وہ پیدا ہوئے تو فرعون نے ایک تنور گرم کر کے انھیں اس تنور میں ڈلوا دیا۔

ایک مرتبہ مجلس میں درود شریف کی فضیلت کا ذکر آگیا تو آپ نے فرمایا کہ ایک روز حضرت عثمانؓ بازار سے مچھلی لائے اور اسے بریاں کرنا چاہا۔ مگر وہ بریاں نہ ہوتی تھی۔ جس قدر لکڑیاں انبار خانے میں جمع تھیں سب جل گئیں۔ لیکن وہ مچھلی اپنی اصلی حالت پر ہی رہی۔ وہ مچھلی رسول اللہ کے سامنے پیش کی گئی تو آپ کے دریافت کرنے پر اس نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں نے دریا میں ایک طائفہ دیکھا تھا۔ جو آپ پر درود بھیجتا تھا۔ میں نے بھی ان کی موافقت میں ایک مرتبہ آپ پر درود بھیجا تھا۔ اللہ نے اس کی برکت سے مجھ پر آگ حرام کر دی ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت جبریل نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ حضور میں آپ کی اور آپ کی اولاد کی خدمت کرتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ فردائے قیامت میں میرے حق میں سفارش فرمائیں گے اور اس روز مجھے فراموش نہ کریں گے۔

ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبرؓ کے متعلق فرمایا کہ ایک چیونٹی ان کے پاؤں تلے آکر مر گئی اور آپ نے شدتِ درد سے سخت آہ کھینچی۔ آپ نے چیونٹی کو اٹھا کر خدا سے دعا کی۔ اگر تیری بارگاہ میں میری کچھ بھی عزت ہے تو اس چیونٹی کو زندہ کر دے۔ چنانچہ وہ چیونٹی اسی وقت زندہ ہو گئی۔

اسی طرح ایک مرتبہ آپ کنگھی کر رہے تھے کہ آپ کی ڈاڑھی میں سے ایک بال ٹوٹا جسے ہوا اڑا کر یہودیوں کے قبرستان میں لے گئی۔ اس کی برکت سے تین دن تک عذاب ان کا قبروں پر نہ ہوا۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ ایک بڑھیا روتی ہوئی حضرت مودود چشتیؒ کے پاس آئی اور عرض کیا کہ حضور میرے اکلوتے بیٹے کو بادشاہ نے ناحق مروا دیا ہے۔ آپ یہ سن کر سردار تشریف لے گئے۔ اور اس لڑکے کی لاش سے کہا کہ اگر تو ناحق مارا گیا ہے تو اٹھ کھڑا ہو۔ لڑکا اسی وقت زندہ ہو گیا۔

کہاں تک لکھتا جاؤں تسلیم! اب تو میرا ہاتھ بھی تھک گیا۔ یہ ہے نمونہ ان ملفوظات کا۔ زیادہ تفصیل سے دیکھنا چاہو تو انھیں خود دیکھ لو۔ اُمید ہے انہی اقتباسات سے تمھیں ان حضرات کی قرآنی معلومات اور علمی اور ذہنی سطح کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔

والسلام۔ پرویز

اندرونِ ہند

ہندی مسلمانوں پر بدستور خدا کی وسیع زمین تنگ کرنے کی مہم جاری ہے۔ اگرچہ پنڈت جواہر لال نے حال ہی میں یہ اعلان کیا ہے کہ ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے جس میں ہر قابل شخص کو خواہ وہ کسی ذات سے اور فرقہ سے تعلق رکھتا ہو صدر اور وزیر اعظم بننے کا حق ہونا چاہیئے۔ لیکن پنڈت جی کا یہ اعلان "حقیقت ہاتھی کے دانت" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ پنڈت جی کے اس اعلان کے دوسرے یا تیسرے ہی روز اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے نتائج کا اعلان ہوا ہے۔ جس میں کسی ایک مسلمان کا بھی نام نہیں، سوال یہ ہے کہ کیا تقسیم کے بعد تمام مسلمان ناقابل اور ناکارہ ہو گئے ہیں۔ یا قدرت کے سارے کارکردگی اور قابلیتیں ہندوؤں کے لئے ہی مخصوص ہو گئی ہیں؟ واقعہ یہ نہیں واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ایک منظم طریقے سے ہو رہا ہے۔ سوچی سمجھی اور پہلے سے تیار کی ہوئی اسکیم کے مطابق ہو رہا ہے۔ ہندوستان کے اخبارات دبے لفظوں میں اس قسم کی دھاندلیوں کو بے نقاب کرتے رہتے ہیں روزنامہ نئی دنیا (دہلی) نے باوجود فرقہ پرستوں کی دھمکیوں کے حق گوئی و بے باکی کی روش اختیار کی تھی لیکن ہندوستان کی سیکولر حکومت کب تک حق گوئی و بے باکی کو برداشت کرتی۔ چنانچہ اس نے نئی دنیا کے طابع اور ناشر سے پانچ پانچ ہزار روپے کی ضمانت طلب کر کے نئی اجلا ایک سچ کہنے والے اخبار کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ ایک تو حکومت ہندی مسلمانوں پر ہر قسم کے مظالم توڑ رہی ہے دوسری طرف وہاں کا فرقہ پرست طبقہ آئے دن نت نئے طریقوں سے ہندی مسلمانوں کو پریشان کرنے میں مصروف ہے۔ ہندی مسلمانوں کی بے بسی اور بے کسی کا کچھ اندازہ الجمعیۃ دہلی کے اس اداریہ کے اقتباسات سے ہو سکتا ہے۔ جو اس نے "فرقہ پرستی اور سیکولرازم" کے عنوان سے لکھا ہے۔

وہ لکھتا ہے:۔

"اقلیتوں کی دل آزاری کا طریقہ بند ہونا چاہیئے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کا سلسلہ بدستور جاری ہے اور اقلیتوں (مسلمانوں) کے خلاف نت نئے فتنے کھڑے کئے جاتے ہیں۔" (الجمعیۃ ۱۴؍مارچ)

ایک طرف تو حکومت ہند اور ہندوستان کے فرقہ پرست مسلمانوں کے ہر طرح درپے آزار ہیں۔ دوسری طرف مسلمان بھی ان مصائب اور پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ بمبئی کا تعلیمی کنونشن، علی گڑھ کا سیاسی اجتماع، کانپور کا عظیم الشان جلسہ کلکتہ میں مسلمان رہنماؤں کی تقریریں اس بات کی شاہد ہیں کہ ہندی مسلمان اپنے آپ میں آ رہا ہے۔ مدراس کی انڈین یونین مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے شادی بل کے خلاف ۲۹ اپریل کو یوم احتجاج منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہندوستانی مسلم لیگ نے تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ ۲۹ اپریل کو متفقہ یوم شریعت منا کر حکومت ہند پر ثابت کر دیں کہ وہ کسی بھی ایسے غیر اسلامی قانون کو منظور نہیں کر سکتے۔ جس سے اسلامی شریعت پر براہ راست زد پڑتی ہو۔ کیا یہ نئی تنظیم اور نئی حرکت کا پیش خیمہ ہوگا؟

لیکن اس کا علاج! صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ پاکستان مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جائے۔ اور جہاں جہاں مسلمان بستے ہیں وہ۔

ایک ہوں سارے حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

باب المراسلات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟

مظفر گڈھ کے ایک صاحب کا ایک استفسار سابقہ اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کا دوسرا سوال یہ ہے کہ موجودہ غیر اسلامی نظام میں چند لوگ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جب کہ دوسرے دکھ پا رہے ہیں عشرت کوشوں کو غلط روش کی سزا کب ملے گی۔ کہاں ملے گی۔ اس کی صورت کیا ہوگی؟

طلوع اسلام | اگر آپ نے اسلامی نظام کے قیام میں جان فروشانہ جدوجہد کی تو غلط روش پر چلنے والوں کو آپ کے سامنے سزا مل جائے گی۔ اور یہ ذلت و خواری اور تباہی و بربادی کی سزا ہوگی۔ لیکن اگر آپ نے اس کے لئے کوشش نہ کی۔ تو پھر یہ انقلاب خدا کے کائناتی قانون کی رو سے واقع ہوگا۔ جس میں ایک ایک دن ہزار ہزار اور پچاس پچاس ہزار کا ہوتا ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں اس سزا کا سلسلہ زندگی سے بعد کی زندگی تک چلا جائے گا۔ کیونکہ زندگی جوئے رواں ہے۔ اور خدا کے قانون مکافات کی رو سے اعمال کے ظہور نتائج کا وقت یہاں کی زندگی میں بھی آسکتا ہے۔ اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی (تفصیل ان امور کی آپ کو محترم پرویز صاحب کی معرکہ آرا تصنیف "نظام ربوبیت" میں ملے گی۔ جو اس وقت پریس میں آخری مراحل سے گذر رہی ہے اور اب عنقریب شائع ہو جائے گی)

رجعت پسندی

کراچی سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔ کہ جماعت اسلامی کے سلسلہ میں اکثر کہا جاتا ہے کہ یہ رجعت پسندوں کی جماعت ہے۔ کیا آپ بتائیں گے کہ اس اصطلاح کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اور رجعت پسندانہ مسلک کسے کہتے ہیں؟

طلوع اسلام | انسانی علم و فکر کی صورت یہ ہے کہ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا ہے یہ بھی آگے بڑھتا اور بلند ہوتا چلا جاتا ہے چنانچہ ہر دور کی علمی اور فکری سطح پچھلے دور سے اونچی ہوتی ہے۔ اگر اس سے کوئی چیز آگے ہوتی ہے۔ تو وہ وحی کی روشنی ہوتی ہے۔ جو ذہن انسانی کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا "ترقی پسندانہ" مسلک کہلاتا ہے۔ جس کی تائید قرآن نے کی ہے۔ اس کے برعکس رجعت پسندانہ مسلک یہ کہتا ہے کہ نہیں۔ انسانی علم و فکر میں ترقی معکوس ہو رہی ہے۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا ہے۔ انسانی علم و فکر کی سطح پست سے پست تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے ہر دور کے انسان کو اپنی فکری راہ نمائی کے لئے پیچھے کی طرف دیکھنا چاہیئے۔ اس گروہ کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہ انسانی فکر کو ابھرنے اور بڑھنے نہ دے۔ وہ چاہتے یہ ہیں کہ افراد انسانیہ بالغ نہ ہوں۔ ہمیشہ بچے رہیں۔ جن لوگوں کی فکری سطح پست ہوتی ہے (خواہ وہ پڑھے لکھے جاہل ہوں یا ناخواندہ) وہ ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اور یہ انہیں کھلونے دے کر بہلاتے رہتے ہیں۔ یہ عقائد میں چن چن کر ایسی باتیں پیش کریں گے۔ جن میں عجوبہ پسندی ہو۔ یہ "بالغ بچے" اس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ چیزیں ان کی ذہنی سطح کے عین مطابق اور بچپنے کی فطرت سے یکسر ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ عقائد سے آگے بڑھتے ہیں تو انہیں "اعمال" (کام) بھی بچوں کے سے بتاتے رہتے ہیں تاکہ وہ اس کھیل میں صرف رہیں۔ اس کا نام وہ "خدمت دین" رکھ دیتے ہیں۔ دوسری طرف ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کوئی آواز یا تحریک جو لوگوں کی فکری سطح کو اونچا کرنے کے لئے اٹھے۔ اسے دبا کر رکھ دیا جائے اس لئے کہ عوام کی فکری سطح کی بلندی میں ان حضرات کی امارت و قیادت کی موت ہوتی ہے۔ یاد رکھئے قوموں کی تباہی ہمیشہ انہی لوگوں کے ہاتھوں سے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ مصاف زندگی میں وہی قوم شکست کھاتی ہے۔ جو فکری طور پر دوسری قوموں سے پیچھے رہ جاتی ہے۔

آپ جماعت اسلامی کی ہشت سالہ کارگزاری پر نگاہ بازگشت ڈالئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کے نامۂ اعمال میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ عوام کو ان کی فکری سطح پر مطمئن رکھ کر اپنے ساتھ لگائے رکھا جائے۔ وہی عجوبہ پرستانہ مذہب جس پر ان کا بچپن کا ساذہن مطمئن رہے۔ وہی ہنگامہ پرور سیاست جس میں ان کے بچوں کے سے سطحی جذبات کی تسکین ہوتی ہے۔ وہی چھوٹی چھوٹی سی "دینی خدمات" جن کے ثواب سے یہ لوگ اپنے آپ کو جنت کے مستحق سمجھنے لگ جائیں۔ (مثلاً)

> مرکز سے موصول شدہ پارچہ جات علاقہ کے مستحق لوگوں میں تقسیم کئے گئے۔ گاؤں کی مسجد کی مرمت اور صفائی وغیرہ کروائی۔ مسجد کا نلکہ مرمت کرایا گیا تاکہ پانی کا انتظام بہتر طریق پر ہو سکے۔ مسجد کے لئے گھڑی بھی خریدی گئی۔ ایک مسجد کے لئے لیمپ بھی خریدی گئی۔ مسجد کے نزدیک سے گذرنے والی پانی کی نالی بھی مرمت کرائی گئی۔
>
> (کارگذاری متفقین جماعت اسلامی مطبوعہ تسنیم بابت ۸ مارچ ۱۹۵۵ء)

دوسری طرف اس جماعت کا کارنمایاں یہ ہے کہ اس نے آٹھ برس سے مسلسل یہ "جہاد" شروع کر رکھا ہے کہ پاکستان میں کوئی فکری تحریک آگے نہ بڑھنے پائے۔ سرزمین پاکستان اس اعتبار سے بے حد خوش نصیب تھی کہ یہاں اقبال جیسا قرآنی مفکر پیدا ہوا۔ اس وقت اس سرزمین میں جو صحیح فکری شعاعیں آئینہ پاش نظر آرہی ہیں۔ وہ اس دیدہ ور کی بصیرت قرآنی کی رہین منت ہیں۔ لیکن آپ نے جماعت اسلامی والوں سے کبھی ایک لفظ بھی اقبال کی تعریف یا تائید میں نہیں سنا ہوگا۔ تعریف و تائید تو ایک طرف اپنی نجی صحبتوں میں یہ لوگ اقبال کا مذاق اڑاتے نظر آئیں گے (نجی صحبتوں میں اس لئے کہ ابھی لوگ اقبال کی تحقیر و تضحیک برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لئے ان لوگوں کو اس کی جرأت نہیں ہوتی کہ علانیہ اس کا استہزا کریں) اقبال کے بعد اسی قرآنی بصیرت کے چراغ کو طلوع اسلام نے وجہ تابانی محفل بنایا۔ اور وہ ان "صالحین" کی مقدس زبان سے مسلسل گالیاں کھا رہا ہے۔ کوئی تہمت ایسی نہیں جو اس کے خلاف نہ تراشی جاتی ہو۔ اور کوئی بہتان ایسا نہیں جو اس کے سر نہ باندھا جاتا ہو۔ یہ محض اس لئے کہ عوام اس سے متنفر رہیں۔ اور اس طرح ان کی فکری سطح بلند نہ ہونے پائے۔ آپ غور کیجئے کہ طلوع اسلام نے قرآن کے متعلق جو لٹریچر پیش کیا ہے۔ اس پر غور و فکر کرنے سے قرآن کی عظمت کس طرح نکھر کر سامنے آجاتی ہے اور خود ان لوگوں کی فکری سطح کتنی بلند ہو جاتی ہے۔ جو اس پر غور کرتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ آپ ہم سے متفق ہوں گے کہ طلوع اسلام کی طرف سے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں بیشتر ایسی ہیں جنہیں مغرب زدہ ترین منکرین کے سامنے اس یقین اور اطمینان کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس سے قرآن کی عظمت اور دین خداوندی کی صداقت کا بے ساختہ اعتراف کریں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ ہزار ہا نوجوان جو کبھی کے دہریت اور کمیونزم کی آغوش میں جا چکے ہوتے۔ اس لٹریچر کی بدولت دین کے حلقہ بگوش ہو رہے ہیں۔ آپ سوچئے کہ اگر جماعت اسلامی والے اس قسم کی فکری تحریک کے پیچھے یوں لٹھ لے کر نہ پڑ جاتے۔ تو اس سے آج کس قدر وسیع نتائج مرتب ہو جاتے۔ لیکن پھر ان کی امارت کیسے قائم رہتی۔ ان کی امارت کا تو راز ہی اس میں ہے کہ

چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئین تو خوب

اس قسم کے مسلمان کے متعلق ان کی ایک دوسرے کو یہی تاکید ہوتی ہے کہ

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے

پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

البتہ اس کے لئے الفاظ انہوں نے استعمال کر دیئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ سب ترقی پسند واقع ہوئے ہیں

یہ ہے مفہوم رجعت پسندانہ مسلک سے جو قوم کو اس بری طرح سے تباہ کئے جا رہا ہے۔

بین الاقوامی جائزہ (صفحہ ۶ کا بقیہ)

کے مقام پر اس کی دسویں سالگرہ منائی جا رہی ہے اس موقعہ پر دول اربعہ کے وزرائے خارجہ موجود ہوں گے۔ توقع کی جاتی ہے کہ وہ تمہیدی گفتگو کر سکیں گے اگر ایسا ہو گیا تو مزید مذاکرات کے لئے فضا تیار ہو جائیگی غنیمت ہے کہ بڑی طاقتیں مذاکرات باہمی کیلئے تیار ہو رہی ہیں ان سے امن کی صورت نکل سکے یا نہیں کم از کم اتنا تو ہوگا کہ باقاعدہ تصادم کچھ وقت کے لئے ملتوی ہو جائے گا۔ انسان اپنی بے بسی میں انہی صورتوں کو غنیمت سمجھا کرتا ہے۔ جن میں آخری فیصلوں میں التوا ہوتا جائے۔

حقائق و عبر

صالحیت کے مجسّمے

یوں تو جماعت اسلامی روزِ اول ہی سے "طلوع اسلام" کی مشبانہ روز مخالفت کو جزوِ ایمان اور "صالحیت" کا معیار سمجھتی رہی ہے لیکن جب سے "طلوع اسلام" ہفتہ وار ہوا ہے اس کا پیچ و تاب حد سے بڑھ گیا ہے اور ان کی حالت عجیب ہو گئی ہے۔ اگر ایک طرف ہر "صالح" کی زبان ہوا کے دوش پر گالیوں کے پشتارے لا رہی ہے تو دوسری طرف اسی صالح کا قلم صفحۂ قرطاس کو سب و شتم سے داغدار کرتا چلا جا رہا ہے۔ "طلوع اسلام" اپنی اس عزت افزائی پر جس قدر بھی فخر کرے کم ہے۔ بقول غالب

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

قارئین کو اس لذت میں شریک کرنے کے لئے اس ذکر کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ روزنامہ "تسنیم" لاہور نے ۳۰ مارچ ۱۹۵۵ء کے اداریئے میں حسب عادت، گورنر جنرل کے تازہ آرڈیننس میں کیڑے نکالتے ہوئے "طلوع اسلام" کو بھی اسی تیر سے چھیدنے کی کوشش کی ہے۔ "طلوع اسلام" نے ۲۶ مارچ کی اشاعت میں "دفتری نیرنگیاں" کے عنوان سے جو لمعات شائع کئے، ان میں سے مندرجہ ذیل اقتباس اس نے نقل کیا۔

> آپ کسی سرکاری ملازم سے بات کرکے دیکھئے (حتیٰ کہ اب تو بڑے بڑے افسر بھی اس زمرے میں شامل ہو گئے ہیں) وہ بے باکانہ کہنا شروع کر دے گا کہ صاحب حکومت میں نہ کسی قاعدے کی پابندی رہ گئی ہے نہ قانون کی۔ نہ کہیں دیانتداری ہے نہ ایمانداری۔ رشوت ہر جگہ عام ہے۔ اعزہ نوازی اور اقربا پروری ہر ایک کا شیوہ بن رہا ہے۔ ذاتی مفاد اور اغراض خویش ہر ایک کے سامنے ہیں۔ کوئی کام ٹھکانے سے نہیں ہو رہا۔ دفاتر میں کوئی نظم و ضبط باقی رہ گیا ہے نہ قانون اور ضابطہ کا احترام اور پاس۔ ماتحت افسر کی نہیں مانتا، افسر عدل و انصاف کا لحاظ نہیں کرتا۔" اندھیر نگری چوپٹ راج!

یہ اقتباس دے کر "تسنیم" کے مدیر نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ حکومت بعد گورنر جنرل قانون و آئین کے تقاضوں کو نظر انداز کرنے کی عادی ہے۔ ذرا اس صالح مدیر کی دیانت کی داد دیجئے کہ اس نے نامکمل اقتباس کو اپنی تائید میں استعمال کر لیا۔ لیکن چند سطریں اور نقل کرکے اپنے قارئین کو یہ نہ بتایا کہ "طلوع اسلام" کے نزدیک یہ فضا جماعت اسلامی ہی کی پیدا کردہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ سارے مقالہ میں یہی دکھایا گیا ہے کہ جماعت اسلامی کس طرح حکومتی کارندوں کے دل سے نظم و ضبط کا احترام نکال رہی ہے۔

"تسنیم" نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آگے چل کر لکھا ہے کہ "طلوع اسلام" جس حلقے کا اخبار ہے اور موجودہ حکومت کے ساتھ اس کے جس قسم کے تعلقات ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔" گویا کہ "تسنیم" نے بالکل اسی حربے سے کام لیا ہے جس کا ذکر "طلوع اسلام" نے ۲۶ مارچ کے لمعات میں کیا ہے یعنی یہ کہ "طلوع اسلام" کو حکومت کا اخبار کہہ کر اپنے حلقہ میں بدنام کیا جائے۔ "تسنیم" نے یہ کچھ اشارہ سے کہا ہے صاف صاف نہیں کہا۔ لیکن ہم "تسنیم" کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ بتائے کہ "طلوع اسلام" کس "حلقے کا اخبار" ہے اور اس کے "موجودہ حکومت کے ساتھ" کس "قسم کے تعلقات" ہیں؟ اگر اس نے خدا واسطے کی گالیاں دینا اپنا شعار نہیں بنا لیا تو وہ صاف صاف بتائے کہ اس کے نزدیک حقیقت حال کیا ہے؟ اور اس کا اس کے پاس کیا ثبوت ہے؟ اگر "تسنیم" یا جماعت اسلامی کے دیگر حضرات اس حقیقت کا انکشاف فرما دیں اور اس کی کوئی دلیل ہمیں بھی پہنچا دیں کہ طلوع اسلام حکومت کا پرچہ ہے تو اس سے ہمیں بڑا فائدہ پہنچے گا۔ اس وقت طلوع اسلام کی حالت یہ ہے کہ وہ مراعات جو حکومت کی طرف سے عام اخبارات کو یونہی دیدی جاتی ہیں طلوع اسلام پر ان کے دروازے بھی بند ہیں۔ مثلاً ابھی کل کی بات ہے کہ ہم نے حکومت سے درخواست کی کہ ہمیں باہر سے کاغذ درآمد کرنے کی اجازت دی جائے۔ یہ اجازت متعدد اخبارات کو دی جا چکی ہے اور اس سے کاغذ مقابلتاً سستا مل جاتا ہے۔ حکومت نے دو لفظی جواب میں درخواست کو نامنظور کر دیا اور اتنا بھی ضروری نہ سمجھا کہ اس کے دلائل کا جواب دیا جائے۔ یا مثلاً ہم کئی مہینوں سے ایک ٹیلیفون حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ اور ہزار دوڑ دھوپ کے باوجود اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ حالانکہ کراچی میں اخبارات تو ایک طرف، اخبار بیچنے والوں کی دوکانوں پر بھی ٹیلیفون لگے ہوئے ہیں۔ ایسی بہت سی مثالیں دکھائی جا سکتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں اگر جماعت اسلامی کے حسن وساطت سے یہ معلوم ہو جائے کہ طلوع اسلام حکومت کا پرچہ ہے تو ہم اس حکومت سے یہ تو کہہ سکیں کہ سرکاریہ "رستم اور افراسیاب کی کشتی" کا تماشا کب تک (جس میں دونوں کو پتہ نہیں کہ ان کا باہمی تعلق کیا ہے) طلوع اسلام آپ کا۔ آپ طلوع اسلام کے۔ پھر یہ بے رخی کیوں؟

کیا صالحین کرام ہم پر اتنا احسان کریں گے؟

عالم اسلامی

ترکی عراقی معاہدہ کی توسیع سے متعلق جو قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں وہ لباس حقیقت اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ برطانیہ نے اس معاملے میں شرکت کا اعلان کر دیا ہے۔ اسی ضمن میں برطانیہ اور عراق میں ایک معاہدہ دفاع بھی طے پایا ہے جو موجودہ معاہدہ کا بدل ہے۔ ان دو ممالک میں ۱۹۳۰ء میں ایک معاہدہ ہوا تھا، جو دو سال بعد نافذ العمل ہوا اور جس کی مدت حیات ۱۹۵۷ء تک تھی۔ اس کی رو سے حبانیہ اور شیبہ کے ہوائی اڈے برطانیہ کے قبضہ میں تھے اور اسے عند الضرورت عراق سے اپنی فوجیں گزارنے کا بھی حق حاصل تھا۔ معاہدے کی تفاصیل ہنوز شائع نہیں ہوئیں لیکن کہا گیا ہے کہ برطانیہ یہ دونوں اڈے ایک سال کے اندر خالی کر دے گا۔ البتہ اسے عراقی اڈے استعمال کرنے کا حق حاصل رہے گا۔ نیز برطانوی ماہرین عراقی فوج کی تربیت اور تنظیم میں مدد دیں گے۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا تھا، عراق نے بڑی عمدگی سے، بغیر کسی بدمزگی اور تلخی کے یہ معاہدہ بدلوا لیا ہے، گو اس کے حسن و قبح سے متعلق فی الحال بات نہیں کی جا سکتی لیکن جس معاہدے کو عراق نے رضاکارانہ اور آزادانہ منظور کیا ہے وہ اس کے مفاد کے منافی نہیں ہو سکتا۔

اب ترکی اور عراق نے باقاعدہ طور پر پاکستان کو دعوت دی ہے کہ وہ اس معاہدے میں شریک ہو جائے۔ پاکستان اس دعوت کو لازماً قبول کرے گا بلکہ ایک حد تک تو وہ اس میں شریک ہے، اس کا معاہدہ ترکی سے ہو چکا ہے جو ترکی عراقی معاہدے سے مشابہ ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ پاکستان کی شرکت کے بعد مشرق وسطیٰ کی دفاعی تنظیم کا ہیولیٰ تیار ہو جائے گا۔ کیونکہ ترکی، عراق، پاکستان، اور برطانیہ، چار ممالک اس میں شریک ہو چکے ہوں گے۔

مصر اس دفاعی تنظیم پر پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ وہ قاہرہ میں ایک ناکام کانفرنس منعقد کر چکا ہے اور نئے عربی دفاعی معاہدے کی تفصیلات طے کرنے سے قاصر رہا ہے۔ اب کشمکش کا مرکز انڈونیشیا کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ جہاں بندونگ کے مقام پر ۱۸ اپریل کو ایشیائی افریقی کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔ مصر اس اجتماع سے فائدہ اٹھا کر پنڈت نہرو کی مدد سے عربی ممالک کو اپنے پیچھے لگانے کی کوشش کرے گا۔ لیکن نتیجہ معلوم!

مصر کو یمن سے بھی تائید حاصل ہوتی نظر آتی تھی، لیکن وہ ملک "انقلاب" کا شکار ہو گیا ہے۔ وہاں شاہ احمد کو فوج نے برطرف کر دیا ہے اور ان کے بھائی عبد اللہ کو تخت نشین کر دیا ہے۔ اس انقلاب کی علت بخوبی عیاں نہیں ہوئی۔ لیکن یہ قابل ذکر ہے کہ نئے شاہ کا رجحان اقوام مغرب کی طرف ہے۔ وہ متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں میں شریک ہو چکے ہیں اور امریکہ اور انگلستان کے دورے بھی کر چکے ہیں۔ مصر اور سعودی عربیہ اس سے کافی مضطرب ہیں اور اس کوشش میں ہیں کہ بیچ بچاؤ کرکے معاملہ رفع دفع کرا دیں۔ اس تبدیلی سے ایک حد تک یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مصر اپنی قیادت دوسرے ممالک پر بآسانی مسلط نہیں کر سکتا، اور جو حکمران اس کے دباؤ میں آئیں گے وہ ملک کو مطمئن نہیں کر سکیں گے۔

ستاروں کی گذرگاہیں

اقبال کے الفاظ میں روح ارضی نے آدم کا استقبال کرتے ہوئے کہا تھا۔

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دُور سے گردوں کے ستارے

یا آدم کا مقام یہ ہے کہ

ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

اس مقام کو حاصل کرنا تو ایک طرف ابھی تک انسان بالعموم اس مقام کا شعور بھی حاصل نہ کر سکا۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ ستاروں کی گذرگاہوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ . . . . اپنی تقدیر تک کو ان کی گردش و حرکت تک کے تابع سمجھتا ہے انسان اس تلاش میں ایسا خوار و زبوں ہوا کہ وہ

اپنے افکار کی دنیا میں سفر نہ کر سکا

رفتہ رفتہ انسان اپنے آپ میں آنا شروع ہوا۔ اور سائنس نے عطا کردہ آلات سے ان کروں کی حقیقت و ماہیت جاننے لگا نگاہ کا زاویہ بدلا تو کائنات ہی بدل گئی۔ اور انسان کو نظر آنے لگا کہ

شاید کہ زمیں ہو یہ کسی اور جہاں کی
تو جس کو سمجھتا ہے فلک اپنے جہاں کا

اس سے اس کے حوصلے بڑھے اور اس نے نعرہ لگایا۔

بالائے سر رہا تو ہے نام اس کا آسماں
زیرِ پر آ گیا تو یہی آسماں زمیں

چنانچہ وہ اب اس آسمان کو زمین بنانے کے منصوبے تیار کر رہا ہے۔ کیا وہ ستاروں تک پہونچ جائے گا؟ پہونچے گا تو انہی میں کھو جائے گا؟ یا ستارے اس کی منزل کے سنگِ میل ہوں گے یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب وقت دے گا۔ لیکن انسان کو بالآخر اقطار السموات والارض سے نکلنا ہے وہ منزل کب آئے گی، اس کا جواب وثوق سے دینا مشکل ہے۔ لیکن اس شاہراہ آدم کے نقوش ابھرتے چلے جا رہے ہیں۔

ستاروں کو جاننے کی خواہش انسانی سینے میں نہ معلوم کتنے زمانے سے موجزن ہے وہ حتی المقدور انھیں جانتا گیا۔ اور تخیل کے پروں پر ان بلندیوں کی سیر کرتا رہا۔ اب یہ تخیل کی پرواز میں حقیقی ہوتی نظر آ رہی ہیں۔ ستاروں کے راستے میں فضا (SPACE) حائل ہے چونکہ اس میں زمین کی کشش ثقل نہیں۔ اس لئے اس میں سفر آسان نہیں۔ لیکن انسان کے لئے کون سی شے ناممکن ہے، وہ اڑ سکتا ہے اور ہزاروں میل کی رفتار سے۔ تھوڑا عرصہ ہوا لندن میں متعدد ممالک کے سائنسدانوں کا اجتماع ہوا تاکہ سیاروں کے مابین سفر سے متعلق معلومات کا جائزہ لے کر اس کے عملی پہلو پر غور کریں۔ وہ اس نتیجہ تک پہنچے کہ ایک مصنوعی سیارہ فضا میں معلق کیا جا سکتا ہے جو فضائی سفر کے لئے اسٹیشن کا کام دے۔ اب اسے امریکن راکٹ سوسائٹی (AMARICAN ROCKET SOCIETY)

کی فضائی پرواز کی کمیٹی SPACE FLIGHT COMMITTEE نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے، اور نیشنل سائنس فاؤنڈیشن سے درخواست کی ہے کہ وہ ایسے مصنوعی سیارے کی افادیت کا تفصیلی مطالعہ کرے۔

اس درخواست کا مطلب یہ ہے کہ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مصنوعی سیارے کی تجویز قابلِ عمل ہے۔ اب دیکھنا صرف یہ ہوگا کہ زمین سے کم و بیش چھ سو میل اونچی فضا میں مصنوعی سیارہ کیسے نصب کیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ اس سیارے پر کوئی انسان نہیں ہوگا۔ لیکن اس سے ستاروں کی گذرگاہوں اور افلاک میں انسانی پرواز آسان ہو جائے گی۔ غالباً اس وقت یہ انسان کے سیارے ہی ممکن العمل ہیں۔ اس بارے میں کوئی دس سال سے تجربات کئے جا رہے ہیں۔ اب تک اگر ایسا سیارہ تیار نہیں ہو سکا تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس پر بہت لاگت آئے گی، اس سے عہدہ برآ ہونا ناممکن ہوگا، لیکن اب تجربوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خرچ پورا کیا جا سکے گا۔ کمیٹی مذکور نے اس ضمن میں مختلف شعبوں میں کام کرنے والے سائنس دانوں سے جو شہادات حاصل کی ہیں وہ بھی اس کی موید ہیں کہ ایک مصنوعی سیارہ فضا میں یوں معلق کیا جا سکتا ہے کہ وہ زمین کے گرد گردش کرے اور اس سے سلسلہ مواصلات بھی برقرار رکھا جا سکے۔

مشہور ولسن رصدگاہ کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ایرا بوؤن کا خیال ہے کہ ایسا چھوٹا سا سیارہ متوازن نہیں ہو سکے گا، اور اس سے دور کی چیزوں کا مشاہدہ مقابلۃً آسان نہیں ہوگا، ان کا کہنا ہے کہ زمین کی ہوائیں دوربینوں کی قوت کو کم کر دیتی ہیں البتہ اگر کہیں چاند پر دوربین نصب کی جائے تو پھر فضائے بسیط میں تیرنے والے کروں کا مشاہدہ آسان ہو جائے گا! انھیں یہ خطرہ نظر آتا ہے کہ مصنوعی سیارے سے زمین کو ضروری معلومات پہونچانا عملاً دشوار ہو جائے گا۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں بجلی سے تصویریں بھیجنے کے نئے طریقوں سے زمین کو بخوبی باخبر رکھا جا سکے گا۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ زمین اور چاند کے مابین خود ساختہ اسٹیشن سا قائم کرنا عین ممکن ہے، سوال صرف یہ ہے کہ اس کے لئے کیا عملی طریق کار اختیار کیا جائے۔ واضح رہے کہ اس وقت اندازہ یہ ہے کہ مصنوعی سیارہ کھوکھلا "غبارہ" سا ہوگا۔ جس کا قطر چند فٹ سے زیادہ نہ ہوگا۔ اس کا وزن سوا من کے لگ بھگ ہوگا۔ اسے راکٹ کے ذریعے فضا میں بہت اونچا پہونچا دیا جائے گا۔ جہاں وہ چند ہفتوں تک فضا میں تیرتا رہ سکے گا۔

یہ چند ہفتوں کی میعاد بڑی قلیل ہے۔ اور اس مرحلہ میں قدم جمانا اور ضروری معلومات فراہم کرنا خاصا دشوار ہوگا۔ لیکن زمین کی کشش ثقل سے یہ عارضی آزادی انسان کو نئی آزادی سے ہم کنار کرنے کی ضامن ہو جائے گی۔ یہ آزادی اسے ستاروں تک پہونچا دے گی۔ اگر یہ ستاروں کی گذرگاہوں کو ڈھونڈنے والا انسان اپنے افکار کی دنیا میں بھی سفر کر سکتا۔ تو یہ دنیا یقیناً ایسا جہنم نہ رہتی۔ جس سے بھاگ کر انسان کا لاشعور ستاروں میں پناہ لینے کی سوچ رہا ہے۔ لیکن اپنے افکار کی دنیا میں سفر تو وحی کی روشنی میں ہی ممکن ہے۔ اور اس سے مغرب کی آنکھ بیگانہ ہے۔ یہ بھی فطرت کی عجیب تقسیم ہے کہ مشرق میں روشنی ہے اور آنکھ نہیں اور مغرب میں آنکھ ہے اور روشنی نہیں!

نقد و نظر

آشیانہ (ہفتہ وار) مدیر صفدر سلیمی، ملنے کا پتہ:- دفتر آشیانہ، راجگڑھ روڈ لاہور۔ سالانہ چندہ ۱۱ روپے فی پرچہ ۳ آنے

اس ہفتہ وار اخبار کے سرورق پر لکھا ہوا ہے "قرآنی تصورات کا نقیب" اور افتتاحی اداریئے میں اس کے قارئین کو یقین دلایا ہے کہ "ہمارے قلم کی دعوت جذبات کی بجائے فکر و نظر کے نام پر ہوگی ہم تطہیر فکر اور تعمیر قلب کے نشانوں کو سفر کی ہر منزل پر سامنے رکھیں گے" آگے چل کر "منشور" کے تحت کہا گیا ہے "آج ہماری سیاست بے نتیجہ ہے (کیونکہ) ہم نے ایک معاشرے کی تعمیر سے روگردانی اختیار کی جس کا ارتقاء اسلامی خطوط پر ہو" اب تک جو تین پرچے شائع ہو چکے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آشیانہ ان دعووں کو پورا کرنے کی مخلصانہ کوشش کر رہا ہے۔ ہمیں ایسے ہمنوا کی خوشی ہے۔ لیکن یہ منزل ہے بڑی کٹھن۔ طلوع اسلام جانتا ہے کہ "تطہیر فکر" کتنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ لیکن یہ کام جب کرنے کا ہے تو ہم سفروں کے لئے شہر حال آسانی ہے کہ "طلوع اسلام" راہ کے بیشتر کانٹوں کو دور کر چکا ہے۔ اگر ہمارے معاصر نے صبر اور استقامت سے کام لیا تو منزل مقصود کو پا لینا چنداں دشوار نہیں رہے گا۔

آشیانے میں حالات حاضرہ پر بھی بحث کی جاتی ہے اور کتابت طباعت اچھی ہے۔

سویرا (مرتبہ حنیف رامے اور نذیر چودھری) شائع کردہ نیا ادارہ لاہور

"سویرا" کا خاص نمبر (قیمت ۳ روپے صفحات ۳۰۴) محنت سے ترتیب دیا گیا ہے اور اس سے خوش ذوقی اور نفاست کا اظہار ہوتا ہے۔ اس میں تصاویر بھی ہیں، مضامین بھی، افسانے

بھی انہیں بھی عزیز ہیں۔ ان میں تنوع ہے اور ان کے سمجھنے والے بھی اپنے حلقے میں معروف ہیں۔ یہ جریدہ اپنا مقام رکھتا ہے اور اس کا ادارہ بھی محتاج تعارف نہیں۔ البتہ یہ اور اس قسم کے جرائد کو دیکھ کر جو اصولی نکتہ سامنے آتا ہے وہ قابل غور ہے ان سے اس ذہنی پریشانی اور قلبی اضطراب کا اندازہ لگ جاتا ہے جس میں ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ اس بری طرح سے مبتلا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ زندگی کے متعلق جو باتیں اس سے پہلے لوگوں کو عام طور پر مطمئن کر دیا کرتی تھیں۔ زمانہ اس قدر بدل چکا ہے کہ ان سے اب متجسس قلوب مطمئن نہیں ہو سکتے وہ اپنے اطمینان کی خاطر کچھ اور چاہتے ہیں۔ لیکن ہمارا قدامت پرست طبقہ اس پر مصر ہے کہ انہیں انہی فرسودہ تصورات سے مطمئن ہو جانا پڑے گا۔ اس کے باعث نوجوان چند در چند الجھنوں کا شکار ہو گئے ہیں

یہ ٹھیک ہے کہ نوجوان غلط راہ پر جا رہے ہیں۔ لیکن اس کی ذمہ داری نوجوانوں پر نہیں بلکہ ان کے بزرگوں پر ہے جو ان کی سمت سفر متعین کرنے سے قاصر ہے۔ اس صورت حال کا علاج نوجوانوں کو کوسنا نہیں بلکہ ان کے مسائل و مشکلات کو سمجھنے اور مناسب رہنمائی دینے میں ہے۔ قوموں کی تقدیریں ان کی ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں۔ آپ سوچئے کہ جس قوم کی آنے والی نسل کا یہ عالم ہو کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو بگولے کے رقص کی طرح ضائع کر رہی ہو۔ اور انہیں کوئی صحیح منزل کی طرف نشان دہی کرنے والا نہ ملے تو اس قوم کا حشر کیا ہو گا۔ لیکن قوم کے اکابر کو اس کی فرصت ہی نہیں کہ وہ اس خلا کو پر کرے۔

طلوع اسلام نے اپنی بساط کے مطابق اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو نوجوانوں کے مرض کا مداوا ہو سکتی ہیں۔ اسباب زوال امت۔ ابلیس و آدم "سلیم کے نام" "فردوس گم گشتہ" "قرآنی فیصلے" وہ چند کتابیں ہیں جو اس دور کے پریشان نوجوان کیلئے وجہ طمانیت قلب ثابت ہو سکتی ہیں ہمیں اس کا احساس ہے کہ جو نوجوان مختلف سمت کو چل دیئے ہیں۔ ان کے لئے راستہ کی تبدیلی آسان نہیں ہو گی۔ لیکن اگر وہ کبھی سستانے بیٹھیں اور ان کتابوں کو بھی ذرا اچٹتی نظر سے دیکھ لیں تو ہمیں توقع ہے کہ وہ اس محنت کو رائیگاں نہیں سمجھیں گے نفس مضمون کو چھوڑ کر خالص ادبی نقطہ نگاہ سے بھی یہ کتابیں ان کے ذوق پر گراں نہیں گزریں گی۔ ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں کہ جو نوجوان ان کتابوں یا ادارہ "طلوع اسلام" کی دوسری مطبوعات کو خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ رعایت دے کر یہ لٹریچر ان تک پہنچائیں۔ کیا ہم توقع کریں کہ ہمارے نوجوان اس پیشکش سے فائدہ اٹھائیں گے؟

اقبال نمبر

۲۳ اپریل کا طلوع اسلام اقبال نمبر ہو گا۔ ایجنٹ حضرات زاید کاپیوں کی فوراً اطلاع دیں۔

"ناظم"

مطبوعات طلوع اسلام

معراج انسانیت — از پرویز۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرور کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے تقریباً نو سو صفحات اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ، مضبوط و حسین جلد مع گرد پوش۔ قیمت بیس روپے

ابلیس و آدم — از پرویز سلسلہ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق قصہ آدم ابلیس، جنات، ملائکہ، وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۰۴ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستور پاکستان — اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے۔ اور حکومت علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے ۲۴۴ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۴۹ صفحات۔ قیمت دو روپے

سلیم کے نام — از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوئے ہیں ان کا شگفتہ مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۲۲۵ صفحات　قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے — روزمرہ کی زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے۔

اسباب زوال امت — از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا۔ ۱۵۰ صفحات　قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے — ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دور آزادی کی مسخ ہوئی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات　قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناس رسول — یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول! مزاج شناس کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۰۸ صفحات۔　قیمت چار روپے

مقام حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد　چار روپے

فردوس گم گشتہ — از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا خالص ادبی نقطہ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۱۶ صفحات۔ قیمت چھ روپے

نوادرات — از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ چار سو صفحات۔　قیمت　چار روپے

اسلامی معاشرت — از پرویز۔ مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینے میں۔ صفحات ۱۹۲۔　قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

نوٹ

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ۔ ادارۂ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۳ ۷۳۔ کراچی

سلسلۂ مطبوعات طلوع اسلام

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلق اویسؓ و چادر زہراؓ
(اقبال)

شناس رسولؐ مزاج

جماعتِ اسلامی کی خطرناک ڈکٹیٹر شپ پر
طلوعِ اسلام کا بے لاگ تبصرہ

شائع کردہ
ادارہ طلوعِ اسلام - کراچی

ضخامت ۴۴۸ صفحات - مجلد مع گرد پوش -
قیمت -/۴ روپے علاوہ محصول ڈاک

دورِ حاضرہ کی ایک عجیب و غریب کتاب

ہماری بصیرت کے مطابق

قرآنی فیصلے

ایسے متعدد امور کے متعلق — جنہیں
سمجھا کچھ اور جاتا ہے — اور وہ ہیں کچھ اور

شائع کردہ - ادارہ طلوعِ اسلام کراچی

ضخامت ۴۰۸ صفحات مجلد مع گردپوش
قیمت -/۴ روپے علاوہ محصول ڈاک

سلسلۂ مطبوعات طلوع اسلام

بچوں، عورتوں، کم پڑھے لکھے لوگوں اور سرکاری ملازموں کیلئے

اسلامی معاشرت

جس میں آسان زبان میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کسے کہتے ہیں
اور قرآن کی رو سے مسلمانوں کا معاشرہ کس قسم کا ہونا چاہئیے

پرویز

شائع کردہ
ادارہ طلوعِ اسلام - کراچی

ضخامت ۱۹۲ صفحات مجلد مع گرد پوش
قیمت -/۲ روپے علاوہ محصول ڈاک

اسبابِ زوالِ امت

قیمت -/۸/۱ روپیہ

اسلامی نظام

قیمت -/۲ روپے

فردوسِ گم گشتہ

دورِ حاضرہ کے نوجوان طبقے کے دلوں میں حسن عقابی روح کی بیداری کے
آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ اس کے بال و پر کی بالیدگی میں
"مفسرِ قرآن" و "ترجمانِ اقبال" جناب پرویز
کے فکرِ عمیق اور اسلوبِ بلیغ کا حصہ نمایاں ہے۔
"فردوسِ گم گشتہ" اسی صاحب نظر کے فکر و اسلوب کا دلکش مجموعہ ہے
جو ملت کی متاعِ گم شدہ کی بازیابی کی راہ بتاتا ہے۔ اور ہر حساس
قلب کو جس میں تخلیقِ نو کی آرزو موجزن ہے، پکار پکار کر کہتا ہے کہ

صورتگری را از من بیاموز
شاید کہ خود را باز آفرینی

ضخامت ۴۱۲ صفحات مجلد مع گرد پوش قیمت -/۶
علاوہ محصول ڈاک

Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Adabi Press, Robson Road, Karachi.

جلد ۸ شمارہ ۱۱ | کراچی: ہفتہ ۱۶ اپریل ۱۹۵۵ء | قیمت چار آنہ — سالانہ دس روپے

قرآن نے کیا کہا؟

یہ چاند۔ یہ سورج۔ یہ ستارے کس نے بنائے ہیں؟ خدا نے۔ لیکن اتنا ماننے سے تم صاحب ایمان نہیں ہو سکتے۔ ولن سا لتھم من خلق السموت والارض وسخرالشمس والقمر لیقولن اللہ۔ اگر ان سے پوچھو کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو کس نے پیدا کیا اور چاند اور سورج کس کے قانون کی زنجیروں سے بندھے ہوئے ہیں تو یہ اقرار کرینگے کہ اللہ ہی نے ایسا کر رکھا ہے۔ ان سے پوچھو کہ پھر تم اپنے معاشرے کی تشکیل کے وقت اس کے قانون کو سامنے کیوں نہیں لاتے؟ یہاں پہنچ کر تم کسی اور طرف کیوں چل نکلتے ہو؟ یاد رکھو۔ اللہ یبسط الرزق لمن یشاء من عبادہ و یقدرلہ۔ رزق کی تنگی اور کشادگی کے لئے بھی خدا کی طرف سے ایک قانون مقرر ہے۔ لہذہ جو قوم چاہتی ہے کہ اسے رزق فراواں ملے اسے چاہئے کہ اس قانون کے مطابق اپنا معاشی نظام قائم کرے اور جو چاہتی ہے کہ اس کی معشیت تنگ ہو جائے وہ اس نظام کو چھوڑ دے۔ ان اللہ بکل شئی علیم (۶۲-۶۱/۲۹) اللہ کا قانون ہر بات کا علم رکھتا ہے۔ یہاں ہر فیصلہ علم و حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ یونہی دھاندلی سے کچھ نہیں ہوتا۔

طلوع اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ....

۱. تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔
۲. یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوع انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔
۳. حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ جو بات قرآن کے مطابق ہو گی صحیح ہو گی جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔
۴. حضور نبی اکرم انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن بعض سازشوں نے ہماری تاریخ میں ایسی چیزیں شامل کر رکھی ہیں جن سے حضور کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضور کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔
۵. قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔
۶. اس عالمگیر نظام زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں (انہیں قانون شریعت کہا جاتا ہے)۔ یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔
۷. اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اسے ربوبیت عامہ یعنی تمام نوع انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
۸. ربوبیت عامہ کے مقصد عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے انفرادی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے "قرآنی نظام ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ....

اب پہلے پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں یہ قرآنی نظام ربوبیت نافذ ہو جائے تاکہ صفات خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی خوابیدہ صلاحیتیں کامل نشوونما پا سکیں اور اس طرح "زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"۔

اگر آپ طلوع اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوع اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ پاکستان کی فارن پالیسی ★ ایشیائی افریقی کانفرنس ★ مجرمانہ خاموشی ★ تاریخی شواہد ★ اسلام کی سرگزشت
★ اوروں کے مسائل ★ عورت کا قرآن ★ مجلس اقبال ★ مشرقی پاکستان کے کمیونسٹ
★ حدیث اور سنت کی حیثیت ★ نقد و نظر ★ باب المراسلات ★ حقائق و عبر

As. -/4/-

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ہوگا اسی قدر قرانی فکر عام ہوگی اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ہے۔ یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا پچیس روپے کی ماہانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تآنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ہوجائے۔ اس طرح — — — —

- آپ کی پیشگی رقم سے ہمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اب شامل ہوجائیے۔

معاملہ کی ضروری باتیں

- طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ہے۔ یہ بھی آپ سے ایسا ہی برتاؤ کریگا۔
- حساب میں بعض اوقات غلطی ہوسکتی ہے۔ ایسی غلطی باہمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجیے۔
- رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے۔ کتابوں کے لئے الگ۔
- مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے۔ نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے۔
- پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو ہفتہ پہلے اطلاع دیجئے۔
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک ہفتہ کے اندر دیجئے۔ بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۱۳ ۷ــ کراچی ــ ۳

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار

طلوع اسلام

جلد ۸ ۱۶ اپریل سنہ ۱۹۵۵ء نمبر ۱۱

پاکستان کی فارن پالیسی

بین الاقوامی سیاست کے طالب علم بخوبی جانتے ہیں کہ آجکل کوئی قوم تنہا نہیں رہ سکتی۔ یہ صورت چھوٹے ملکوں کے لئے ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے ممالک کے لئے بھی ہے۔ اور تو اور امریکہ اور روس بھی جو دنیا کی عظیم ترین سلطنتیں ہیں چھوٹی سلطنتوں کو معاہد و حلیف بنانے میں کوشاں رہتی ہیں۔ بین الاقوامی سیاست کے طالب علم یہ بھی جانتے ہیں کہ آزاد قومیں اپنے ملکی مفاد کے مطابق ایک فارن پالیسی متعین کرتی ہیں اور پھر اس کے مطابق وہ ہمسایہ یا ہم خیال قوموں سے اشتراک تعاون کرتی ہیں۔ اس وقت اس کرۂ ارض پر متعدد ایسی تنظیمیں وجود میں آچکی ہیں یا ان کی تشکیل کے لئے سعی و کاوش کی جارہی ہے۔ مثلاً امریکہ کو دیکھئے۔ اس نے برطانیہ، فرانس، اٹلی وغیرہ اقوام مغربی یورپ سے معاہدے کر رکھے ہیں وہ ان کے تانے بانے دن بدن مضبوط کرتا جارہا ہے اور متفرق علاقائی دفاعی تنظیموں کی تشکیل میں مصروف رہتا ہے۔ اس کی نگاہ اپنے حریف، روس، پر ہے اور وہ اس کے لئے ہر اس چھوٹی یا بڑی سلطنت سے معاہدہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے جو اشتراکیت کی روک تھام کے لئے آمادہ ہو۔ یہ علاقائی تنظیمیں موجودہ بین الاقوامی سیاست کی اصل الاصول ہیں اور اقوام متحدہ تک نے انہیں جائز متصور کر رکھا ہے۔

اس تمہید کے بعد، آیئے ذرا جائزہ لیں کہ پاکستان نے گذشتہ آٹھ سال میں بین الاقوامی میدان میں کیا کیا اور کیا نہیں کیا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ اس کا جواب دینے کے لئے ہمیں تقسیم سے پہلے کی مسلم سیاست پر بھی ایک طائرانہ نگاہ ڈالنی ہوگی۔ تقسیم سے پہلے ہوتا یہ تھا کہ جب کبھی ہندوستان کے اندر یا بیرونی ممالک میں کوئی ایسا حادثہ ہوتا جس سے مسلمان متاثر ہوتے تو وہ جلسے کر لیا کرتے، مسجدوں میں دعائیں مانگتے، بیانات دیا کرتے اور کبھی کبھی (مثلاً بلقان، طرابلس، خلافت وغیرہ کے بارے میں) چندے جمع کر لیا کرتے۔ یہ الفاظ یا پیسے متعلقہ مقامات تک پہنچتے یا نہ پہنچتے مسلمانوں کے دل کا بخار ضرور ہلکا ہو جاتا۔ اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ انگریز اور ہندو دونوں میں گھرے ہوئے تھے۔ اگر انگریز کے قوانین ان کے راستے میں حائل تھے تو ہندو نشر و اشاعت کے جملہ ذرائع و وسائل پر قابض تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا یہ قلبی اضطراب عملی سیاست کو چنداں متاثر نہیں کر سکا۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں نے جو تحریک ترکوں کی حمایت میں اٹھائی اس کی عظمت اور گہرائی سے سیاست کا کوئی طالب علم انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کا فائدہ ترکی کو کیا پہنچا؟ اس کا جواب کمال پاشا کے اس جواب میں ملے گا جو انہوں نے ان خلافتی رہنماؤں کو دیا جنہوں نے مسلمانوں کے شدت کرب کا نقشہ ان کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ صحیح ہے کہ آپ کے دنوں کی تپش اور شبوں کا گداز ترک بھائیوں کے لئے وقف رہا لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ترکوں کے خلاف میدان جنگ میں لڑنے والے سپاہی بھی آپ ہی کے ملک کے مسلمان تھے۔ یہ تصویر کا ایک رخ ضرور ہے لیکن یہ آئینہ ہے اس حقیقت کا کہ اپنی بساط کے مطابق یا اس سے بڑھ کر سب کچھ کرنے اور خود مبتلائے رنج و محن ہونے کے باوجود مسلمان ان برادران دین و ملت کو کوئی حقیقی فائدہ نہیں پہنچا سکے جن کے لئے انہوں نے اپنی زندگی اجیرن کر لی تھی۔ یہ اس لئے تھا کہ اُس زمانے میں مسلمان اپنی (داخلی یا خارجی) پالیسی آپ متعین نہیں کر سکتا تھا۔

دور غلامی میں یہ کچھ تو قابل فہم تھا لیکن پاکستان میں آزادی کے بعد جو کچھ ہوا وہ اس سے چنداں مختلف نہ تھا۔ آزادی سے نام اور مقام تو بدل گئے لیکن کہانی وہی رہی، اس کا تانا بانا بھی وہی رہا اور اس کا انجام بھی وہی ہوا۔ یہ حیران کن ضرور ہے کہ ہم آزاد تو ہو گئے لیکن آزادی نے ہمارے قلب و ذہن میں کوئی قابل ذکر تبدیلی پیدا نہیں کی۔ ہمارے اندر یہ تبدیلی پیدا کیوں نہیں ہو سکی یہ ایک الگ بحث ہے اور پیش نظر موضوع سے خارج۔ بہرحال ہوا یہی کہ جیسے بین الملی حوادث پر مسلمان جس طرح پہلے انفرادی طور پر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے تھے، آزادی کے بعد بھی وہ ایسے ہی کرنے لگے اور کرتے رہے۔ اور حد تو یہ ہے کہ خود ارباب حکومت کی طرف سے ایسا ہی مظاہرہ ہوتا رہا۔ مثلاً جب کوئی ایسا مسئلہ سامنے آیا جس کی زد کسی اسلامی ملک پر پڑتی تھی تو ہمارے نمائندوں کی طرف سے اقوام متحدہ میں یہ دن اس پر تقریریں کی گئیں جن میں آزادی، حق و انصاف، اقدار انسانیہ پر درس دیئے جاتے تھے۔ (ایسی تقریریں تقسیم سے پہلے اپنے ہاں کے پبلک جلسوں میں ہوا کرتی تھیں) ہمارے وزراء اور نمائندوں نے جو تقریریں اقوام متحدہ وغیرہ میں کیں ان کو جمع کیا جائے تو دفتروں کے دفتر تیار ہو سکتے ہیں۔ بیرون ملک تو یہ ہوا اور اندرون ملک کبھی موتمر اسلامی منعقد کی گئی، کبھی احتفال العلماء کا اہتمام کیا گیا۔ کبھی اسلامی اقتصادی کانفرنس کا ڈھونگ رچایا گیا اور کبھی مسلم نوجوانوں کی اسمبلی کا سوانگ بھر آگیا۔ یہ سب کچھ کم و بیش انفرادی طور پر ہوا۔ لیکن اگر واقعی یہ تماشے انفرادی طور پر ہوتے تو شاید ان سے اس قدر نقصان نہ پہنچتا۔ لیکن ہوا یہ کہ حکومت نے ان "تقریبات" کو "کامیاب" بنانے میں مدد بھی کی۔ مگر ذمہ دارانہ طور پر کبھی سامنے نہیں آئی۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ایک آزاد ملک کی حکومت کے لئے اس طرح زاہدانہ طور پر بزم شراب میں آنے کی کیا وجہ جواز ہو سکتی تھی؟ لیکن ہمارے پالیسی بنانے والوں نے صورت حال کو سمجھنے کی ذرہ بھر کوشش نہیں کی۔ اس کا دوہرا نقصان ہوا۔ اندرون ملک 'عام مسلمان' جو اس سے پہلے انتہائی خلوص سے مسلمانان عالم کے مصائب کو دور کرنے کے خیال سے ہر طرح ایثار کے لئے تیار ہو جایا کرتے تھے، وہ ان تقریبات کو سرکاری سمجھ کر بد دل ہوتے گئے، اور ان کی وابستگی محض تماشائیوں کی سی رہ گئی۔ اور بیرون ملک مخالفین پاکستان نے یہ پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا کہ پاکستان قیادت عالم اسلامی کے خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ کچھ ہوتا رہا اور کسی اللہ کے بندے کو یہ توفیق نصیب نہ ہوئی کہ وہ سوچتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور اس کا مداوا کیا ہے؟

اب دیکھئے کہ اس "پالیسی" کا نتیجہ کیا نکلا؟ ہمارا تعلق مسلمانان عالم اسلامی سے بڑا گہرا رہا ہے۔ یہاں تک کہ کرۂ ارض پر کہیں کسی مسلمان کے تلوے میں کانٹا بھی چبھ گیا تو ہمارے آنکھوں کے آبگینے میں آنسو چھلک آئے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد اس ردعمل میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور ہم بدستور یہ سمجھتے رہے کہ ہمارے اور مسلمانان عالم کے مابین اخوت و مودت کے گہرے روابط ہیں۔ ان روابط میں شبہ تو کوئی نہیں تھا لیکن آزاد مملکت کی حیثیت سے ان کو عملی شکل دینے کا جو موقع ہمیں ملا اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ اور تو اور جن مسلم ممالک کی ہم ہر مقدمہ میں وکالت کرتے رہے اور جن کی تائید و حمایت میں بڑھ چڑھ کر تقریریں کرتے رہے انہوں نے ہمیں کبھی نہ کہا کہ "آپ کا شکریہ!" اس احساس کے باوجود کہ ہم

ان کے مطالبات قومی کے مؤید رہے ہیں، انہوں نے کسی مسئلہ میں ہماری تائید نہیں کی۔ تائید کو تو چھوڑیئے، یہ ممالک الٹے ہمارے مخالف ہوتے گئے۔ چنانچہ آج مصر ہمارا ہمنوا نہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کی پالیسی ہندوستان کی پالیسی کے مطابق ہے۔ اس کا وزیر اعظم صاف طور پر کہہ رہا ہے کہ وہ اور پنڈت نہرو ایک طرح سوچتے ہیں اور ان کی اور ہندوستان کی پالیسی یکساں ہے۔ سعودی عرب بھی مصر ہی کی راہ پر گامزن ہے۔ اس کے والی، شاہ سعود، پاکستان تشریف لائے تو انہوں نے کہا تھا کہ وہ پاکستان کو اپنا وطن سمجھتے ہیں۔ اس کے باوصف وہ مصری مؤقف پر قائم ہیں۔ افغانستان ہمارا کھلا دشمن ہے۔ انڈونیشیا بھی ہندوستان کی غیر جانبدارانہ پالیسی کا مؤید ہے۔ ایران نے ہماری مہمان نوازیوں کے باوجود، اقوام متحدہ کی صدارت کے سلسلہ میں ہمارے مقابلہ میں اپنا امیدوار کھڑا کر دیا تھا۔

یہ ہے پاکستان کی حالت دنیائے اسلام میں۔ اس قریبی دائرہ سے باہر بھی پاکستان کا جو حال ہے، وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ پہلے برطانیہ کو لیجئے کہ جس کی دولت مشترکہ میں وہ شامل ہے (اور آزاد جمہوریہ ہونے کے بعد بھی غالباً شامل رہے گا) دولت مشترکہ کو ایک خاندان بتایا جاتا ہے لیکن اس خاندان کی صورت یہ ہے کہ اس کے افراد، پاکستان اور ہندوستان، ایک دوسرے سے کشمیر میں لڑتے رہے لیکن وہ اس جنگ کو بند نہیں کرا سکا۔ جنگ کے بعد اس خاندان نے کشمیر کے تصفیہ کے حل میں کسی قسم کی مدد نہیں دی۔ حل میں مدد دینا تو ایک طرف اس نے پاکستانی مؤقف کی حمایت تک نہیں کی۔ وزرائے اعظم کی تازہ کانفرنس میں جو اس سال جنوری میں منعقد ہوئی، ہمارے وزیر اعظم نے کشمیر کو خاندان دولت مشترکہ کا مسئلہ قرار دیا لیکن کسی کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور اس سے متعلق کچھ بات نہ ہو سکی۔ کشمیر کے مسئلہ کے علاوہ دیگر مسائل میں بھی برطانیہ، پاکستانی مطالبات کو کم سے کم خاطر میں لایا۔ لیکن اس کے برعکس ہندوستان کی خوشنودی علانیہ کرتا رہا۔ قائد اعظم نے اپنی حین حیات میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ دولت مشترکہ ضمانت دے کہ پاکستانی سرحدات محفوظ رہیں گی لیکن اس تجویز کو شائستۂ اعتناء سمجھا گیا۔ مرحوم لیاقت علی خاں نے کھلم کھلا شکایت کی تھی کہ برطانیہ نے فرض کر لیا ہے کہ پاکستان مٹی کا مادھو ہے اور وہ ہر وقت اس کی ہاں میں ہاں ملائے گا۔ دولت مشترکہ میں شریک رہنے سے پاکستان کو کیا فائدہ پہنچا ہے اور کیا نقصان، یہ علیحدہ مبحث ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کے نزدیک جو مسائل زندگی اور موت کے مترادف تھے ان کے حل میں اس کی رکنیت نے کوئی مدد نہیں دی۔ ایک برطانیہ ہی کیا کسی رکن دولت مشترکہ نے ہمارے مطالبات سے ہمدردی کا اظہار نہیں کیا۔

اس حلقہ سے آگے بڑھئے تو روس اور امریکہ کی باری آتی ہے۔ ہم نے روس سے ہٹ کر امریکہ سے دوستی کی طرح ڈالی اس سے فوجی مدد تک لے لی اور اس کی وجہ سے دنیا میں بدنام بھی ہوئے لیکن اس سے ہم امریکہ کو اپنا دوست ان معنوں میں نہیں بنا سکے کہ وہ بین الاقوامی مسائل میں ہمارے حق میں ووٹ دے۔ مثلاً کشمیر کے بارے میں ہمیں اس کی دوستانہ مدد حاصل نہیں ہو سکی اور ہم بین الاقوامی میدان میں تنہا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کشمیر کو اقوام متحدہ میں لیجانے سے جھجکتے ہیں اور ہندوستان کی جا و بیجا خوشامد کرتے رہتے ہیں کہ وہ مذاکرات باہمی سے اس کے حل پر آمادہ ہو جائے۔ پانی کے مسئلہ میں بھی امریکہ نے جو کچھ ہماری مدد کی ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

سطور بالا سے یہ تشویشناک صورت سامنے آتی ہے کہ پاکستان کی عالم اسلامی میں کوئی ساکھ نہیں۔ برطانیہ اس کا دوست نہیں۔ امریکہ اس کے حق میں کھلم کھلا ووٹ دینے کے لئے تیار نہیں۔ گویا وہ دنیائے سیاست میں بالکل تنہا اور بے یار و مددگار ہے۔ اس کی یہ تنہائی ایسے عالم میں ہے کہ روس اور امریکہ جیسے ممالک بھی تنہا رہنے کا تصور نہیں کر سکتے۔ تصور کرنا تو ایک طرف، وہ چھوٹی چھوٹی اقوام کو بھی اپنے ساتھ ملانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ کوئی اور ملک اس قدر تنہا ہوتا تو شاید وہ اپنے حواس کھو بیٹھتا کیونکہ اس سے اس کی بقا معرض خطر میں پڑ جاتی۔ لیکن ہمارے ارباب حکومت مگن ہیں کہ جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ یہ تنہائی دوسری قوموں سے ہٹ کر اور علیحدہ رہنے کی بدولت نہیں۔ پاکستان قریباً وہ سب کچھ کرتا رہا ہے جس سے اسے دیگر اقوام کی حمایت اور دوستی میسر آتی۔ لیکن اس کے باوصف نتیجہ وہ نکلا جو اب ہمارے سامنے ہے۔

اس اضطراب انگیز صورت حالات کی علت پاکستان کی بے عملی میں نہیں بلکہ اس کی بے مقصدی میں تلاش کرنی چاہئے۔ جیسا کہ شروع میں لکھا گیا ہے ارباب پاکستان نے آزادی کے بعد بھی اپنی سعی و عمل کا انداز وہی رکھا جو غلامی کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ جب کوئی بات سامنے آئی اس پر تقریر کر دی، بیان دے دیا، قرارداد پاس کر دی، اور بس۔ کسی نے یہ نہ سوچا کہ اب وہ آزاد حکومت کی حیثیت رکھتے ہیں اور آزاد حکومتیں محض تقریریں نہیں کیا کرتیں۔ کسی نے اس کا اندازہ نہیں لگایا کہ بہ حیثیت آزاد حکومت وہ کس قدر مؤثر ہو سکتے ہیں۔ بالخصوص جبکہ انہیں ایک ایسی پوزیشن حاصل ہے کہ وہ بین الاقوامی سیاست کا توازن بگاڑنے اور بنانے میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اس حیثیت سے پہلے دن ہمیں یہ طے کر لینا چاہئے تھا کہ بین الاقوامی سیاست میں ہمارا کردار کیا ہوگا۔ یعنی ہماری فارن پالیسی کیا ہوگی۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور ہوتا بھی کیسے؟ اس کے لئے یہ شعور ضروری تھا کہ ہمارے مقاصد کیا ہیں اور بین الاقوامی سیاست کے پس منظر میں ان کے حصول کی کون سی مناسب صورت ہے۔ اگر مقاصد واضح طور پر ہمارے سامنے ہوتے تو ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں مدد دیتے کہ عالمی بساط پر کون ہمارے دوست ہیں اور ان کی مدد کیسے کی جا سکتی ہے اور ان سے مدد کیسے لی جا سکتی ہے۔ ہم نے فارن پالیسی کا بدل لمبی چوڑی تقریروں کو سمجھ لیا جن میں حق و انصاف، انسانیت، آزادی وغیرہ بلند بانگ اقدار پر خطبے دیئے جاتے تھے۔ دوسری قومیں ہمارے یہ خطبے سنتی تھیں اور سر ہلاتی تھیں کیونکہ ان اقدار سے کسی کو انکار نہیں تھا۔ مثلاً کوئی قوم، بڑی سے بڑی استعماری قوم بھی، یہ نہیں کہتی کہ وہ کسی دوسری قوم کی آزادی سلب کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ انہی اقوام نے کمزور اور پس ماندہ اقوام کو غلام بنا رکھا ہے اور وہ انہیں آزادی دینے کے لئے تیار نہیں۔ تو گویا جب پاکستانی نمائندے اعلیٰ اقدار کے محاسن گنواتے تھے وہ بھی ان سے اتفاق کرتے تھے۔ لیکن جب معاملہ ووٹ شماری کا آتا تھا تو فیصلہ کچھ اور ہو جاتا تھا۔ اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ آجکل کی آزاد قومیں اقوام متحدہ میں شریک ہیں تو اپنے ملکی مفاد کی خاطر۔ وہ اسی بناء پر دوسری اقوام سے تعاون کرتی ہیں اور اسے کبھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔ اس کے برعکس پاکستان نے نہ اپنا مفاد متعین کیا، نہ دوسروں کا مفاد سمجھا اور نہ کوئی باہمی تعاون کی شعوری کوشش کی۔

سطور بالا سے یہ حقیقت بخوبی سامنے آ جاتی ہے کہ ہم نے اپنی کوئی فارن پالیسی متعین نہیں کی اور اس کی وجہ سے ایسا سخت نقصان اٹھایا جو محتاج تشریح نہیں۔ یہ تو غنیمت ہوا کہ اس دوران میں کوئی بین الاقوامی تصادم ایسا نہیں ہوا جس میں قومیں ایک دوسرے کے سامنے صف آراء ہو جاتیں۔ ایسا ہوتا تو ہمیں نظر آ جاتا کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔ بہرحال اب بھی وقت ہے کہ ہم سابقہ تجربہ کی روشنی میں حقیقت حال پر غور کریں اور اپنی فارن پالیسی متعین کریں۔ اس ضمن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہماری فارن پالیسی کے نقوش و خطوط کیا ہوں۔ نقشے پر دیکھنے سے یہ حقیقت بآسانی سامنے آ جاتی ہے کہ پاکستان کے قدرتی دوست وہ مسلمان ممالک ہیں جن کا سلسلہ مغربی پاکستان سے شروع ہو کر ایک طرف ترکی تک جاتا ہے اور دوسری طرف سویز کو عبور کرتا ہوا مغرب اقصیٰ کے انتہائی کونوں تک جا پہنچتا ہے۔ یہ علاقے پاکستان سے ملحق بھی ہیں اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کے باشندوں کے درمیان گہرے قلبی روابط ہیں۔ اس قلبی رشتے کے باوجود ان ممالک میں ملی اتحاد کی کوئی عملی صورت پیدا نہیں ہو سکی۔ اور ہوتی بھی کیسے؟ یہ غریب بھی ہیں اور کمزور بھی۔ اس کا علاج اتحاد میں ہے۔ لیکن اس کے خلاف کئی عناصر سرگرم عمل ہیں۔ سب سے پہلے عربوں کی شدید باہمی رقابت ہے۔ جب سے عثمانی خلافت کا خاتمہ ہوا ہے عالم اسلامی کی قیادت کے کئی دعویدار پیدا ہو گئے ہیں۔ سرفہرست مصر ہے جس کی رگ و پے میں ہوس قیادت سرایت کر چکی ہے۔ وہ دنیائے عرب کو دیکھتا ہے، پھر اس کے تصور کی حدود براعظم افریقہ کا احاطہ کرتی ہیں اور پھیلتے پھیلتے عالم اسلامی پر چھا جاتی ہیں۔ وہ خیال ہی خیال میں، عصر قدیم کے باجبروت و پرسطوت فرعونوں کو دیکھتا ہے اور اپنے آپ کو ان کا جانشین [illegible] اقوام کا لیڈر تصور کرتا ہے۔ وہ اس تصور کو متشکل کرنے کے لئے عربوں کے نسلی اتحاد کا نعرہ لگاتا ہے، افریقہ میں یورپی استعماریت کی مخالفت کرتا ہے اور عالم اسلامی کو غیر جانبداری کا سبز باغ دکھا کر اپنے پیچھے لگا لینا چاہتا ہے۔ اس کا عربی حریف ہاشمی خاندان ہے جس کے قبضے میں عراق اور اردن ہیں۔ قیادت کا تیسرا حریف سعودی عرب ہے جس نے خاندان ہاشم سے نجد و حجاز چھین لیا ہے۔ وہ اب رفتہ رفتہ مصر سے تعاون پر آمادہ ہو گیا ہے

تاکہ خاندان ہاشم کے مقابلے میں وہ قوی تر ہو جائے۔

اس رقابت کے علاوہ جو دو اور عناصر سرگرم عمل ہیں وہ ہندوستان اور روس ہیں۔ ہندوستان کا آلۂ کار مصر ہے، وہ اس کی ہوس قیادت کو ابھار ابھار کر اپنی جگہ پیدا کر رہا ہے۔ وہ اس میں اپنا فائدہ دیکھتا ہے کہ عرب مصری قیادت تسلیم کر لیں اور پاکستان سے کٹ جائیں۔ وہ ان ممالک میں اپنے قابل اور عیار ترین نمائندے بھیجتا ہے اور ان کو اس منزل کی طرف لیجانے میں بڑی بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ اس نے خصوصیت سے عربوں میں یہ پروپیگنڈہ کر رکھا ہے کہ پاکستان انگریز کا پیدا کردہ ہی نہیں بلکہ اب بھی اس کے ہاتھ میں کھیل رہا ہے، نیز وہ عالم اسلامی کی قیادت کا متمنی اور اس کے لئے کوشاں ہے۔ روس اپنے اغراض کے لئے مصروف عمل ہے لیکن سردست اس کا مفاد ہندوستان سے وابستہ ہے۔ چنانچہ وہ ہندوستان ہی کا راستہ صاف کر رہا ہے۔

پاکستان نے یہ سب کچھ دیکھا لیکن اس کا کچھ تدارک نہ سوچا۔ جہاں ہندوستان نے اپنے اہل ترین اور عیار ترین نمائندے بھیجے وہاں پاکستان نے بڑی غفلت اور بے خردی کا مظاہرہ کیا۔ ہمیں نام لینے کی ضرورت نہیں لیکن گذشتہ آٹھ سالوں میں جو جو پاکستانی سفیر اسلامی ممالک میں بھیجے گئے انہوں نے فضا کو اور خراب کیا۔ غالباً ایسے ہی ہونا چاہیئے تھا کیونکہ اگر ایک طرف ان نمائندوں میں تدبر کا فقدان اور جذبۂ صحیحہ کا افلاس تھا تو دوسری طرف خود حکومت پاکستان کے سامنے کوئی متعین پالیسی نہیں تھی جس پر ہمارے نمائندے عمل پیرا ہوتے۔ اس سے ممالک اسلامیہ اور پاکستان میں بعد بڑھتا گیا تا آنکہ حالت وہ ہو گئی جس کا نقشہ اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔

چونکہ پاکستان کے قدرتی دوست متصل اسلامی ممالک تھے اس لئے ضروری تھا کہ پاکستان اپنی پالیسی کی خشت اول یہ رکھتا کہ ان ممالک کو باہم متحد کرنا چاہیئے۔ یہ اتحاد بالکل قابل عمل ہے لیکن اس کی شکل احتفال یا موتمر وغیرہ میں نہیں بلکہ مسلم حکومتوں کے باہمی معاہدات میں ہے۔ اس کے لئے کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ ایک مرتبہ حکومت نے مسلم وزرائے اعظم کی کانفرنس کا اعلان کیا لیکن یہ تجویز بھی ایک سسکیوں اور ہچکیوں کے بعد اپنی موت آپ مر گئی اور نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی فارن پالیسی کا نقطۂ ماسکہ مسلمان ممالک کا حکومتی سطح پر "اتحاد" ہونا چاہیئے۔ "حکومتی سطح" پر نہ کہ ادبی، ثقافتی، احتفالی انداز میں انفرادی سطح پر۔ اس سے بین الاقوامی بساط پر اسلامی بلاک کے لئے قابل عزت جگہ بن جاتی ہے اور مشرق و مغرب کی کشمکش میں توازن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ یہاں سے فارن پالیسی کا دوسرا نقطہ سامنے آتا ہے۔ مسلمان ممالک معاشی اعتبار سے پس ماندہ ہیں اور عسکری لحاظ سے کمزور۔ اس کے لئے وہ مجبور ہیں کہ ترقی یافتہ اقوام سے مدد حاصل کریں۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ مدد انہیں امریکہ سے مل سکتی ہے اور روس سے نہیں مل سکتی۔ ایک تو روس مطلوبہ مدد دینے سے قاصر ہے، دوسرے اس کی مدد کے ساتھ اشتراکی غلبہ اور روسی استعماریت بھی آتی ہے۔ نیز اسلام اشتراکیت سے کوئی مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اس لئے جس امداد کے ساتھ اشتراکیت کے جراثیم بھی آتے ہوں وہ جسد ملت کے لئے کبھی وجۂ توانائی نہیں ہو سکتی۔ اندریں حالات مسلمانوں کا رجحان بحالات موجودہ امریکہ کی طرف ہی ہو سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مغربی اقوام سے ملنے میں یہ خدشہ پایا جاتا ہے کہ شاید ان اقوام کا اثر و رسوخ پھر سے بڑھ جائے جن سے مسلمانوں نے بصد دقت گلو خلاصی کرائی ہے لیکن جب ہم اس خدشہ کا حقائق کی روشنی میں مطالعہ کرتے ہیں تو صورت حالات ایسی تشویشناک نظر نہیں آتی۔ سب سے پہلے تو اس حقیقت کو سامنے رکھئے کہ ہم نے اور دوسرے مسلمان ممالک نے بہر حیث و بہر کیف غیر مسلم اقوام میں سے کسی نہ کسی سے مدد لینی ہے۔ اس کے سوا چارۂ کار ہی نہیں۔ جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے، سردست اس کے عزائم مستعمرانہ نظر نہیں آتے۔ دوسرے اسے اپنی غرض کے لئے ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ وہ ہمارے ساتھ مل کر خلاف اشتراکیت محاذ بنانا چاہتا ہے۔ اس اشتراک تعاون میں ایسا لین دین ہو سکتا ہے جس سے دونوں کا بھلا ہو۔ اگر اب تک اس کا کما حقہٗ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا تو اس کی وجہ یہی ہے کہ مسلمان ممالک نے انفرادی طور پر معاملہ بازی کی ہے اس سے وہ خسارے میں رہے ہیں۔ اگر مسلمان ملک مل کر ایک مشترکہ محاذ بنا لیں اور اپنے مقاصد کا ایک عمومی منشور تیار کر لیں تو امریکہ کی اس ضرورت سے جو اسے درپیش ہے، نہایت عمدہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ مسلم ممالک میں اس قدر نفسا نفسی ہے کہ انہوں نے اس طریق کار کو آزمایا تک بھی نہیں۔

گو سطور بالا میں اس کی وضاحت کی جا چکی ہے لیکن آخر میں ہم اسے دہرانا ضروری سمجھتے ہیں کہ فارن پالیسی محض اعلیٰ اخلاقی یا انسانی اقدار کا واسطہ دے دیکر التجائیں کرنے کا نام نہیں۔ بلکہ اپنے آپ کو مؤثر بنا کر دوسرے ممالک کی عملی حمایت حاصل کرنے کا نام ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے کشمیر کے معاملہ میں ہندوستان کا رویہ شروع سے لے کر اب تک ایسا رہا ہے جو اخلاقی اور آئینی اعتبار سے بڑا قابل اعتراض ہے۔ دوسری قومیں اسے تسلیم کرتی ہیں لیکن جب اقوام متحدہ میں ووٹ دینے کا وقت آتا ہے تو وہ ووٹ ہندوستان کے خلاف نہیں دیتیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی فارن پالیسی پاکستان کے مقابلہ میں کامیاب ہے۔ دوسری مثال اور دیکھئے امریکہ نے پاکستان کو فوجی مدد تو دی ہے لیکن اقوام متحدہ میں پاکستان کے حق میں ووٹ نہیں دیا۔ یہ امریکہ کی زیادتی نہیں بلکہ یہ نتیجہ ہے ہماری متعین فارن پالیسی کے نہ ہونے کا۔ اس پالیسی کا مطلب بین الاقوامی میدان میں معتمد دوست پیدا کرنا ہے۔ پاکستان ایسا نہیں کر سکا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اعلیٰ اخلاقی اور انسانی اقدار کو خیرباد کہہ کر دوسروں کی دوستی حاصل کی جائے۔ ہم یقیناً اس انداز سیاست کے کھلے ہوئے دشمن ہیں اور پاکستانی قائدین کو کبھی یہ مشورہ نہیں دیں گے کہ وہ اپنی پالیسی کو ان اقدار سے علیحدہ کر لیں۔ ہم نے تو پاکستان حاصل ہی اس لئے کیا ہے کہ ان اخلاقی اقدار کی عظمت کو برقرار رکھا جائے۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ محض بلند اصولوں کی مالا جپتے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ یہ حقیقت ایک گونہ موجب اطمینان ہے کہ سات آٹھ سال کی ناکامیوں اور نامرادیوں کے بعد اب ہماری حکومت کی نگاہوں کا رخ کچھ اس سمت کو بدلا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ پاکستان ترکی سے معاہدہ بھی کر چکا ہے اور عراقی ترکی معاہدے میں شرکت کی بھی سوچ رہا ہے۔ مانٹریو کی کانفرنس بھی جسے وزیر اعظم پاکستان نے حال ہی میں طلب کیا تھا اور جس میں مشرق وسطیٰ کے پاکستانی سفیر شریک ہوئے تھے، اس احساس کی مظہر دکھائی دیتی ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اس کانفرنس میں کیا ہوا اور اس کے اثرات کیا ہوں گے۔ لیکن ہم محسوس کرتے ہیں کہ اگر اس میں ان خطوط کو پیش نظر رکھا گیا ہے جن پر اوپر بحث کی گئی ہے اور اس کے مطابق فارن پالیسی مرتب کی گئی ہے تو اس کانفرنس کے نتائج یقیناً دوررس ہوں گے۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

ایشیائی افریقی کانفرنس

مقالہ افتتاحیہ میں تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے کہ پاکستان کی کوئی متعین فارن پالیسی نہیں۔ غالباً اس کی بین ترین (اور بدترین) مثال ایشیائی افریقی (بنڈونگ) کانفرنس ہے۔ پاکستان اس میں شریک ہی نہیں بلکہ اس کے داعی ممالک میں سے ہے حالانکہ پس منظر و پیش نہاد کے مطابق یہ اس موقف کی ضد ہے جو پاکستان کا ہو چکا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ گذشتہ سال جب کوریا کی سیاسی کانفرنس کی تشکیل ہوئی تو ہندوستان نے بڑے جتن کئے کہ اسے کانفرنس میں شریک کر لیا جائے لیکن امریکہ نے اسے نشست دینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اسے ڈر تھا کہ ہندوستان اشتراکیوں کے مطلب کی بات کرے گا۔ ہندوستان اس شکست کا انتقام لینے کی فکر میں رہا تا آنکہ اپریل ۱۹۵۴ء میں جنیوا میں ایک عالمی کانفرنس منعقد ہوئی جس کا محور ہند چینی کی جنگ تھی۔ پنڈت نہرو نے عین اسی موقع پر کولمبو میں سیلون، برما، پاکستان، انڈونیشیا اور ہندوستان کی (جو بعد میں کولمبو ممالک کہلائے) ایک کانفرنس طلب کی۔ انہوں نے اس کانفرنس میں دنیا کو یہ جتانا چاہا کہ ہند چینی میں بہترین ثالث وہی ہو سکتے ہیں۔ اتفاق سے پاکستان نے اس کی مخالفت کر کے یہ ثابت کر دیا کہ پنڈت جی نہ ایشیا کا دماغ ہیں نہ زبان۔ اس وقت پنڈت جی کو اندازہ ہوا کہ مختصر سی کانفرنس میں اپنی بات منوانا مشکل ہے۔ چنانچہ ان کے ذہن رسا نے کولمبو ممالک کی کانفرنس کو وسیع تر بنانے کا منصوبہ تیار کیا۔ بنڈونگ کانفرنس اسی کا نتیجہ ہے۔ اس میں کم و بیش تیس ممالک شریک ہو رہے ہیں جن میں کوئی قدر مشترک نہیں اور ان کے سیاسی موقف جداگانہ ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جنہوں نے سرخ چین کو تسلیم تک نہیں کیا۔ یہ کانفرنس صحیح معنوں میں بھان متی کا کنبہ ہے۔ اس کا کوئی ایجنڈا نہیں نہ ہی مدعوین یا شرکاء کا یہ خیال ہے کہ اس میں کوئی فیصلے کئے جائیں (ضمناً، اگر فیصلے کر بھی لئے جائیں تو ان پر عمل درآمد کرانے کی کوئی صورت نہیں۔ ان حالات میں بظاہر کانفرنس نشستند و گفتند و برخاستند سے آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ لیکن نہیں، اس کا انعقاد خالی از علت نہیں۔ ہندوستان متضاد نکر

وخیال کی قوتوں کو اکٹھا کرکے پاکستان جیسے ملکوں کی مخالفت کو مخالفت کو عوامی نعروں سے دبا دینا چاہتا ہے۔ "ایشیا ایشیا والوں کے لئے ہے"، "ہم جنگ میں غیر جانبدار رہیں گے"، "استعماریت مردہ باد" وغیرہ۔ کون شخص ہوگا جو ان نعروں کی مخالفت کی جرأت کرے گا! لیکن ان کا مفہوم کیا ہے! اس دورہ کے شروع میں جاپان نے "ایشیا ایشیا والوں کے لئے" کا نعرہ بلند کیا تھا، تو اس نے رفتہ رفتہ تیاری کرکے بالآخر مشرق بعید اور جنوب مشرقی ایشیا پر قبضہ کرلیا تھا۔ بعینہٖ یہی خواب ہندوستان دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایشیا کا قائد سمجھتا ہے۔ لیکن جب تک امریکہ اور برطانیہ یہاں موجود ہیں، اس کی قیادت خطرے میں ہے۔ لہٰذا وہ ایشیا کو ان سے خالی دیکھنا چاہتا ہے۔ سرخ چین کے عزائم بھی ایسے ہی ہیں، اس سے ہندوستان اور چین میں رقابت شروع ہوگئی ہے، لیکن دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے ایشیا کو اقوام مغرب سے خالی کرانا چاہیئے، چنانچہ اپنی اپنی قیادت کا راستہ صاف کرتے ہوئے بھی وہ اس اساسی مطالبہ پر متفق ہیں۔ چین کے لئے اس کانفرنس کا ایک اور پہلو بھی ہے، گو اسے بہت سے ممالک نے تسلیم نہیں کیا اور وہ باوجود سعی بسیار اقوام متحدہ کا رکن نہیں بن سکا، تاہم یہ پہلا موقعہ ہے کہ وہ اتنی عظیم کانفرنس میں شرکت کا فخر حاصل کر رہا ہے۔ جو کرۂ ارض کی نصف آبادی کی نمائندہ ہے۔ وہ اس کا یوں فائدہ اٹھا سکے گا کہ ایک طرف فارموسا کے معاملہ میں امریکہ کو جنگ پسند ثابت کردے اور دوسری طرف اپنے حق میں اخلاقی فضا پیدا کرے۔

اس کانفرنس کو پاکستانی سیاست کی روشنی میں دیکھیں جائے تو اس کی کوئی کل سیدھی نظر نہیں آئے گی۔ مثلاً پاکستان سیٹو (SEATO) کا رکن ہے۔ اس معاہدہ دفاع میں امریکہ سمیت آٹھ قومیں ہیں اور اس کا واضح مقصد اشتراکی جارحیت کی روک تھام ہے۔ ہندوستان اس میں شریک نہیں کیونکہ جو تنظیم ایشیائی اقوام کو امریکہ جیسے ملک سے وابستہ کردے، ہندوستان کبھی پسند نہیں کرسکتا۔ اس سے اس کی ہوسِ قیادت کو زبردست صدمہ پہنچتا ہے۔ چین تو اور زیادہ شدت سے اس کا مخالف ہے، وہ اس معاہدہ کو امریکہ کی جنگی تیاری کا نام دیتا ہے، اور صاف طور پر اپنے خلاف قرار دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کانفرنس میں ہندوستان اور چین شامل ہوں گے، اس میں سیٹو کے حق میں کوئی کلمۂ خیر نہیں کہا جاسکے گا۔ یہ ممکن ہے کہ اس میں کوئی قرارداد مذمت بھی منظور نہیں کی جائے گی۔ لیکن پاکستان کے پاس اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ "ایشیا ایشیا والوں کے لئے ہے" قسم کے نعروں کے شور میں ایشیا اور افریقہ کی قوموں کو یہ جتا سکے گا کہ اس نے ایک ایشیائی ملک ہونے کے باوجود سیٹو کی شرکت سے اقوام مغرب کے ساتھ جو رابطہ اتحاد قائم کیا ہے۔ یہ فیصلہ بالکل حق بجانب اور درست ہے اور دوسرے ممالک کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ یہ خطرہ اور زیادہ یقینی ہو جاتا ہے کیونکہ پاکستان نے ہم خیالوں کا ایسا محاذ قائم نہیں کیا۔ جو اس کے موقف کی تائید کریں! ان حالات میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان نے اس کانفرنس کے ممکنات کو کماحقہٗ دیکھے بغیر اس کی تجویز کو قبول کرلیا۔ پاکستانی نقطۂ نگاہ سے ایسی بے ہنگم کانفرنس کی مطلقاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہمیں ڈر ہے کہ اس سے پاکستانی موقف کو شدید نقصان پہنچے گا۔ اس نقصان کو کم سے کم کرنے کے لئے پاکستان کو بڑی ہوشیاری اور بیدار مغزی سے کام لینا ہوگا۔ وہ اگر ان ممالک کو جو پاکستانی موقف کے مؤید ہیں، اکٹھا کرلے اور وہ سب مل کر ایک متحدہ محاذ قائم کرلیں تو گو وہ اقلیت میں ہوں گے مگر وہ اپنے آپ کو بہت حد تک مؤثر بنا سکیں گے اور دوسروں کو مجبور کرسکیں گے کہ وہ ان کی بات سنیں۔ یہ نہ کیا گیا تو پاکستان اس ہجوم مخالف میں تنہا ہوگا۔

اس کانفرنس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہمارے وزیراعظم نے ۱۰ اپریل کو ایک بیان میں کہا

"ہم نے اپنی تجویزیں تیار کرلی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ ہماری اپنی فارن پالیسی ہے۔"

ہم اپنی گذارشات کے بعد اس بیان پر کوئی تبصرہ نہیں کرتے۔ البتہ کانفرنس کی روئداد سے اندازہ لگائیں گے کہ ان بظاہر خوش کن الفاظ میں کس قدر صداقت اور حقیقت ہے، اور کون سا موقعہ ایسا ہوا ہے جس میں ہمارے قائدین کی طرف سے ہمارے کانوں میں اس قسم کے خوش کن الفاظ نہیں پہنچے اور تاریخ نے ان کی تکذیب نہیں کردی۔

مجرمانہ خاموشی

یہ فیصلہ کرلیا گیا ہے کہ ہمارے اقلیتی وزیر مسٹر غیاث الدین

پٹھان اور ہندوستان کے نائب وزیر امور خارجہ مسٹر اے، کے چندہ مغربی بنگال، مشرقی پاکستان اور تری پورہ کا دورہ کرکے ہندو اقلیت کے حالات کا مطالعہ کریں۔ ہم ۲ اپریل کی اشاعت میں اس بے بنیاد ہندوستانی پروپیگنڈے کا تفصیلی جائزہ لے چکے ہیں کہ ہندو مشرقی پاکستان چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں لہٰذا اس وقت ہم تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ ہم اس وقت پٹھان صاحب اور حکومت پاکستان کو یہ جتانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے اس دورے پر آمادگی کا اظہار کرنے کے لئے دنیا کے سامنے یہ اعتراف کرلیا ہے کہ مسلمان جو ہندوستان میں امن و عافیت سے بس رہے ہیں، وہ اپنا وطن قطعاً نہیں چھوڑ رہے لیکن ہندوؤں کا پاکستان میں رہنا دشوار ہے۔ وہ یہاں سے بھاگ رہے ہیں۔

ہمیں اس دورے پر کوئی اصولی اعتراض نہیں کیونکہ ہم دنیا کی نگاہوں سے کچھ چھپانا نہیں چاہتے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہندوستان سے لاکھوں کی تعداد میں جو مسلمان مسلسل پاکستان آرہے ہیں، ان کے حالات و کوائف کا مطالعہ کیوں ضروری نہیں سمجھا جاتا؟ کیا پانچ سالوں میں ساڑھے پانچ لاکھ سے اوپر مہاجرین کا پاکستان صرف ایک راستے یعنی کھوکھراپار سے آجانا اور ان کا بدستور آتے چلے جانا تشویشناک لہٰذا لائق تفتیش و تحقیق نہیں؟ ہندوستان کی خاموشی اس معاملہ میں قابل فہم ہے لیکن ہمارے اقلیتی وزیر کیوں منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے ہوئے ہیں؟ یہ خاموشی مجرمانہ ہے۔ کس قدر افسوسناک اور قلق انگیز ہے یہ صورت حال کہ ہندوستان کی طرف سے ذرا سا شور اٹھتا ہے تو ہمارے ارباب حکومت محبت سے ملزمین کے کٹہرے میں کھڑے ہوکر اپنی مدافعت کرنا شروع کردیتے ہیں، اور ہندوستان سے اتنا بھی نہیں کہتے کہ ہم پر یہ الزام لگاتے وقت تمہیں شرم نہیں آتی؟ تمہیں دوسروں کی آنکھ کا تنکا تو نظر آجاتا ہے لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر کبھی دکھائی نہیں دیتا!

اقبال نمبر

طلوع اسلام کا آئندہ شمارہ بابت ۲۳ اپریل تماماً علامہ اقبال سے متعلق مضامین پر مشتمل ہوگا۔ یوں تو طلوع اسلام علامہ اقبال ہی کی یادگار میں شائع کیا گیا ہے اور اس کی ہر اشاعت انہی کے پیغام کی علمبردار ہوتی ہے جو قرآنی اصولوں پر مبنی ہے لیکن چونکہ ۲۱ اپریل آپ کا یوم وفات ہے اور یہ دن اس حیثیت سے منایا جاتا ہے۔ اس موقعہ پر طلوع اسلام نے علامہ اقبال کی تعلیمات سے متعلق متفرق گوشوں پر منتشر مضامین کو اس اشاعت میں جمع کردیا ہے، ہوسکتا ہے کہ اس اشاعت کی ضخامت عام اشاعتوں سے بڑھ جائے لیکن قیمت بہرحال زیادہ نہیں ہوگی یعنی وہی چار آنے۔

ایجنٹ حضرات جتنی کاپیاں زیادہ منگوانا چاہیں، از راہ کرم ہمیں فی الفور مطلع کریں۔ تاکہ مطلوبہ تعداد کے مطابق پرچے چھاپے جائیں۔ تاخیر کی صورت میں ان کی مانگ کو پورا کرنا آسان نہیں ہوگا۔

یہ پرچہ جس پر ہفتہ (یعنی ۲۳ اپریل) کی تاریخ ہوگی، حسب معمول منگل کو پریس میں بھیج دیا جائے گا۔ اور تیار ہوکر جمعرات (۲۱ اپریل) کو کراچی میں بھی تقسیم ہوجائے گا، اور ڈاک کے سپرد بھی کردیا جائے گا۔ ضمناً عام قارئین کی اطلاع کے لئے گذارش ہے کہ کتابت اور طباعت کی سست رفتاری کی وجہ سے ہر پرچہ جس پر تاریخ ہفتے کی ہوتی ہے منگل کی شام تک مرتب کرکے پریس میں بھیج دیتے ہیں، جہاں سے چھپ کر بدھ کی شام کو دفتر کے پاس کٹائی اور جزبندی کے لئے پہنچ جاتا ہے۔ جمعرات کو پرچہ کراچی میں تقسیم ہوجاتا ہے اور ڈاک خانے میں بھی دے دیا جاتا ہے، طلوع اسلام کے ہفتہ واری تبصرے انہی دنوں کے مطابق ہوتے ہیں، لہٰذا قارئین پڑھتے وقت اسے پیش نظر رکھیں کہ ہفتہ کی تاریخ والے پرچے میں زیادہ سے زیادہ سابقہ منگل کی صبح تک کا تبصرہ شامل ہوسکتا ہے۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

پرویز صاحب

یوم اقبالؒ کے سلسلہ میں ڈھاکہ تشریف لے جانے کا قصد رکھتے ہیں اگر وہ تشریف لے گئے تو محترم ایس، این باقر صاحب [illegible]

تاریخی شواہد

(۱)

باقی رہا یہ کہ حضرت نوحؑ نے اپنی دعا میں یہ کہا تھا کہ

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ (۷۱/۲۶)

اے میرے رب ان نہ ماننے والوں میں سے کسی کو بھی ارض پر باقی نہ چھوڑ۔

تو اس میں (الارض) سے مراد تمام صفحۂ ارض نہیں بلکہ وہ ملک ہے جس میں وہ قوم بستی تھی۔ قرآن کریم میں متعدد شواہد موجود ہیں جن میں "الارض" سے مراد ایک خاص علاقہ ہے۔ مثلاً قصۂ حضرت موسیٰؑ میں فرمایا ہے کہ

وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْأَرْضِ (۱۰/۸۳)

اور اس میں شک نہیں کہ فرعون ملک (مصر) میں بڑا ہی سرکش بادشاہ تھا۔

یہاں الارض ملک مصر کے معنے آیا ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ فرعون کی سرکشی اور تمرد اور غلبہ و تسلط تمام روئے زمین پر نہیں تھا بلکہ ایک خاص ملک کے اندر محدود تھا۔ اسی طرح حضرت داؤدؑ کے متعلق فرمایا:

يٰدَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (۳۸/۲۶)

اے داؤد ہم نے تجھے ملک (ارض) میں حاکم بنایا ہے۔ سو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔

یہاں بھی ظاہر ہے کہ حضرت داؤد کی سلطنت تمام صفحۂ ارض پر نہیں تھی۔ بلکہ ایک خاص خطۂ ملک میں تھی۔ لہٰذا ان مقامات میں الارض سے مراد تمام روئے زمین نہیں بلکہ وہ خاص علاقہ ہے جس سے واقعہ زیرِ نظر کا تعلق ہے۔ یہی مفہوم قصۂ حضرت نوحؑ میں "الارض" سے ہے۔

حضرت نوحؑ کی عمر کے متعلق قرآن کریم میں ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ۝ (۲۹/۱۴)

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان میں پچاس برس کم ہزار سال رہا۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت نوح کی عمر ساڑھے نو سو سال کی تھی؟ اگر تورات کی طرف جائیے تو حضرت نوح آدم سے دسویں پشت میں آتے ہیں اور ان تمام کی عمریں آٹھ آٹھ، نو نو سال کی لکھی ہیں۔ چین کے مذہب (TAOISM) کا ایک بہت بڑا مبلغ (KWANG) جو چوتھی صدی قبل مسیح میں گذرا ہے۔ وہ یہ بتلانے کے بعد کہ عمر بڑھانے کا کیا طریقہ ہے، لکھتا ہے کہ

میں بارہ سو سال سے اسی طریق[1] کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہوں اور اس پر بھی میرا جسم روبہ انحطاط نہیں ہوا۔

لیکن قدیم زمانہ کی تاریخ میں بادشاہوں کی عمریں عام طور پر بہت ہی لمبی لکھی گئی ہیں۔ اب ان روایات سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں کسی مورثِ اعلیٰ کی عمر سے مقصود یہ ہوتا تھا کہ اس کے خاندان میں حکومت کتنے عرصہ تک رہی۔ یہ عرصۂ حکومت اس مورثِ اعلیٰ کی عمر لکھا جاتا تھا۔ یعنی خاندان کے بجائے خاندان کے مورثِ اعلیٰ کا نام ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے قیاس یہی ہے کہ حضرت نوحؑ کی عمر سے مراد وہ زمانہ ہے جس میں ان کی تعلیم جاری رہی۔ زیرِ نظر آیت میں ہے فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا (۲۹/۱۴) اس میں ایک ہزار کے ساتھ سَنَةٍ کا لفظ آیا ہے اور خَمْسِيْنَ کے ساتھ عَامًا کا۔ سنۃ اور عاماً دونوں کے معنی سال ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ سنۃ بالعموم اس سال کو کہتے ہیں جس میں سختیاں آئیں اور عاماً خوش حالی کے سال کو کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس آیت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی تعلیم پہلے پچاس سال تو نہایت عمدگی سے جاری رہی لیکن اس کے بعد ان کے متبعین پر سختیوں کا دور شروع ہو گیا۔

اس ساڑھے نو سو برس کی مدت کو حضرت نوح کے زمانۂ شریعت پر اس لئے بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مندرجہ صدر آیت کے بعد ہی حضرت ابراہیمؑ کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور تورات کی رُو سے حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں نو سو باون سال کا فرق ہے۔ اگرچہ خود تورات اور تاریخ کے دیگر شواہد کی روشنی میں دیکھا جائے تو حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ قریب اڑھائی ہزار سال قبل مسیح تک متعین ہوتا ہے۔ بہرحال یہ ہنوز تاریخ کے قیاسات ہیں اور چونکہ قرآن نے ان حضرات کے زمانہ کے متعلق بحث نہیں کی اس لئے ان قیاسات میں سے جو بھی حقیقت کے قریب ہوں (یا بعد کے انکشافات انہیں ایسا ثابت کر دیں) انہیں درست سمجھا جائے گا۔

یہ ہے قوم نوحؑ کی وہ داستان عبرت انگیز جسے اللہ تعالیٰ نے حضور پر وحی فرمایا

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۚ فَاصْبِرْ ۚ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (۱۱/۴۹)

(اے پیغمبر!) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جسے ہم وحی کے ذریعے تجھے بتلا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تو یہ باتیں تو جانتا تھا اور نہ تیری قوم۔ پس تو ان تاریخی شواہد کی روشنی میں اپنے منصب پر استقامت سے جما رہ۔

عیسائی معترضین اکثر کہا کرتے ہیں کہ حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے قصے نبی اکرمؐ کے زمانے میں عام طور پر مشہور تھے اور یہود اور عیسائی علماء اکثر ان کا تذکرہ کرتے رہتے تھے اس لئے حضور اور اہل عرب ان سے واقف تھے پھر یہ کہنا کس طرح درست ہے کہ یہ وہ امور غیب ہیں جن سے نہ نبی اکرمؐ آگاہ تھے نہ ان کی قوم؟ اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانے کے لوگ ان قصص کی عمومی حیثیت سے متعارف تھے لیکن جو تفاصیل قرآن کریم نے بیان فرمائی ہیں، نہ صرف یہ کہ وہ زبان زدِ خلائق ہی نہ تھیں بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کے لٹریچر میں بھی موجود نہ تھیں۔ قصۂ قوم نوح کا ماخذ تورات ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن ذرا تورات کے بیان کردہ قصے اور قرآن کریم کا مقابلہ کر کے دیکھئے حقیقت واضح طور پر سامنے آجائے گی کہ (موجودہ) تورات کے بیان میں ذہن انسانی کی فسانہ طرازی کا کس قدر دخل ہے۔ اور قرآن کریم کے بیان میں کس قدر صداقت و پاکیزگی ہے۔ قصص قرآن کا ایک خاص اسلوب یہ ہے کہ ان سے مورخانہ تاریخ نگاری مقصود نہیں ہوتی، بلکہ قصہ کی صرف وہی کڑیاں بیان کی جاتی ہیں جن سے کوئی نہ کوئی اہم نتیجہ اخذ کیا جانا مطلوب ہو۔ قصۂ قوم نوح میں اہم نقاط یہ ہیں کہ حضرت نوح نے اپنی قوم کو خدائے واحد کی اطاعت کی دعوت دی۔ قوم کے سرکش اور متمرد طبقہ نے اس دعوت کی تکذیب و مخالفت کی اور جب پانی سر سے گزر گیا تو ان کے ان جرائم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے انہیں طوفان کے ذریعے ہلاک کر دیا۔ اب دیکھئے کہ بائبل اس طوفان کی وجہ کیا بیان کرتی ہے۔ تورات کی کتاب پیدائش میں ہے

اور خداوند خدا نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اس کے دل کے تصور اور خیال روز بروز صرف بد ہی ہوتے ہیں ؀ تب خداوند زمین پر انسان کے پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دل گیر ہوا ؀ اور خداوند نے کہا کہ میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا زمین پر سے مٹا ڈالوں گا۔ انسان کو اور حیوان کو بھی۔ اور کیڑے مکوڑے اور آسمان کے پرندوں تک۔ کیونکہ میں ان کے بنانے سے پچھتاتا ہوں ؀ مگر نوح پر خدا کے مہربانی کی نظر کی۔ (پیدائش ۵ – ۷)

ذرا غور فرمائیے۔ تورات کا بیان یہ ہے کہ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خالقِ ارض و سماوات نے بنانے کو تو یہ مخلوق بنا دی لیکن بنانے کے بعد اس پر سخت پشیمان اور متاسف ہوا اس لئے اس نے فیصلہ کر دیا کہ میں اپنی مخلوق کو صفحۂ ارض سے نابود کر دوں گا۔ یہ تھا وہ "مقصد عظیم" جس کے لئے طوفانِ نوح برپا کیا گیا۔

اسلامی معاشرت
مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ صفحات ۱۹۲
قیمت دو روپے

---

[1] SACRED BOOKS OF The EAST. (Taoism) Trnslated By JAMES Legge p. 26.

قرآن کی عورت

(۱۰)

(۲) وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (بنی اسرائیل ع ۳ و ۴)

اور تمہارا پروردگار تم کو حکم دیتا ہے کہ:-

(الف) بجز اللہ کے کسی کی اطاعت و فرماں پذیری قبول مت کرو۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۝

(ب) اور تم ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کیا کرو اور اگر وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں۔ سو ان کی کسی بات پر اُف تک نہ کرنا۔ اور نہ کسی بات پر جھڑکنا اور ان سے نہایت ادب سے گفتگو کرنا اور ان کے سامنے شفقت و انکساری کے ساتھ جھکے رہنا اور ان کے لئے یوں دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار! ان دونوں پر رحمت فرما جیسا کہ انہوں نے میرے بچپن میں تربیت فرمائی ہے۔ تمہارا رب تمہارے ما فی الضمیر کو خوب جانتا ہے۔ اگر تم سعادتمند ہو تو وہ خدا کے قانون کی طرف رجوع کرنے والوں کو سامان حفاظت عطا کرنے والا ہے

(ج) وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ

اور قرابت داروں کو ان کا حق

(د) وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ

اور محتاجوں اور مسافروں کے حقوق ضرور ادا کرتے رہنا۔

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۝

(ہ) اور بے موقع پیسہ نہ اڑانا۔ بے شک بے موقع اڑانے والے شیطان کے بھائی بند ہیں اور شیطان تو اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے ہی۔

وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاۗءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ۝

(و) اور اگر کسی کو دینے کے لئے پیسے نہ ہوں اور تم کو تنگدستی ہو اور تم اپنے پروردگار کی مہربانی کی راہ دیکھ رہے ہو اور اس وجہ سے تمہیں ان حقداروں سے منہ پھیرنا پڑے، تو تم کو چاہیے کہ نرمی کے ساتھ ان سے معذرت کر کے ان کو سمجھا دو۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝

سختی سے پیش نہ آؤ۔ اور دیکھو احسان و سلوک اور خیر خیرات کے معاملے میں نہ تو ایک دم ہاتھ روک ہی لینا چاہیئے اور نہ بالکل ہی پھیلا دینا چاہیئے۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ یہ نکلے گا کہ الزام خوردہ اور تہی دست ہو کر بیٹھ رہو گے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ۝

بیشک تمہارا پروردگار جس کو چاہتا ہے زیادہ رزق دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے تنگدستی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ بلا شبہ وہ اپنے بندوں کو خوب جانتا، دیکھتا ہے

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝

(ز) اور اپنی اولاد کو ناداری کے ڈر سے قتل نہ کرنا ان کو اور تم کو ہم ہی رزق دیتے ہیں اس کے علاوہ اولاد کا مار ڈالنا بڑا بھاری گناہ ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝

(ح) اور زنا کے تو پاس بھی نہ پھٹکنا۔ بلا شبہ وہ بڑی ہی بے حیائی کا فعل ہے اور بہت بری راہ ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝

(ط) اور کسی بھی ایسے شخص کو ناحق جان سے نہ مارو۔ جسے قتل کرنا اللہ نے حرام کر دیا ہے اور جو شخص ناحق قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے وارث کو قصاص کا حق دیا ہے۔ سو اس کو بھی چاہیئے کہ خونریزی میں زیادتی نہ کرے اور حد سے بڑھ نہ جائے حد کے اندر رہنے میں فتحمند ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝

(ی) اور یتیم کے مال کے پاس نہ جانا۔ ہاں مگر یہ کہ ایسے طریقہ پر جو کہ مستحسن ہو۔ یہاں تک کہ وہ سن بلوغ کو پہنچ جائیں، اور تم ان کی امانت ان کے حوالہ کر دو۔ اور جو عہد کیا کرو اس کو ضرور پورا کیا کرو۔ عہد کے بارے میں یقیناً تم سے بازپرس ہوگی۔

(ک) اور جب کوئی چیز ناپو اور تولو تو پورا پورا ناپو اور صحیح ترازو سے ٹھیک ٹھیک تولو۔ کہ یہی عمدہ بات ہے اور انجام بھی اسی کا اچھا ہوگا۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ مَسْـُٔـوْلًا ۝

(ل) اور جس بات کا تم کو علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو۔ یاد رکھو کہ کان، آنکھ اور عقل (یا دل)، سب کے بارے میں ہر شخص سے بازپرس ہوگی۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ۝ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۭ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝

(م) اور زمین پر اکڑ کے اور اترا کے نہ چلا کرو کیونکہ نہ تو تم زمین ہی کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کی لمبائی تک تم پہنچ سکتے ہو۔

یہ سارے برے کام بطور خاص تمہارے پروردگار کے نزدیک حد درجہ ناپسندیدہ ہیں اور یہ باتیں اس حکمت میں کی ہیں جو تمہارے پروردگار نے وحی کے ذریعے سے تم کو بھیجی ہیں۔ اور ہاں خدائے برحق کے ساتھ کوئی اور قبلۂ اطاعت نہ تجویز کر لینا۔ ورنہ تم الزام خوردہ اور راندہ کر کے ایسے ماحول میں پھینک دیئے جاؤ گے جہاں انسانیت ذبح کی جاتی ہوگی۔

(بنی اسرائیل رکوع ۳ و ۴)

مجلسِ اقبال

[اس وقت تک "خودی" کے متعلق مختلف گوشوں سے اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ ہمارے خیال میں، اب اس حقیقت کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوگی کہ خودی سے اقبال کی مراد کیا ہے۔ اس کے بعد، اصل کتاب (مثنوی اسرارِ خودی) کی تشریح شروع ہو جانی چاہئے تھی۔ لیکن زیرِ نظر شمارہ کے بعد، اگلا پرچہ خود اقبال نمبر ہوگا جس میں پیامِ اقبال کے متنوع گوشوں کو سامنے لایا جائے گا۔ اندریں حالات مناسب یہی سمجھا گیا ہے کہ مثنوی کا آغاز اس کے بعد ہو تاکہ اس کے تسلسل میں فرق نہ آئے۔ زیرِ نظر شمارہ میں خودی کا وہ مفہوم پیش کیا جاتا ہے جسے ضربِ کلیم کے عربی ترجمہ (از محترم ڈاکٹر عبدالوہاب عزام مدظلہٗ) کے مقدمہ میں، پرویز صاحب نے لکھا تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس موضوع پر اس کے بعد کچھ اور لکھنے کی ضرورت نہیں۔ طلوعِ اسلام]

اقبال کے عمومی مطالعہ کے ضمن میں ایک چیز ایسی ہے جسے مدِنظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ شاعری میں عربی اور فارسی لغت کے اکثر الفاظ ایسے ہیں جنہیں وہ ان کے لغوی معنوں میں استعمال نہیں کرتا۔ بلکہ وہ کلامِ اقبال کی خاص اصطلاحات ہیں۔ جب تک ان الفاظ کے اصطلاحی معانی سمجھ میں نہ آئیں، اقبال کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آسکتا۔ مثلاً علم و عشق، عقل و دل، ذکر و فکر، خبر و نظر، سوز و ساز، یار و دلش، قلندر، مردِ حُر۔ الفاظ اسی قبیل کے ہیں۔ یہ تمام اصطلاحات اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن وہ اصطلاح جو فکرِ اقبال میں محور کا حکم رکھتی ہے اور جس کے گرد اس کا سارا کلام گردش کرتا ہے۔ خودی ہے۔ اقبال سے پہلے یہ لفظ ہمارے ہاں غرور اور تکبر کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ لیکن اقبال نے اسے بالکل جداگانہ معنی پہنا دیئے اور یہ مفہوم اب اس درجہ رائج ہو چکا ہے کہ اس لفظ کے قدیمی معانی بالکل نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔

"خودی سے اقبال کا مفہوم کیا ہے؟" اس سوال کا جواب مختصر الفاظ میں دینا آسان نہیں۔ اس لئے کہ اقبال کا فلسفہ درحقیقت فلسفۂ خودی ہے اور جب تک اقبال کا پورا فلسفہ سامنے نہ آجائے اس اصطلاح کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس تفصیل و اطناب کا یہ موقع نہیں۔ لیکن چونکہ ضربِ کلیم میں بھی یہ لفظ بار بار سامنے آئے گا اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قلیل ترین الفاظ میں اس اصطلاح کا طائرانہ سا تعارف کرا دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ کیا انسان کی انفرادیت، شخصیت یا انا کوئی مستقل حقیقت ہے یا محض فریبِ تخیل؟ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے مفکرین نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش نہ کی ہو۔ افلاطون اور اس کی اتباع میں حکمائے ایران اور ہند اس نتیجے پر پہنچے کہ کائنات میں صرف حیاتِ کلی کا وجود ہے۔ انسانی ذات (انا یا شخصیت) محض فریب ہے۔ یہ فریب عمل کے ذریعہ قائم رہتا ہے اور عمل کی بنیاد پر ہے۔ لہٰذا اس فریب سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ انسان ترکِ آرزو سے ترکِ عمل کرے اور اس طرح انسانی ذات کا حباب ٹوٹ کر حیاتِ کلی کے بحر میں گم ہو جائے۔ اس وفنائے ذات کا نام نجات ہے اور یہی زندگی کا مقصود ہے۔ یہی وہ فلسفۂ حیات تھا جو ہمارے ہاں نظریۂ وحدت الوجود کے نام سے رائج ہوا اور جس نے مسلمانوں جیسی ہمہ تن عمل قوم کو خاک کی آغوش...

اقبال نے اس فلسفۂ حیات کے خلاف مسلسل احتجاج کیا اور اس کے برعکس فلسفۂ خودی پیش کیا۔ اس فلسفہ کا ملخص یہ ہے کہ حیات عالمگیر یا کلی نہیں بلکہ انفرادی ہے۔ حتیٰ کہ خدا بھی ایک فرد ہے اگرچہ وہ اپنی انفرادیت میں یگانہ اور نادر ہے۔ اس انفرادی زندگی کی اعلیٰ ترین صورت کا نام خودی ہے جس سے انسانیت کی شخصیت یا انفرادیت متشکل ہوتی ہے۔ لہٰذا انسانی زندگی کا مقصود سلبِ ذات نہیں بلکہ اثباتِ خودی ہے۔ اقبال کے نزدیک "جوں جوں انسان" اس فردِ کامل (نادر) کی مانند ہوتا جاتا ہے (جسے انائے مطلق یا خدا کہتے ہیں) وہ خود بھی منفرد اور نادر ہوتا جاتا ہے۔ اس کا نام استحکامِ خودی ہے۔ "خدا کی مانند" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اندر صفاتِ خداوندی کو منعکس اور اس طرح اُس انائے مطلق کو اپنے اندر جذب کرتا جائے۔ خودی کے ضعف اور استحکام کے پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ انسان اپنی راہ میں آنے والے موانعات پر کس حد تک غالب آتا ہے۔ زندگی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مادہ شر ہے اور اس لئے قابلِ نفرت۔ مادہ شر نہیں بلکہ یہ زندگی کی خوابیدہ قوتوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہے۔ جب انسانی خودی، موانعات پر غلبہ حاصل کرنے سے پختہ ہو جاتی ہے تو پھر موت کا جھٹکا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس طرح انسانی زندگی، دوام سے ہم کنار ہو جاتی ہے۔ بنا بریں ہر وہ عمل جس سے خودی میں استحکام پیدا ہو، خیر ہے۔ اور ہر وہ کام جس سے خودی کمزور ہو جائے شر ہے۔

اقبال کے نزدیک، ارتقائے خودی کا پہلا مرحلہ، تخلیقِ مقاصد یا تولیدِ آرزو ہے۔ آرزو عینِ حیات اور اصل قوت ہے کیونکہ یہی عمل کی محرک ہوتی ہے۔

تخلیقِ مقاصد کے بعد دوسرا مرحلہ حصولِ مقاصد کے لئے جہدِ مسلسل ہے۔ حصولِ مقصد کے لئے اسی تپش و خلش کا نام، اقبال کی اصطلاح میں عشق ہے۔ اس جد و جہد کی کامیابی کے لئے تین شرائط ناگزیر ہیں۔ اول اطاعت، اطاعت سے مراد ہے قوانینِ خداوندی (قرآن) کی کامل اتباع جس کے لئے قرآنی معاشرہ کی تشکیل ضروری ہے۔ اس اطاعت سے انسان کے اندر ضبطِ نفس پیدا ہو جاتا ہے اور یہ دوسری شرط ہے۔ ضبطِ نفس سے مراد خواہشات کا دبانا نہیں۔ بلکہ امالہ یا کفالت (زائد قوتوں کا رُخ دوسری طرف بدل دینے) سے ان میں توازن پیدا کرنا ہے۔ اس توازن کی اکمل ترین شکل ذاتِ خداوندی ہے جس میں متضاد صفات کا باہمی توازن اپنی انتہا تک پہنچا ہوا ہے۔

اس تطہیرِ فکر و عمل اور تہذیبِ نفس سے انسان اس مقام تک جا پہنچتا ہے جسے اقبال نیابتِ الٰہیہ سے تعبیر کرتا ہے اور یہ تیسری شرط ہے۔ نیابتِ خداوندی سے اقبال کا مفہوم وہ قوتِ مجریہ ہے جو دنیا میں قوانینِ خداوندی (ضابطۂ قرآنی) کی تنفیذ و ترویج کا موجب بنتی ہے۔ (نیابتِ الٰہیہ سے یہ مراد نہیں کہ انسان، خدا کا قائم مقام یا جانشین بن جاتا ہے اس لئے کہ جانشینی صرف اس کی ہوتی ہے جو خود موجود نہ ہو)۔ یہ مقامِ مومن ہے اور یہی مقام، اقبال کے نزدیک استحکامِ خودی کا آخری نقطہ ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان ساری دنیا پر غالب آجاتا ہے۔ دنیا اس پر غالب نہیں ہوتی، اس کیفیت کا نام اقبال کی اصطلاح میں، فقر و درویشی یا قلندری ہے۔ یعنی سب کچھ مسخر کر لینے کے بعد وہ استغنا جو اللہ کی صفتِ صمدیت اور "غنی عن العالمین" کا مظہر ہو۔ ان افراد پر مشتمل جماعت کا نام امتِ مسلمہ ہے اور اسی جماعت کی نشأۃ ثانیہ پیامِ اقبال کا منتہیٰ و مقصود۔ وہ امت جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

میانِ اُمّتاں والا مقام است — کہ آں اُمّت دوگیتی را امام است
نیاساید زکارِ آفرینش — کہ خواب و خستگی بروے حرام است

اور

بباغاں عندلیبے خوش صفیرے — براغاں جرّہ بازے زود گیرے
امیرِ او بسلطانی فقیرے — فقیرِ او بدرویشی امیرے

لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا۔

آپ طلوعِ اسلام کی مدد کیسے کر سکتے ہیں؟

- اپنے احباب کو طلوعِ اسلام کا خریدار بنایئے۔
- اپنے شہر میں طلوعِ اسلام کی ایجنسی قائم کیجئے۔
- کسی مقامی ایجنٹ کو تیار کیجئے کہ وہ طلوعِ اسلام کا لٹریچر منگائے۔

ممکن ہو تو اپنے علاقے سے طلوعِ اسلام کے لئے اشتہار مہیا کیجئے۔

اسلام کی سرگزشت

آج کی صحبت میں گزشتہ اشاعت کے تسلسل میں عربوں میں یہودیت اور نصرانیت کے فروغ پر بحث کی گئی ہے۔ اس سے پہلی قسطوں میں جزیرۂ عرب، قبائل عرب اور عربوں کے دیگر ممالک و اقوام کے ساتھ تجارتی تعلقات کا تذکرہ آچکا ہے۔

ایک گروہ یہودیوں کا اس طرف میلان تھا کہ وہ اپنے دینی معتقدات اور مغربی علوم میں جو یونانی علوم سے کافی متاثر تھے — تطبیق دینے کے بہت شائق تھے۔ دوسرے وہ مفکرین مغرب جنھوں نے اپنے نظریات کی بنیاد یونانی فلسفہ پر رکھی تھی؛ یہی چاہتے تھے کہ اپنے فلسفی اعتقادات اور خالص دینی نظریات، میں جو ان کے ہاں شروع سے پہنچے تھے، باہمی تطبیق کی کوشش کریں کسی جہت سے بھی غور کیا جائے، اس کے نتیجہ میں ہمیں ایک ایسا دینی فلسفہ نظر آنے لگتا ہے، جو نہ خالص فلسفہ ہے اور نہ خالص دین ہے۔ یہودیت جب عرب میں آئی، تو اپنے جلو میں وہ تمام چیزیں لے کر آئی ہو۔

نصرانیت نصرانیت اس عہد میں بہت کنیسوں میں منقسم اور بہت سے فرقوں میں بٹ چکی تھی۔ ان میں سے جزیرۂ عرب میں عموماً دو بڑے فرقے آئے تھے۔ ایک نساطرہ اور دوسرے یعقوبیہ نسطوریہ فرقہ زیادہ تر حیرہ میں پھیلا ہوا تھا اور یعقوبیہ فرقہ غسان اور دیگر شامی قبائل میں، ایسے ہی ان کے کچھ حصے اور گرجا وادی القریٰ میں بھی موجود تھے۔ جزیرۂ عرب میں نصرانیت کا اہم ترین مرکز نجران تھا، جو ایک سرسبز و شاداب اور خوب آباد شہر تھا۔ یہاں زراعت ہوتی تھی، اور ریشمی کپڑے بنے جاتے تھے۔ یہاں کھالوں کی تجارتی منڈی اور اسلحہ سازی کے کارخانے بھی تھے۔ یہ ان شہروں میں سے ایک تھا۔ جہاں کے یمنی غلّوں کے گیت عموماً تمام شعراء نے گائے ہیں۔ یہ شہر اس تجارتی راستے سے قریب واقع تھا جو حیرہ تک جاتا تھا، اس شہر کے معاملات عموماً تین رئیسوں کے ہاتھ میں رہتے تھے، سید، عاقب، اور اسقف، بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ سید کی خصوصیت وہی ہوتی تھی جو قبائل کے رؤساء کی ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ جنگ میں ان کا امیر اور کمانڈر ہوتا تھا اور خارجہ معاملات کی دیکھ بھال بھی وہی کرتا تھا۔ وہی اپنے قبیلہ اور دیگر قبائل کے باہمی تعلقات کی نگرانی کرتا تھا۔ اور عاقب دنیوی داخلہ امور کی نگرانی کرتا تھا۔ اور اسقف دینی امور کا نگران ہوتا تھا۔ اہم معاملات میں یہ تینوں باہمی مشورے سے فیصلہ کرتے تھے۔ یاقوت نے معجم میں لکھا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو نجران کا وفد آیا تھا۔ اس میں ایک سید تھا جس کا نام وہب تھا اور ایک عاقب تھا جس کا نام عبدالمسیح تھا اور ایک اسقف تھا جس کا نام ابوحارثہ تھا۔ رسول اللہ صلعم نے ان سے مباہلہ کرنا چاہا جس کے لئے وہ تیار نہیں ہوئے اور انھوں نے آپ سے صلح کرلی۔ چنانچہ آپ نے ان کے لئے ایک صلح نامہ لکھوا دیا تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہونے تو اسی صلحنامہ کے مطابق عمل کرتے رہے لیکن جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے ان کو جلاوطن کردیا، اور ان کی جائداد و اموال کی قیمت ان کو عطا کردی تھی۔

نجران میں ایک کعبہ تھا، یاقوت کا بیان ہے کہ اہل اسلام کعبۂ نجران کو — بیع دگرجا — کہتے تھے، اسے عبدالمدان بن الدیان حارثی کی اولاد نے کعبہ کی تعمیر کے مطابق بنایا تھا۔ اور وہ لوگ کعبہ کے مقابلہ میں اس کی ایسی ہی تعظیم کرتے تھے اور اسے کعبۂ نجران کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس میں کئی اسقف رہتے تھے جو سروں پر عمامے باندھتے تھے۔ بعض محققین نے کھوج لگایا کہ نصرانیت کے یہاں آنے سے پہلے یہ خود عربوں کا ایک کعبہ تھا جس کا وہ حج بھی کیا کرتے تھے، بعد میں نصاریٰ نے اس کو نجران میں نصرانیت پھیل جانے کے بعد اپنے گرجا میں تبدیل کرلیا تھا۔

نجران کے نصاریٰ — جیسا کہ اولیری نے کھوج نکالا ہے — یعقوبیہ فرقہ کے پیرو تھے۔ رومیوں کے ساتھ اتصال کی بہ نسبت حبشہ کے ساتھ ان کے ارتباط کی بھی یہی وجہ تھی کیونکہ حبشی بھی یعقوبیہ فرقہ ہی سے تعلق رکھتے تھے۔

عربوں میں اسلام سے پہلے ان کے رؤساء میں سے قس بن ساعدہ مشہور ترین رئیس گذرا ہے۔ عرب کے ادباء نے بیان کیا ہے کہ وہ نجران کا اسقف تھا۔ لیکن "لامانس" نے — یزید کی روداد سے اپنی کتاب میں اس بیان کے غلط ہونے کا قطعی یقین دلایا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ قس بن ساعدہ کا نجران والوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

ذونواس نے اہل نجران پر حملہ کرکے انھیں قتل کردیا — جیسا کہ ہم یہودیت پر بحث کرتے ہوئے پہلے بیان کرچکے ہیں — بعض مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ قرآن کریم کی یہ آیت اسی واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ وَهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ۔ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ مگر یہ تفسیر بعید معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہود و نصاریٰ سب ہی اللہ عزیز و حمید پر ایمان رکھتے تھے نصاریٰ نے حبشہ سے مدد مانگی تھی، اور انھوں نے ان کی مدد کی تھی انھوں نے بلادِ عرب پر ۵۲۳ء میں حملہ کیا۔ اور ذونواس کو شکست دی اور بحر احمر کے کنارہ پر ایک حبشی نوآبادی قائم کردی تھی۔ تہامہ پر یہ لوگ حکومت کرتے رہے جہاں ۵۷۵ء تک ان کی حکومت قائم رہی

روزوں کے قرآنی احکام

(۱) قرآن کی رو سے روزے فرض ہیں۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (۲/۱۸۳)

(۲) روزوں کے دن متعین ہیں اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ (۲/۱۸۴)

(۳) یعنی ایک مہینہ بھر کے روزے۔ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (۲/۱۸۵)

(۴) کسی معاشرے میں افراد کی حالت یہی ہوسکتی ہے کہ

(ا) وہ سفر میں ہوں۔ حالتِ سفر میں روزہ ملتوی کیا جائے اور جب گھر پر آجائیں تو جتنے روزے چھوڑے ہوں وہ پورے کئے جائیں فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (۲/۱۸۴)

(ب) گھر پر ہوں۔ لیکن بیمار ہوں۔ یہ بھی روزہ ملتوی کریں جب تک اس مرض سے شفایاب نہ ہوجائیں۔ شفایاب ہونے کی صورت میں وہ تمام روزے پورے کئے جائیں۔ جو چھوڑے ہوں۔ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا ... فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (۲/۱۸۴)

(ج) گھر پر ہوں اور تندرست و توانا ہوں تو پورے مہینے کے روزے رکھے جائیں۔ جیسا کہ اوپر (۳) میں بتایا جاچکا ہے۔

(د) گھر پر ہوں لیکن حالت ایسی ہو کہ روزہ کو بمشقت برداشت کیا جائے۔ ایسے لوگوں پر روزہ فرض نہیں لیکن وہ ہر روزے کے بدلے کسی غریب کو کھانا دیدیں وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ (۲/۱۸۴) اگر حالت بین بین ہو تو روزہ رکھنا بہتر ہے وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ (۲/۱۸۴)

(س) روزوں کے معاملہ میں اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے سختی نہیں برتنا چاہتا يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (۲/۱۸۵)

اسی لئے مذکورہ احکام دیئے ہیں۔

(۵) عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کی تفسیر میں مصر کے علامہ عبدہٗ نے لکھا ہے

الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے مراد یہاں بوڑھے ضعیف لوگ اور وہ اپاہج آدمی جن کے امراض کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو نیز جو لوگ ان جیسے ہوں مثلاً مزدور پیشہ لوگ جن کی معاش خدا نے ہمیشہ پرمشقت کاموں پر رکھدی ہو جیسے کانوں سے کوئلہ نکالنے والے مزدور نیز ان میں وہ مجرم بھی داخل ہیں جن سے جیلوں میں پرمشقت کام لئے جاتے ہوں اور ان پر روزہ رکھنا گراں ہو۔ تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جس کے دور ہونے کی امید نہ ہو۔ روزہ رکھنا گراں گزرتا ہو جیسے بڑھاپا اور پیدائشی کمزوری اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماریاں جن کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو نیز وہ شخص جس کی مشقت کا سبب بار بار نکرر ہوتا رہتا ہو جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت ان سب لوگوں کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ رکھنے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلادیں اتنا کھانا جتنا کہ درمیانی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔

تفسیر المنار (صفحہ ۱۵۵ - ۱۵۷ / ج ۲)

مشرقی پاکستان کے سیاسی عناصر

(کمیونسٹ)

ہندو اور کمیونسٹ

بنگال کے ہندوؤں نے تقسیم کو روکنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادی۔ انھوں نے اپنی جیسی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر ان کی خواہشوں اور تمناؤں کے علی الرغم جب پاکستان قائم ہو ہی گیا۔ تو انھوں نے کھلم کھلا پاکستان کی مخالفت کرنے کی بجائے ہر اس شر پسند، ہنگامہ پرور طبقے کی سرپرستی شروع کردی جو پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ان ہندوؤں نے اگر ایک طرف مولویوں کو خرید لیا تھا۔ تو دوسری طرف انھوں نے کمیونسٹوں کے سر پر ہاتھ رکھا۔ مولوی نے فی سبیل اللہ فساد کرانا شروع کیا اور کمیونسٹوں نے اپنے طور پر ملک میں تباہی اور انتشار پھیلانے کا پروگرام مرتب کیا۔

مشرقی بنگال کے عوام غربت و افلاس کا شکار تھے اس لئے ان میں کمیونزم کو بہت فروغ ہونا چاہیئے تھا۔ مگر اس میں انکی شدید مذہبیت آڑے آئی اور عوام کمیونسٹوں کے حملے سے بچ گئے۔ انھوں نے مشرقی بنگال کے عوام کو ورغلانے کی بڑی کوششیں کیں۔ مگر ان کو اس میں سخت ناکامی ہوئی۔

کمیونسٹوں کا مرکز

تقسیم کے بعد مشرقی بنگال کی سرحد کھلی ہوئی تھی اور آمد و رفت میں کسی قسم کی پابندی نہیں تھی۔ اس لئے کمیونسٹوں نے کلکتہ کو اپنا مرکز قرار دے کر مشرقی بنگال میں اپنی تحریک چلائی۔ سرحد کے کھلے ہوئے ہونے سے ان کمیونسٹوں کو یہ آسانی تھی کہ جب انھیں گرفتاری کا خطرہ محسوس ہوتا تھا یہ چپکے سے سرحد پار کر جاتے تھے۔ مشرقی بنگال کے ہندو ان کمیونسٹوں کے سرپرست تھے۔ ان کا سارا خرچ بھی برداشت کرتے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ پاکستان کو ختم کرنے کی تخریبی مہم چلا رہے تھے۔

کمیونسٹوں نے ایک سال تک بڑی سرگرمی دکھائی۔ مگر ان کو اس میں کسی قسم کی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مشرقی بنگال میں کارخانے وغیرہ تھے نہیں۔ جہاں وہ مزدوروں کے ہمدرد بن کر ان سے ہنگامے اور فساد کراتے۔ جب ان کو اپنی کامیابی کی کوئی صورت دکھائی نہ دی تو انھوں نے اپنا نقشۂ جنگ بدل دیا اور عوام کی بجائے اپنی توجہ طالب علموں کی طرف مبذول کی چنانچہ کمیونسٹوں کی بہت بڑی تعداد پورے مشرقی بنگال کے تعلیمی اداروں میں بڑی خاموشی کے ساتھ پھیل گئی۔

طلباء میں کمیونزم کی تبلیغ

مشرقی بنگال کے تقریباً تمام تعلیمی ادارے ہندوؤں کے قبضہ میں تھے، اس لئے کمیونسٹوں کو اپنے اس نئے پروگرام میں کامیابی کے امکانات بہت زیادہ دکھائی دیئے۔ پھر چونکہ یہ کمیونسٹ خود بھی ہندو تھے، اس لئے بھی ان کا کام بڑا آسان ہو گیا۔ اس مقصد کے لئے ہندو کمیونسٹوں نے تعلیمی اداروں کے ہندو سربراہوں، سرپرستوں اور اساتذہ سے مل کر منظم پروگرام بنایا اور اس کے مطابق کام شروع کیا۔ مسلمان طلباء میں کمیونزم کے اصولوں کی تبلیغ شروع کردی۔ بدقسمتی سے بنگلہ زبان میں سرے سے اسلامی لٹریچر کا وجود ہی نہ تھا۔ اس لئے پرائمری اسکول سے لے کر ایم اے تک مسلمان طالب علموں کو ہندو مصنفین کی کتابیں پڑھنی پڑتی تھیں۔

علمائے کرام کو اپنی فی سبیل اللہ فساد کی مہم ہی سے فرصت نہ تھی کہ وہ اس طرف توجہ کرتے۔ ان کی اس بے توجہی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن پاک کا ترجمہ تک بنگلہ زبان میں سب سے پہلے ایک ہندو پروفیسر نے کیا۔ جو وہاں آج تک رائج ہے۔ مشرقی بنگال میں ہزاروں کی تعداد میں عربی مدارس تھے جہاں لاکھوں طالب علم علوم عربیہ کی تکمیل میں مصروف تھے لیکن عربی مدارس میں پڑھنے پڑھانے والوں تک نے ملک و قوم کے سامنے ایسا نمونہ پیش کیا تھا کہ اعلیٰ طبقہ نہ تو اپنے بچوں کو عربی مدارس میں داخل کرنا پسند کرتا تھا اور نہ ہی عربی مدارس سے فارغ ہونے والے طالب علموں کو اچھی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

ہندوؤں کی چالیں

تقسیم کے بعد جب ہندوؤں نے مجبور ہو کر اپنی درسگاہوں کے دروازے مسلمان طالب علموں کے لئے کھول دیئے۔ تو ان میں ہزاروں مسلمان طالب علم داخل ہوگئے۔ ہندو اساتذہ نے مسلمان طالب علموں کو غلط راستے پر ڈالنے کی جو خفیہ اسکیم تیار کی تھی اس کے پیش نظر انھوں نے مسلمان طالب علموں کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کرنا شروع کیا۔ اور ان کی دلجوئی اور دلداری کے ساتھ ساتھ ان کو کمیونزم کے اصولوں کی تعلیم بھی دیتے رہے اور حکمراں طبقہ کے خلاف ان کے دلوں میں نفرت و حقارت کا جذبہ بھی پیدا کرتے رہے تاآنکہ مسلمان طالب علموں کے دلوں میں پاکستان اور حکومت پاکستان کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات راسخ ہوگئے اور جن طالب علموں کو سر سیدؒ، حالیؒ اور اقبالؒ بننا تھا۔ وہ لینن، اسٹالن اور مالنکوف کے دروں پر سجدہ ریز ہو گئے۔ اور ان کی نقل کرنے کو اپنی معراج سمجھنے لگے۔ پاکستان دشمن عناصر نے رفتہ رفتہ ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ مسلمان طالب علموں نے پڑھنا لکھنا چھوڑ کر عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کردیا۔

طلباء اور سیاستدان

طلباء میں سیاسی شعور کے بیدار ہوتے ہی میدان سیاست کے پٹے ہوئے مہرے اور شکست خوردہ مگر طالع آزما مسلمان لیڈروں نے اس سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اور انھوں نے طلباء کو اپنا آلۂ کار بنا کر اپنے لئے زمین ہموار کرنی شروع کردی۔ آخر ایک دن ایسا بھی آگیا کہ ایک طالع آزما لیڈر نے ۱۹۴۸ء میں بنگالی زبان کو ایک سرکاری زبان بنائے جانے کے سلسلہ میں طلباء کے ایک جلوس کی رہنمائی کی ۱۹۴۸ء کے اس جلوس کے بعد مشرقی بنگال میں جو انتشار اور اختلال پیدا ہوا ہے اس کا دروازہ آج تک بند نہیں ہوا۔ اس کے بعد کم ہی ایسے دن گذرے ہیں جب وہاں یہ ہنگامہ و فساد کی آواز نہ سنائی دی ہو۔ ان سارے ہنگاموں اور فسادات میں طلباء ہی پیش پیش ہوتے ہیں۔

طلباء کو عملی سیاست میں الجھا کر کمیونسٹوں نے مقامی اور غیر مقامی اور بنگالی، بہاری اختلافات کو بھی ہوا دی۔ اور اس طرح انھوں نے بڑی خاموشی کے ساتھ پورے مشرقی بنگال کو ایک جہنم کدہ بنا کر رکھ دیا۔

نفرت و حقارت کی مہم

ایک طرف مشرقی بنگال میں باہر والوں کے خلاف نفرت و حقارت پھیلانے کی مہم تیزی سے چل رہی تھی۔ دوسری طرف باہر والے ان کارخانے کھولنے اور گھریلو صنعتیں وغیرہ کو ترقی دینے میں مصروف تھے۔ مشرقی بنگال میں صرف نام کے لئے چند کارخانے تھے وہ بھی ان مقامی ہندوؤں کے تھے جو ان کارخانوں اور ملوں کی ساری آمدنی بھارت کو منتقل کرکے پاکستان کی معاشیات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہے تھے۔ ہندو کارخانہ دار اور صنعت کار یہ نہیں چاہتے تھے کہ مشرقی بنگال میں کوئی ایسی صنعت قائم ہو جس پر براہ راست ان کا کنٹرول نہ ہو۔ انھوں نے ہر اس تجویز کی مخالفت کی اور ہر اس اسکیم کو ناکام بنانے کی سعی کی۔ جس سے مشرقی بنگال میں صنعت و حرفت کا قیام عمل میں آسکے۔

مسلمان کاشت کار اور ہندو تاجر

مشرقی بنگال کل ہندوستان میں سب سے زیادہ پٹ سن پیدا ہوتا ہے۔ اس پیداوار سے مشرقی بنگال والوں کو اتنی آمدنی ہو جاتی تھی جس سے وہ بری بھلی زندگی بسر کر لیتے تھے۔ پٹ سن کی کاشت تو مسلمان کرتے تھے مگر اس کے کاروبار پر سو فیصدی ہندو تاجروں کا قبضہ تھا۔ جو اسے مسلمان کاشت کاروں سے سستے داموں خرید کر کلکتہ کے کارخانہ داروں کے ہاتھوں من مانی قیمتوں پر فروخت کر دیتے تھے تقسیم سے پہلے بنگال میں سب سے زیادہ پٹ سن کے کارخانے تھے جو بنگال کی تقسیم کے بعد سارے کے سارے مغربی بنگال کے حصہ میں آگئے۔ مشرقی بنگال کے حصہ میں پٹ سن کا ایک کارخانہ بھی نہیں آیا۔ تقسیم کے بعد پاکستان آجانے والے مسلمان تاجروں نے اس کمی کو بہت بری طرح محسوس کیا۔ اور جلد سے جلد مشرقی بنگال میں پٹ سن کے کارخانے قائم کرنے کی کوششوں میں لگ گئے۔

خطرہ کا احساس

کلکتہ کے ہندو تاجروں اور کارخانہ داروں کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ اگر واقعی مشرقی بنگال میں پٹ سن کے کارخانے قائم ہوگئے۔ تو ان کے کارخانوں پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔ اس لئے انھوں نے ایسی تدبیروں پر غور کرنا شروع کیا۔ جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹنے پائے۔ چنانچہ انھوں نے بھی ان کمیونسٹوں کی خدمات حاصل کیں جو خود ان کے سب سے بڑے دشمن تھے انھوں نے کمیونسٹوں کے سارے خرچ برداشت کرنے کی ذمہ داری لی اور ان کی بہت سی ٹولیوں کو مشرقی بنگال کے مختلف علاقوں میں ہنگامہ و فساد، لاقانونیت اور سراج پھیلانے کے لئے بھیجا۔

چنانچہ کمیونسٹ سارے مشرقی بنگال میں پھیل گئے۔

کمیونسٹوں کا پہلا ہنگامہ

کمیونسٹوں کے ہنگامے اور فساد کی سب سے پہلی آواز راج شاہی کے ایک علاقہ نچول میں سنائی دی۔ جہاں کمیونسٹوں نے کئی پاکستانی سپاہیوں کو زندہ دفن کر دیا تھا۔ اور اس کے بعد یہ کمیونسٹ سرحد پار کر کے کلکتہ پہونچ گئے تھے۔ ان کمیونسٹوں کی رہنمائی کلکتہ کی مشہور کمیونسٹ ورکرس ایلا گھوش کر رہی تھی۔ یہ مشرقی بنگال کی رہنے والی تھی مگر اس کی سرگرمیوں کا مرکز کلکتہ تھا۔ نئی اسکیم کے مطابق ایلا گھوش کو مشرقی بنگال میں ہنگامہ و فساد کرانے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ یہ کلکتہ میں کئی مرتبہ پولیس کے ہاتھوں گرفتار بھی ہو چکی تھی۔ مگر یہ برابر بیماری کا بہانہ کر کے جیل سے باہر آجاتی تھی۔ راجشاہی کے دیہاتی علاقہ میں اس نے ہندو نوجوانوں اور سنتھالوں کی مدد سے راجشاہی کے ایک گاؤں نچول میں ایک بہت بڑا ہنگامہ کرانا چاہتی تھی جس کی خبر اتفاق سے پولیس والوں کو ہو گئی تو پولیس کی ایک جمعیت وہاں پہنچ گئی۔ جس نے غیر قانونی مجمع کو منتشر ہو جانے کا حکم دیا

سپاہیوں کو زندہ دفن کر دیا گیا

ایلا گھوش نے سپاہیوں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اگر وہ اپنے ہتھیار اس کے پاس جمع کرا دیں تو وہ مجمع کو پرامن طریقے پر منتشر کر دے گی۔ سپاہی اس کی باتوں میں آگئے۔ اور انھوں نے اپنے ہتھیار اس کے حوالے کر دیئے۔ ہتھیار پر قبضہ کرنے کے بعد ایلا گھوش نے مجمع کو حکم دیا کہ ان سپاہیوں کو زندہ دفن کر دیا جائے چنانچہ تمام سپاہی بڑی بے دردی سے زندہ دفن کر دیئے گئے سپاہیوں کو زندہ دفن کرانے کے بعد ایلا گھوش وقتی طور پر ہی روپوش ہو گئی۔ اس واقعہ نے حکومت کے ایوان میں تہلکہ ڈال دیا۔ پورے صوبہ میں کمیونسٹوں کی سرگرمیوں کی تیزی سے چھان بین شروع ہو گئی۔ تو کمیونسٹ اپنی عادت کے مطابق کچھ تو زیر زمین چلے گئے اور باقی سرحد کے اس پار چلے گئے۔

ایلا گھوش کی گرفتاری

پاکستان کی خفیہ پولیس نے ایلا گھوش کو عین اس وقت گرفتار کر لیا۔ جب وہ سرحد پار کرنے والی تھی۔ گرفتاری کے بعد اس پر مقدمہ چلا اور اسے عدالت سے سزا ہو گئی۔ مشرقی بنگال میں کمیونسٹوں کو ایلا گھوش کی گرفتاری اور سزائے قید سے بڑی سخت تکلیف پہنچی انھوں نے سزا کے خلاف مختلف علاقوں میں جلسے کئے۔ اور حکومت سے ایلا گھوش کو چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا۔ اسی زمانہ میں کمیونسٹوں نے بنگلہ میں ایک کتاب "ایلارانی" کے نام سے شائع کی۔ جس میں ایلا گھوش کو چاند بی بی اور رضیہ سلطانہ سے بھی بڑا درجہ دیا گیا تھا۔ اور اسے "بنگال کی قابل فخر بیٹی" قرار دیا گیا تھا۔ ایلا گھوش کی گرفتاری اور سزا کے بعد صوبہ میں کمیونسٹوں کی سرگرمیوں کا زور کچھ سرد پڑ گیا تھا۔ مگر طالب علم برابر جلوس نکال کر اور جلسے کر کے اپنی زندگی کا ثبوت دیتے جا رہے تھے

حکومت کی خاموشی

لیکن چونکہ اس قسم کے جلسے اور جلوسوں کا حکومت کے انتظامی امور پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ اس لئے حکومت بھی خاموش تھی اور حکومت کی خاموشی کی وجہ یہ تھی کہ مشرقی بنگال کا حکمراں طبقہ خود لوٹ کھسوٹ میں مصروف تھا۔ زمام اقتدار سنبھالنے کے بعد ان لوگوں نے سوائے اپنا گھر بھرنے کے عوام کے مسائل پر کبھی کوئی توجہ ہی نہیں دی تھی۔ اس لئے پاکستان دشمن عناصر بالخصوص کمیونسٹوں کو حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کا کافی موقعہ ملا۔

خواجہ ناظم الدین کا دورہ

جب خواجہ ناظم الدین مرکز میں وزیر اعظم مقرر ہونے تو انھوں نے مشرقی بنگال کا دورہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ وہ جنوری ۱۹۵۲ء میں ڈھاکہ تشریف لائے۔ اور ۲۶ر فروری ۱۹۵۲ء کو پلٹن میدان میں ایک زوردار تقریر کی۔ جس میں انھوں نے آٹے دال کا بھاؤ بتاتے ہوئے سرکاری زبان کا مسئلہ بھی چھیڑ دیا۔

ناظم الدین صاحب تو تقریر کر کے کراچی تشریف لے گئے۔ مگر کمیونسٹوں اور پاکستان دشمن عناصر کو ایک شوشہ ہاتھ آگیا کہ خواجہ ناظم الدین صاحب کون ہوتے ہیں سرکاری زبان کا اعلان کرنے والے۔ چنانچہ ان کی پلٹن میدان والی تقریر کو بہانہ بنا کر کمیونسٹوں نے پورے صوبہ میں لاقانونیت سی پیدا کر دی۔

نور الامین کی منافقت

صوبہ کے وزیر اعلیٰ مسٹر نور الامین بھی بنگلہ کو سرکاری زبان بنائے جانے کے حق میں تھے۔ مگر ان میں اتنی جرأت نہ تھی کہ کھل کر اس کا اظہار کرتے کیونکہ مرکزی حکومت کی یہ خواہش تھی کہ اردو ہی کو سرکاری زبان بنایا جائے۔

۲۱ر فروری ۱۹۵۲ء کو طلباء نے کمیونسٹوں کی راہ نمائی میں بنگلہ کو سرکاری زبان بنائے جانے کے لئے ڈھاکہ میں ایک جلوس نکالا۔ نور الامین صاحب نے بڑی خوبصورتی سے اس جلوس پر گولیاں بھی چلوا دیں۔ اور پھر خود ہی مشرقی بنگال کی اسمبلی سے بنگلہ کو سرکاری زبان بنائے جانے کی تجویز بھی منظور کرا لی۔ اس طرح اپنے جانتے انھوں نے عوام اور طلباء میں سرخروئی حاصل کرنے کی ایک صورت نکال لی مگر ان کی اس حرکت پر نہ تو طلباء نے خوشنودی کا اظہار کیا۔ اور نہ ہی عوام نے ان کے اس فعل کو پسند کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نور الامین صاحب کی یہ اسکیم اس بری طرح ناکام ہوئی کہ پچھلے الیکشن میں ان کو ایک طالب علم کے ہاتھوں شکست اٹھانی پڑی۔ نور الامین صاحب کی حماقت سے ۲۱ر فروری ۱۹۵۲ء کے بعد مشرقی بنگال میں جو لاقانونیت اور ہنگامہ کا دور دورہ شروع ہوا ہے اس نے نہ صرف مشرقی بنگال کے خرمن امن کو خاکستر کر دیا۔ بلکہ اس نے مرکز کی چولیں بھی ہلا کر رکھ دیں۔

صنعتی ترقی کی ابتداء

۱۹۵۲ء تک صوبہ میں کئی کارخانے تکمیلی مراحل طے کر چکے تھے جن میں آدم جی جوٹ مل اور کرنافلی پیپر مل خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں کارخانوں کے قائم ہو جانے سے ہندوستان کی مارکیٹ پر خاص طور سے زد پڑتی کیونکہ ان کے قیام سے پہلے کروڑوں روپے کا کاغذ اور پٹ سن کی بنی ہوئی چیزیں ہندوستان سے درآمد کی جاتی تھیں۔ اس سے ہندوستان کے تاجروں میں کھلبلی مچ گئی۔ انھوں نے دوبارہ سیکڑوں کرائے کے کمیونسٹوں کو مشرقی بنگال میں ہنگامہ و فساد کرانے کے لئے بھیج دیا۔ ان میں کا ایک طبقہ سادگی و پرکاری سے کارخانوں اور ملوں میں مزدور کی حیثیت سے بھرتی ہو گیا۔ اور دوسرا طبقہ اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کارخانے اور صنعتی ادارے چونکہ نئے نئے قائم ہوئے تھے اس لئے وہاں ان کی دال فوری طور پر نہیں گلی۔ لیکن تعلیمی اداروں میں چونکہ کئی برسوں سے منظم طور پر کام ہو رہا تھا۔ اس لئے یہ کمیونسٹ طلباء کو آسانی کے ساتھ تخریب پسندی پر آمادہ کر سکے۔

مرکز گریز رجحانات

۲۱ر فروری کا ہنگامہ ابھی تازہ ہی تھا۔ اس لئے انھوں نے اس ہنگامہ کو بنیاد قرار دے کر صوبائی اور مرکزی حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا کچھ دنوں تک صوبائی حکومت کی بے تدبیری اور ناکارکردگی موضوع بحث رہی۔ لیکن چند ہی دنوں کے بعد سارا زور مرکز گریز رجحانات پر صرف ہونے لگا۔ کمیونسٹوں نے یہ بات پورے صوبے میں پھیلا دی کہ "مشرقی بنگال کی غربت اور افلاس کی ساری ذمہ داری مرکز پر ہے۔ اس لئے کہ مشرقی بنگال کا سارا روپیہ مرکز میں چلا گیا ہے۔ اور وہاں سے مغربی پاکستان کے دوسرے علاقوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ یہ اور اس قسم کے پروپیگنڈہ کا اثر تھا ہی کہ مشرقی پاکستان عوامی مسلم لیگ کے صدر مولانا عبدالحمید خاں بھاشانی طالب علموں کے لیڈر بن کر میدان میں آگئے۔ یہ صورت شکل سے تو تھے مولوی لیکن خیالات کے اعتبار سے ان کی رگ رگ میں کمیونزم بھرا ہوا تھا۔ ۲۱ر فروری کے ہنگامہ کے سلسلہ میں ان کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی تھی کیونکہ نور الامین صاحب کی مسلم لیگی وزارت نے ۲۱ر فروری کے ہنگامہ کے بعد ان کو بھی گرفتار کر لیا تھا۔ ان کی رہائی تقریباً ایک سال بعد عین اس وقت ہوئی جب صوبہ میں الیکشن کی تاریخوں کا اعلان ہو چکا تھا۔ الیکشن کی تاریخوں کے اعلان سے پہلے پورے صوبہ میں سوائے عوامی مسلم لیگ کے اور کوئی حزب اختلاف موجود نہیں تھی۔

الیکشنی جماعتیں

لیکن الیکشن کی تاریخوں کا اعلان ہوتے ہی کرشک سرمک پارٹی، ربانی لیگ، خلافت ربانی پارٹی اور نظام اسلام پارٹی بھی برساتی کیڑوں کی طرح نہ جانے کہاں سے آدھمکیں ان میں سے ہر پارٹی کے پاس اپنا لائحہ عمل اور اپنا خصوصی پروگرام تھا۔ مگر ان تمام برساتی جماعتوں میں صرف ایک چیز مشترک تھی اور وہ چیز تھی "مسلم لیگ دشمنی" چنانچہ باوجود ایک دوسرے سے بنیادی اختلافات کے یہ ساری جماعتیں ایک پلیٹ فارم پر اس لئے جمع ہو گئی تھیں کہ جس طرح سے بھی ہو مسلم لیگ کا خاتمہ کر دیا جائے

جگتو فرنٹ کا قیام

اس نئے پلیٹ فارم کا نام "جگتو فرنٹ" یا "متحدہ محاذ" رکھا گیا۔ یہ جماعت تحسبہم جمیعا وقلوبھم شتّٰی کی زندہ مثال تھی۔

جگتو فرنٹ میں یوں تو بھانت بھانت کے لوگ شریک تھے مگر اس میں کمیونسٹ یا کمیونسٹ زدہ طلباء کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ ان کمیونسٹوں اور کمیونسٹ زدہ طلباء نے محض سیدھے سادے عوام کی ہمدردیاں (یا ووٹ) حاصل کرنے کے لئے موجودہ بھاشانی کو آگے بٹھایا۔ انھوں نے ہر روز مولانا سے تین تین چار چار بیانات دلوانے شروع کر دیئے۔ جو ایک طرف اگر حکومت کے خلاف ہوتے تھے۔ تو دوسری طرف ان سے مقامی غیر مقامی اور بہاری بنگالی کے فتنے کو شہ ملتی۔

مولانا بھاشانی کمیونسٹوں کے نقش قدم پر

الیکشن جوں جوں قریب آتا گیا مولانا کے بیانات میں اور سختی آتی گئی۔ یہاں تک کہ کمیونسٹوں نے مولانا کے دستخط کی ایک

بھر سوالی۔ اور انھوں نے جس قسم کا بیان بھی مناسب سمجھا مولانا کے نام سے شائع کرا دیا۔ ان بیانات نے مقامی لوگوں کو باہر والوں کی جان کا دشمن بنا دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ کمیونسٹوں کا وہ طبقہ جو کارخانوں اور صنعتی اداروں میں گھس گیا تھا۔ وہ مزدوروں کو باہر والوں کے خلاف بھڑکاتا رہا اور ان کو اس پر اکساتا رہا کہ اگر وہ باہر والوں کو مار بھگانے میں کامیاب ہو گئے۔ تو پھر سارے کارخانے ملیں اور کاروبار وغیرہ ان کے اپنے قبضے میں آجائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ صوبے کے تمام سرکاری اور غیر سرکاری عہدوں پر بھی ان کا تصرف ہو جائے گا۔

کمیونسٹ اور مقامی صحافت

کمیونسٹوں کے اس قسم کے پروپیگنڈوں کو مقامی بنگلہ صحافت سے بھی بہت مدد ملی۔ یہ اخبارات بنگلہ میں چھپتے تھے جن کے مندرجات کا باہر والوں کو بنگلہ کی ناواقفیت کی وجہ سے علم ہی نہیں ہوتا تھا۔ ان کو اس کا پتہ ہی نہیں تھا کہ اندر ہی اندر ان کے خلاف کس قسم کی کھچڑی پک رہی ہے۔ بنگلہ اخبارات نے بنگلہ زبان کی حمایت کی آڑ لے کر باہر والوں اور مرکز کے خلاف خوب خوب پروپیگنڈہ کیا جب ہر طرح سے مقامی لوگوں کے جذبات برانگیختہ ہو گئے۔ تو کمیونسٹوں نے اپنا سب سے پہلا نشانہ کرنافلی پیپر مل کو بنایا۔ جہاں انھوں نے اندر ہی اندر مقامی مسلمانوں کو باہر کے مسلمانوں کے خلاف اس قدر بھڑکایا کہ آخر کار وہاں وہ تاریخی فساد رونما ہوا۔ جس نے پورے پاکستان میں صف ماتم بچھا دی۔

کرنافلی کا فساد

کرنافلی کے فساد میں چن چن کے ایسے لوگوں کو قتل کیا گیا جو فن کاغذسازی میں اپنی مثال آپ تھے۔ اور ان میں سے بعض تو بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ کرنافلی پیپر مل کے فساد سے پہلے اس علاقہ میں کپتائی کے مقام پر بھی کمیونسٹوں نے ایک زبردست فساد کرایا تھا۔ مگر اس وقت کی مسلم لیگی حکومت نے اس فساد کی خبر کو غلط افواہ کا نام دے کر دبا دیا تھا۔ کرنافلی پیپر مل کے فساد کا بھی شاید یہی حال ہوتا۔ اگر ڈھاکہ کے انگریزی روزنامہ "مارننگ نیوز" اس حادثہ کا انکشاف نہ کرتا۔ جس وقت کرنافلی کے خونین حادثہ کی خبر مارننگ نیوز میں شائع ہوئی ہے۔ اس وقت مولوی فضل الحق وزارت کا حلف اٹھانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ چنانچہ جس روز کرنافلی پیپر مل کے مقتولین کی لاشیں ڈھاکہ لائی گئی ہیں۔ اس روز فضل الحق صاحب نے وزیر اعلیٰ کے عہدہ کا حلف اٹھایا تھا۔ یہ کس قدر عبرت ناک منظر تھا کہ گورنمنٹ ہاؤس میں فضل الحق صاحب وزارت عظمیٰ کا حلف اٹھا رہے تھے اور دوسری طرف اس شہر میں کرنافلی کے منتظم اعلیٰ خورشید علی مرحوم اور ان کے ساتھیوں کو سپرد خاک کیا جا رہا تھا۔

سیاسی نظربندوں کی رہائی

الیکشن چونکہ کمیونسٹوں کی مدد سے جیتا گیا تھا۔ اس لئے فضل الحق صاحب کے حلف وفاداری اٹھاتے ہی کمیونسٹوں نے ان سے مطالبہ کیا کہ صوبے کے سیاسی نظربندوں کو رہا کر دیا جائے انھوں نے کمیونسٹوں کا یہ مطالبہ حلف اٹھانے سے پہلے ہی تسلیم کر لیا تھا۔ چنانچہ حلف وفاداری کی رسم کے بعد وہ گورنمنٹ ہاؤس سے سیدھے سکریٹریٹ پہونچے اور اپنے قلم سے سب سے پہلا حکم سیاسی نظربندوں کی رہائی کا دیا۔ ان سیاسی نظربندوں میں اکثریت ان کمیونسٹوں کی تھی۔ جن کو مختلف موقعوں پر صوبائی حکومت نے گرفتار کیا تھا۔ ان سیاسی نظربندوں یا کمیونسٹوں کی رہائی پر بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ جلسے کئے گئے، اور جلوس نکالا گیا۔ ان کی رہائی سے کمیونسٹوں کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے۔

ایلاگھوش کی رہائی کا مطالبہ

اور انھوں نے سزا یافتہ کمیونسٹوں کی رہائی کے مطالبات بھی شروع کر دیئے۔ ان میں ایلاگھوش کی رہائی کا مطالبہ بھی شامل تھا۔ ایلاگھوش نے اپنی پرانی عادت کے مطابق بیماری کا ڈھونگ رچایا۔ جیلخانے میں اس پر بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے تو اسے علاج کے لئے ڈھاکہ میڈیکل کالج میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں اسے ایک ایسے وارڈ میں رکھا گیا۔ جس میں سیکڑوں مریض زیر علاج تھے۔ ایلاگھوش کے میڈیکل کالج میں داخل ہو جانے کے بعد مرلفیوں کا یہ وارڈ گویا کمیونسٹوں کا صدر دفتر بن گیا۔ جہاں صوبے بھر کے کمیونسٹوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ایلاگھوش گھنٹوں کمیونسٹوں سے باتیں کرتی اور ان کو ہدایتیں دیتی۔ میڈیکل کالج کا کوئی ڈاکٹر یا افسر جب اس کے پاس آتا تو وہ بیہوش ہو جاتی۔ اور اس پر دورے پڑنے شروع ہو جاتے۔

متحدہ محاذ کی وزارت چونکہ قائم ہو چکی تھی۔ اس لئے کسی شخص کی یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ ایلاگھوش کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکالتا۔ کیونکہ ایلاگھوش تو بنگال کی قابل فخر بیٹی تھی اور اسے ایلارانی کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ عوام کے سامنے وہ بنگال کی محسنہ اور ریفارمر کی حیثیت سے پیش کی جا رہی تھی۔

وزراء اور ایلاگھوش

مولوی فضل الحق کی وزارت کے قیام کو چند ہی دن گزرے تھے کہ کمیونسٹوں نے منظم طور پر ایلاگھوش کی شدید بیماری کا بہانہ کر کے اس کی رہائی کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اس کے لئے ہر شہر اور ہر گاؤں میں جلسے ہونے شروع ہو گئے اور وزراء پر زور دیا جانے لگا کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے ایلاگھوش کا حال معلوم کریں چنانچہ فضل الحق کابینہ کے دو وزیر ابوحسین سرکار اور عزیز الحق عرف ننا میاں بنفس نفیس میڈیکل کالج گئے۔

ڈھاکہ جیل کا ہنگامہ

طلباء نے متحدہ محاذ کی وزارت پر زور دیا کہ وہ جلد سے جلد ایلاگھوش کو رہا کرے یہ مطالبہ کافی زور پکڑ چکا تھا کہ ڈھاکہ جیل کا ہنگامہ ہو گیا۔ جس میں جیل کے وارڈنوں اور عوام کے ایک گروہ میں تصادم ہو گیا۔ اس ہنگامے کی سب سے دلچسپ چیز یہ تھی۔ کہ فضل الحق کابینہ کے ایک وزیر ہنگامہ کرنے والوں کی راہ نمائی کر رہے تھے۔ اس ہنگامہ کے زمانہ میں ہی فضل الحق صاحب نے ایلاگھوش کی پیرول پر رہائی کے احکام جاری کر دیئے، چنانچہ وہ علاج کے لئے کلکتہ چلی گئی۔ اس کے کلکتہ جانے کے بعد کمیونسٹوں نے اپنی تخریب پسندی کی مہم پہلے سے زیادہ تیز کر دی۔

کمیونسٹ اور آدم جی جوٹ مل

کرنافلی پیپر مل کے فساد کے بعد انھوں نے اپنی ساری توجہ دنیا کے سب سے بڑے جوٹ مل "آدم جوٹ مل" کی طرف مبذول کر دی تھی۔ اس مل کے وجود میں آجانے سے کلکتہ کی ملوں پر بہت برا اثر پڑا تھا۔ کیونکہ اب پاکستان کی ضروریات کی ساری چیزیں خود اسی مل میں تیار ہونے لگی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ پٹ سن کی بنی ہوئی چیزیں پاکستان سے باہر بھیجنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں (جیسا کہ پہلا کہا جا چکا ہے) کلکتہ اور مشرقی بنگال کے ہندو اس صورت حال سے بہت پریشان تھے۔ ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ جلد سے جلد مشرقی بنگال کی صنعتی ترقی بند ہو جائے۔ تاکہ وہ پہلے کی طرح زیادہ غیر ملکی زرمبادلہ حاصل کر سکیں۔ مشرقی بنگال میں ہنگامہ وفساد اور افراتفری پیدا کرنے ہی کے لئے وہ کمیونسٹوں اور تخریب پسندوں کی سرپرستی کر رہے تھے۔

آدم جی جوٹ مل کا فساد

چنانچہ کلکتہ اور مقامی ہندوؤں کے اشاروں پر آدم جی جوٹ مل میں رمضان کے مہینے میں وہ ہولناک فساد کرا دیا گیا کہ جس میں پانچسو سے زیادہ آدمی مارے گئے۔ اس خونین حادثہ نے نہ صرف پاکستان بلکہ بیرون ملک میں بھی تہلکہ مچا دیا۔ آدم جی جوٹ مل کا ہنگامہ بلاشبہ کمیونسٹوں کی سب سے بڑی فتح تھی۔

فضل الحق کی برطرفی

انھوں نے بزعم خویش مشرقی بنگال کو تباہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ لیکن غنیمت ہوا کہ اس کے بعد یہ منحوس وزارت برطرف کر دی گئی۔ مولوی فضل الحق کی برطرفی کے بعد میجر جنرل اسکندر مرزا کو صوبے کا گورنر مقرر کیا گیا۔ انھوں نے حکومت سنبھالتے ہی بڑی جرات سے کام لے کر کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی جماعت قرار دے دیا۔ اور ان کی گرفتاریاں شروع کر دیں۔ میجر جنرل اسکندر مرزا کے اس اقدام سے کمیونسٹوں کی ان برملا تخریبی کارروائیوں کا زور ٹھنڈا ہو گیا۔

ہنگامے صرف مسلمانوں کے کارخانوں میں ہوئے

یہاں پر یہ بات دلچسپی سے سنی جائے گی کہ مشرقی بنگال کے صنعتی اداروں اور کارخانوں میں بیسیوں مرتبہ فسادات ہوئے ہڑتالیں ہوئیں، ہنگامے ہوئے۔ لیکن ہندوؤں کے کارخانوں میں آج تک ایک دن کے لئے بھی کام بند نہیں ہوا۔ عام لوگوں کو اس پر سخت تعجب ہے کہ آخر کمیونسٹوں کے حملوں کا نشانہ مسلمان تاجر صنعت کار۔ اور کارخانہ دار ہی کیوں ہیں؟ اہل نظر جانتے ہیں کہ یہ ہندو کارخانہ دار اور سرمایہ دار ہیں۔ جن کے اشاروں پر کمیونسٹ ہنگامہ وفساد کرتے رہتے ہیں اور یہی ہیں جو اب تک مشرقی پاکستان سے کروڑوں روپے بھارت کو منتقل کر چکے ہیں اور آج بھی اس منفعت بخش کاروبار میں مشغول ہیں۔ یہ کاروبار اس وقت تک جاری رہے گا۔ جب تک یہ مشرقی بنگال کو خدانخواستہ تباہی کے آخری دروازے تک نہ پہونچا دیں گے۔

قرآنی تعلیم کی ضرورت

تصریحات بالا سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آگئی ہوگی۔ کہ اگر مرکزی حکومت یہ چاہتی ہے کہ مشرقی بنگال میں پائیدار بنیادوں پر امن وامان قائم ہو جائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسے اقدامات کرے جن سے طلباء کے ذہن سے کمیونزم کے جراثیم نکل جائیں۔ [illegible] اور اس کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں کہ [illegible] ہوں میں صحیح قرآنی تعلیم شروع کر دی جائے۔ جب تک نوجوان طالب علموں کے قلب و دماغ کی تعمیر صحیح خطوط پر نہ ہوگی۔ وہ

عرفانِ الٰہی

ماہنامہ "ثقافت" (لاہور) نے اپنی مارچ کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

انسان کے لئے اہم ترین علم اپنی حقیقت کا عرفان ہے اور دین کا مقصودِ آخری اور غایت عرفان خدا کا عرفان ہے۔

اس پر ہم نے (ایک مستفسر کے جواب میں) ۱۹ مارچ کے طلوع اسلام میں لکھا تھا کہ

(۱) قرآن خدا کی ذات پر ایمان کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے عرفان کا نہیں۔ خدا اس سے بہت بلند ہے کہ انسان اس کی ذات کی حقیقت و ماہیت جان اور پہچان سکے۔ لہٰذا دین کا مقصود خدا کا عرفان نہیں

(۲) قرآن نفسِ انسانی کے عرفان کا بھی مطالبہ نہیں کرتا وہ نفسِ انسانی پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ جس طرح وہ کائناتی شواہد پر تدبر و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن "معرفت" اور غور و فکر کے بعد کسی شے کے متعلق علم حاصل کرنے میں جو فرق ہے۔ وہ بالکل واضح ہے۔

"ثقافت" کی اپریل کی اشاعت میں ہمارے اس جواب پر تنقید (محترم سید جعفر شاہ صاحب پھلواردی نے اپنے نام سے) شائع کی ہے، اس میں انھوں نے (قرآن کی ان آیات کے حوالے سے جس میں نفسِ انسانی پر تدبر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے) لکھا ہے کہ تدبر و تفکر کے ذریعے جو علم حاصل ہوتا ہے، اسے اور آگے بڑھا دیا جائے تو وہ عرفان کہلاتا ہے۔ چنانچہ اس کے لئے انھوں نے امام راغب کے لغت کے حوالے سے بتایا ہے کہ

کسی چیز کی علامت پر تفکر و تدبر کرنے سے اس چیز کا جو کچھ ادراک ہوتا ہے۔ اسی کو معرفت یا عرفان کہتے ہیں۔ یہ علم سے اخص ہے اور اس کی ضد ہے انکار۔

ہم محترم شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ کسی چیز پر تدبر و تفکر سے جو علم حاصل ہوتا ہے: اگر اسی کی اخص شکل کا نام "عرفان" ہے تو ہمیں اس طرح کے عرفان نفس (یعنی علم النفس) پر کوئی اعتراض نہیں۔ یہ چیز تو ہم نے خود ہی لکھ دی تھی۔ کہ قرآن نفسِ انسانی پر تدبر و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ ہم نے لکھا یہ تھا کہ

[illegible]

[illegible]

سے اس کے متعلق علم حاصل کیا جائے۔ اس کو ادراک بھی کہتے ہیں اس کے برعکس اہلِ تصوف کا یہ دعویٰ ہے کہ تدبر و تفکر سے کسی شے کی حقیقت کے متعلق علم حقیقی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کا ایک اور ہی ذریعہ ہے جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ علم براہ راست (DIRECTLY) حاصل ہوتا ہے۔ اس سے اس شے کی حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے اسے "معرفت" یا "عرفان" کہتے ہیں

ہم نے لکھا یہ تھا کہ نفسِ انسانی کے متعلق قرآن غور و فکر کے ذریعہ علم حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے "معرفت" یا "عرفان" کا حکم نہیں دیتا۔ یہ تصوف کی تعلیم ہے، جسے قرآن سے کوئی واسطہ نہیں، اسے ہم پھر دہراتے ہیں کہ قرآن کی رو سے حقیقت یہ ہے براہ راست (DIRECT) علم صرف وحی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ جو نبی کے لئے مخصوص ہے غیر نبی کے لئے علم کا ذریعہ تدبر و تفکر ہی ہے۔ تدبر و تفکر کے ذریعہ حاصل کردہ علم کو اگر آپ معرفت یا عرفان کہنا چاہتے ہیں تو اس پر ہمارا جھگڑا نہیں لیکن اگر آپ اس علم کی سند چاہتے ہیں جسے تصوف کی اصطلاح میں "عرفان یا معرفت" کہا جاتا ہے۔ قرآن سے لانا چاہیں گے تو اس میں آپ کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ قرآن نے وہ وحی کہا ہے جو انبیاء کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ یہ تو رہا "عرفان نفس" کے متعلق۔ باقی رہا "عرفان خداوندی" یا "معرفت ذات الٰہی" سو اس کے متعلق عرض ہے کہ اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ اشیائے کائنات پر غور و فکر سے انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ کائنات کے پیچھے کوئی ایسی ہستی ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے اور جو اسے اس حسن و زیبائی سے چلا رہی ہے تو اس تدبر و فکر کی تائید قرآن کے ورق ورق سے ملتی ہے لیکن اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ ایک ایسا ذریعہ علم بھی ہے جس سے انسان ذات خداوندی کی حقیقت جان لیتا ہے (جسے تصوف میں "معرفت" کہتے ہیں) تو یہ تصور قرآن کے یکسر خلاف ہے، ذات خداوندی کی حقیقت انسانی علم کے دائرے سے بہت آگے اور بلند ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ ان تصریحات سے واضح ہو گیا ہوگا کہ ہم نے اپنے بیان میں کیا کہا تھا۔

(۵) محترم شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ

امام راغب تو آپ کے لئے حجت نہیں ہو سکے لیکن اقبالؒ تو ضرور آپ کے لئے حجت ہوں گے

ہم یہ عرض کر دیں کہ ہمارے نزدیک نہ کوئی راغب حجت ہے۔ نہ اقبال، دین میں ہمارے لئے حجت صرف اللہ کی کتاب ہے۔ جس نے ہمیں دین عطا کیا ہے۔

(۶) مذکورہ صدر فقرہ کو محترم شاہ صاحب نے اس طرح مکمل کیا ہے

اقبال تو آپ کے نزدیک ضرور حجت ہوں گے کیونکہ آپ کی کسی تحریر سے مجھے یہ علم نہ ہو سکا کہ اقبال میں بھی کوئی بشری کمزوری ہو سکتی ہے بہرحال اپنے اس "امام معصوم" کی زبان سے بھی کچھ سن لیجئے۔"

ہم محترم شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ اقبال کو ہم نے نہ کبھی "امام معصوم" کہا ہے، اور نہ ہی اسے بشری کمزوریوں سے مبرا تسلیم کیا ہے، باقی رہا یہ کہ شاہ صاحب کو ہماری کسی تحریر سے یہ علم نہ ہو سکا کہ اقبال میں بھی کوئی بشری کمزوری ہو سکتی ہے" تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ انھوں نے ۱۹ مارچ کے طلوع اسلام کے مضمون پر تنقید فرمائی ہے۔ اگر وہ (کم از کم) ۱۹ فروری کا طلوع اسلام کھول کر دیکھ لیتے تو اس کے صفحہ ۵ پر انھیں یہ عبارت نظر آجاتی ہے

علامہ اقبال قرآنی تعلیم کے علمبردار تھے، اور اس باب میں انھوں نے جو قرآن کی خدمت کی ہے، اس پر ہمارا دور جس قدر بھی فخر کرے کم ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے ہاں بشریت کی خامیاں موجود ہیں۔ جس کا اظہار ان کے کلام میں بھی ہو جاتا ہے، اور نجی خطوط میں بھی (اس کے بعد اس کی دو مثالیں پیش کر کے لکھا گیا ہے) ظاہر ہے کہ یہ (غالباً غیر شعوری طور پر) ان جذبات کا اظہار ہے۔ جو ان کے بچپن کی تعلیم اور ماحول کی وجہ سے ان کے تحت الشعور میں جا گزیں تھے۔ اور جنھیں شعوری تدبر و تفکر بھی جڑ سے نہیں نکال سکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے راہ نمائی کے لئے صرف وحی کو سند قرار دیا ہے۔ نہ کہ کسی انسان کو۔ اس لئے کہ انسان خواہ کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو اپنے ماحول اور وراثتی اثرات سے غیر متاثر رہ نہیں سکتا

ہمیں امید ہے کہ محترم شاہ صاحب اب اس کا اعلان فرما دیں گے کہ طلوع اسلام میں ایسی تحریریں ہیں۔ جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ علامہ اقبال کو بشری کمزوریوں سے مبرا اور "امام معصوم" نہیں قرار دیتا۔

آخر میں ہم محترم شاہ صاحب کی خدمت میں نہایت ادب سے ضمناً گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ یہ بات صحافتی آداب میں داخل ہے کہ اگر کسی مجلہ یا اخبار میں کوئی چیز بغیر کسی نام کے شائع ہو تو اس کے سلسلہ میں اس مجلہ یا اخبار کو مخاطب کیا کرتے ہیں، نہ کہ کسی خاص فرد کو۔ اور اگر کسی فرد کی طرف اشارہ کرنا لا ینفک ہو جائے، تو اس کے مدیر کا نام لیا کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں جو کچھ بغیر نام کے شائع ہوتا ہے، اس کا ذمہ دار اور مسئول مدیر ہوتا ہے۔

انسان نے
اپنے معاشی مسئلہ
کا حل کیا سوچا؟ اور قرآن
اس کا کیا حل بتاتا ہے۔
اس کا جواب
نظامِ ربوبیت
میں دیکھئے
جو عنقریب شائع ہو رہی ہے

باب المراسلات

تاریخ کی اہمیت کراچی سے ایک صاحب دریافت کرتے ہیں کہ (۱) کسی قوم کی زندگی میں تاریخ کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟ (۲) مسلمانوں کی تاریخ کس حد تک قابلِ اعتماد ہے؟ اور (۳) ہمارے ہاں تاریخ کی کون سی کتاب ایسی ہے، جس کے مطالعہ کی ہم سفارش کرتے ہیں۔

طلوع اسلام قرآن کریم تاریخ اقوام کے مطالعہ پر بڑا زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے پیش کردہ حقائق کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے سامنے اس کے دور تک کا پورا علم اور اقوام سابقہ کے احوال و کوائف ہوں۔ ان اقوام کی تاریخ سے اس کے سامنے یہ حقیقت آ جائے گی کہ اگر کوئی قوم فلاں قسم کی روشِ زندگی اختیار کرے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا اور فلاں انداز کے مطابق چلے تو اس کا حاصل یہ ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے اس نے خود اقوام گذشتہ کی تاریخی سرگذشتوں کو بار بار دہرایا ہے۔

یہ تو رہا دوسری قوموں کی تاریخ کے متعلق۔ جہاں تک کسی قوم کی اپنی تاریخ کا تعلق ہے۔ اقبال نے کہا ہے کہ اس کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسی ایک فرد کے لئے حافظہ کی حیثیت ہوتی ہے۔ اگر کسی شخص کا حافظہ جاتا رہے تو اس کی سابقہ شخصیت پوری کی پوری محو ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی قوم کی تاریخ گم ہو جائے تو اس کا قومی تشخص بھی ختم ہو جاتا ہے اور باقی صرف افسانے رہ جاتے ہیں۔ تاریخ ہی وہ رشتہ ہوتا ہے جس سے ایک دور کا انسان اپنے ماضی کے ساتھ وابستہ رہ سکتا ہے اگر یہ رشتہ منقطع ہو جائے تو ماضی کے ساتھ اس کا تعلق بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ایک قوم کی زندگی میں اس کی تاریخ کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ اہمیت تاریخ کو حاصل ہوتی ہے افسانوں کو نہیں۔ اگر کسی قوم کی تاریخ باقی نہ رہے صرف افسانے رہ جائیں یا اس کی تاریخ میں افسانوں کی آمیزش ہو جائے۔ تو یہ چیز اس قوم کے حق میں نفع بخش ہونے کے بجائے ہلاکت آفریں بن جاتی ہے۔ اس قسم کی افسانوی تاریخ کا وجود اس کے عدم سے زیادہ نقصان رساں ہوتا ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ بہ حیثیت مجموعی چار ادوار پر تقسیم کی جا سکتی ہے۔ پہلا دور "محمد رسول اللہ والذین معہٗ" کا دور ہے۔ جس میں انھیں حکومت و مملکت ہی حاصل نہ تھی بلکہ نوعِ انسانی کے کاروانِ رشد و ہدایت کی قیادت بھی انہی کے حصے میں تھی۔ اس سے انھیں دنیا کی سرفرازیاں بھی حاصل تھیں اور آخرت کی خوشگواریاں بھی، پھر دوسرا دور وہ آیا جس میں ان کا قرآنی نظامِ زندگی ملوکیت میں بدل گیا۔ اب ان کے پاس دولت و قوت، حشمت و ثروت، حکومت و مملکت تو پہلے سے بھی زیادہ تھی۔ لیکن یہ قوم انسانیت کی امامتِ کبریٰ کی وارث نہیں رہی تھی۔ اس سے اگلا دور وہ ہے جس میں ان کی قوت و دولت اور حکومت و مملکت پر بھی زوال آ گیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ قوم پستی کی انتہا تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد ان کی تاریخ کا چوتھا دور عصرِ حاضر کا دور ہے۔ جس میں ان کے عروقِ مردہ میں پھر سے زندگی کے آثار دکھائی دینے لگے ہیں اور اندازہ ہونے لگا ہے کہ شاید یہ پھر اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکیں، اس دور کے مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ معلوم کرے کہ قوم ان مراحل سے کس طرح گذری ہے اور ان تغیرات کے اسباب و علل کیا تھے۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ ان کے سامنے اپنی قوم کی صحیح اور قابل اعتماد تاریخ ہو۔

یوں تو ہر قوم کی تاریخ نویسی ایک مشکل فن ہے لیکن مسلمانوں کی تاریخ کی صورت میں یہ مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے اس لئے کہ تاریخ میں شخصیتیں بہرحال سامنے آئیں گی۔ اور تاریخی شخصیتوں کے متعلق حالت یہ ہے کہ ہماری بعض کے ساتھ عقیدت وابستہ ہے اور بعض کے خلاف جذبۂ عناد۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ ہماری تاریخ کی کتابیں جنبہ داری یا تعصب سے بمشکل محفوظ ہوں گی۔ اس کے علاوہ ان عناصر کو بھی سامنے رکھئے جو اسلام میں تخریب پیدا کرنے کے لئے مصروفِ عمل رہے ہیں (تفصیل ان امور کی ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "قرآنی فیصلے" میں دیکھئے)

اب رہا آپ کا یہ سوال کہ ہم تاریخ کی کتابوں میں سے کون سی کتاب کی سفارش کرتے ہیں سو اگر آپ کا مقصد یہ ہے کہ ہم تاریخ کی کوئی ایسی کتاب بتائیں جس پر بالکلیہ اعتماد کیا جا سکے تو معاف رکھئے ہم اس سے قاصر ہیں البتہ ان کتابوں میں علامہ اسلم جیراجپوری کی تاریخ الامت ایسی ہے جو فی الجملہ دوسری کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ قابل اعتماد ہے۔ یہ مختصر سی کتاب (آٹھ حصوں پر مشتمل ہے) لیکن آجکل نایاب ہے۔ ہم نے اس کی افادی حیثیت کے پیش نظر اسے (جنابِ مصنف کی اجازت سے) پاکستان میں شائع کرنے کا انتظام کیا ہے۔ چنانچہ اس کا پہلا حصہ (جو سیرۃ رسول اللہ پر مشتمل ہے) اس وقت پریس میں ہے۔ یہ تمام حصے یکے بعد دیگرے شائع ہوتے جائیں گے۔

جہاں تک دورِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ کا تعلق ہے محفوظ ترین طریقہ یہ ہے کہ آپ ان کی تاریخ کو قرآن کریم کی روشنی میں مطالعہ کریں اور جو بات قرآن کے خلاف نظر آئے، اسے صحیح نہ سمجھیں۔ اس لئے کہ حضور نبی اکرمؐ اور آپ کے صحابہؓ قرآن پر عمل کرتے تھے۔ اس لئے ان کی سیرت کو قرآن کے مطابق ہونا چاہیئے۔

نقد ونظر

اردو کی نثری داستانیں قوموں کی زندگی میں ان کے لٹریچر کو خاص مقام حاصل ہوتا ہے، لٹریچر وہ نبض ہوتی ہے جس پر انگلیاں رکھ کر اس قوم کی حرارت اور حرکت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، نبضوں ہی کی طرح لٹریچر کی بھی مختلف قسمیں ہوتی ہیں بعض ہیجان بعض اعتدال پسند، بعض سکرات موت کی ہچکیوں کا آئینہ دار یہ چیز ایک حکیم الامت کے دیکھنے کی ہوتی ہے کہ قوم کی کس حالت میں کس قسم کے لٹریچر کے ابھارنے کی ضرورت ہے۔ لیکن چلو ذرا اس سے نیچے اتر کر دیکھئے۔ تو یہ کام بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے کہ قوم کے ہر طرح کے لٹریچر کو لیا جائے۔ اور اس کے متعلق چھان بین کی جائے۔ ہمارے ہاں انجمن ترقی اردو ایک ایسا ادارہ ہے جس نے اس مقصد کو اپنے سامنے رکھا ہے۔ زیر نظر کتاب اسی انجمن کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اور جہاں تک محنت اور تجسس کا تعلق ہے۔ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں اس کی مثال کم ہی مل سکتی ہے، حمیدیہ کالج بھوپال کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر گیان چند جین نے الہ آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے لئے ایک تحقیقاتی مقالہ لکھا جس میں یہ بتایا کہ اردو نثر میں داستانوں کی جو کتابیں رائج ہیں۔ ان کا سرچشمہ اولین کون ہے وہ کن کن راستوں سے گذریں اور اس وقت ان کی حالت کیا ہے۔ ان داستانوں میں "شرار عشق" جیسے چھوٹے چھوٹے قصوں سے لے کر الف لیلہ، داستان امیر حمزہ اور بوستان خیال تک کی ضخیم کتابیں سب شامل ہیں اور (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) ان میں سے ایک ایک کتاب کے متعلق اتنی کاوش سے کام لیا ہے کہ مصنف کی محنت کی داد دینی پڑتی ہے۔ جن حضرات کو لٹریچر کے اس صنف سے دلچسپی ہو، ان کے لئے یہ پر از معلومات کتاب بڑی مفید ثابت ہوگی۔ ضخامت چھ سو صفحات سے زیادہ۔ قیمت (بلا جلد) نو روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ۔ انجمن ترقی اردو پاکستان اردو روڈ کراچی، افسوس ہے کہ کتاب کی فہرست مرتب کرنے میں سہل انگاری سے کام لیا گیا ہے، اس کی فہرست بڑی تفصیلی ہونی چاہیئے تھی۔

جینے کا قرینہ مصنف آندرا موروا، مترجم مختار صدیقی ضخامت ۳۹۹ صفحے، مجلد گرد پوش قیمت چھ روپے۔ ناشر مکتبہ جدید لاہور۔

زیر نظر کتاب فرانسیسی مصنف آندرا موروا کی تصنیف ہے، جسے مختار صدیقی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اس میں انسانی زندگی کی روزمرہ کی الجھنوں، آپس میں پیدا ہونے والے اختلافات اور غلط فہمیوں کو خوبصورتی کے ساتھ دور کرنے اور خوشگوار زندگی بسر کرنے کے طریقوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے

آندرے موروا فرانس کے نامور ادیب ہیں۔ ان کی تخلیقات ملک میں کافی مقبول ہیں۔ انھوں نے زیر نظر کتاب میں اپنے ادبی ڈگر سے ہٹ کر نفسیاتی موضوع پر قلم اٹھایا ہے، محبت، شادی

(باقی صفحہ پر)

حدیث اور سنت کی حیثیت

مرزائی صاحبان کے نزدیک

اور ہم اس کے جواب میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر بیان کرتے ہیں کہ میرے اس دعوے کی بنیاد حدیث نہیں بلکہ قرآن اور وحی ہے جو میرے پر نازل ہوئی ہاں تائید کے طور پر ہم وہ حدیثیں بھی پیش کرتے ہیں جو قرآن شریف کے مطابق ہیں اور میری وحی کے معارض نہیں اور دوسری حدیثوں کو ہم ردی کی طرح پھینک دیتے ہیں۔

(اعجاز احمدی ص۳۰ مصنف مرزا غلام احمد قادیانی صاحب)

اور جو شخص حکم ہو کر آیا ہے، اس کو اختیار ہے کہ حدیثوں کے ذخیرہ میں سے جس انبار کو چاہے خدا سے علم پا کر قبول کرے اور جس ڈھیر کو چاہے خدا سے علم پا کر رد کر دے۔

(تحفہ گولڑویہ ص۱۰ مصنف مرزا غلام احمد قادیانی صاحب)

ایک شخص نے نہایت گستاخی اور بے ادبی سے لکھا ہے کہ احادیث جنہیں ہم اپنے محدود ناقص علم سے صحیح سمجھیں ان کے مقابلہ میں مسیح موعود کی وحی رہا وہ وحی جس کے بارے میں آپ فرماتے ہیں کہ یہ وحی دوسرے انبیاء علیہ سلام کی طرح شبہات سے پاک و منزہ ہے) رد کر دینے کے قابل ہے۔ اس نادان نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ اس طرح تو اسے مسیح موعود (مرزا صاحب) کے دعاوی صادقہ سے بھی انکار کرنا پڑیگا کہ وہ احادیث جن سے آپ کا دعویٰ ثابت ہوتا ہے لا مہدی الا عیسیٰ بن مریم، و علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل اور تنکسف القمر لاول لیلۃ من رمضان یہ سب محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں۔ مگر خدا کے مامور نے جب اپنے دعوے کا صدق الہامات کے ذریعہ پیش گوئیوں اور دیگر نشانات سے ثابت کر دیا۔ تو پھر ہم نے آپ کو حکم و عدل مان لیا، اور جس حدیث کو آپ نے صحیح کہا وہ ہم نے صحیح سمجھی اور جسے آپ نے متشابہ قرار دیا، اسے ہم نے حکم کے تابع کر لیا اور جس حدیث کے بارے میں فرمایا یہ چھوڑ دینے کے قابل ہے وہ چھوڑ دی کیونکہ حدیث تو راویوں کے ذریعہ ہم تک پہنچی اور ہم کو معلوم نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا۔ مگر خدا کا زندہ رسول (مرزا صاحب) جو ہم میں موجود تھا، اس نے خدا سے یقینی علم پا کر امر حق پر اطلاع دی، اور جب وہ اتباع کامل نبوی سے نبی ہوا تو ہم نے مان لیا کہ آپ کے قول و فعل کے خلاف اگر کوئی حدیث بیان کی جائے تو ہم اسے قابل تاویل سمجھیں گے۔ اس لئے کہ جو باتیں ہم نے مسیح موعود سے سنیں۔ وہ اس راوی کی روایت سے زیادہ معتبر ہیں، جسے حدیث میں بتایا جاتا ہے

(اخبار الفضل قادیان جلد ۲ نمبر ۱۳۳۔ مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۱۵ء)

قرآن کریم اور الہامات مسیح موعود دونوں خدا تعالیٰ کے کلام ہیں، دونوں میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے مقدم رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حدیث تو بیسیوں راویوں کے پھیرے سے ہمیں ملی ہے۔ اور الہام براہ راست اس لئے (مرزا صاحب کا) الہام مقدم ہے۔ نہ اس لئے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے معتبر ہے بلکہ اس لئے کہ اس کے راوی اس کے راویوں سے معتبر ہیں۔ مسیح موعود سے جو باتیں ہم نے سنی ہیں وہ حدیث کی روایت سے معتبر ہیں کیونکہ حدیث ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے نہیں سنی، سچی حدیث اور مسیح موعود کا قول مخالف نہیں ہو سکتے۔

(میاں محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان کا ارشاد۔ مندرجہ اخبار الفضل قادیان جلد ۲ مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۱۵ء)

چنانچہ حضرت مسیح موعود بڑی وضاحت سے فرماتے ہیں مولوی لوگ حدیثیں لئے پھرتے ہیں۔ مگر حدیثوں کا یہ کام نہیں کہ میرے متعلق فیصلہ کریں بلکہ میرا کام یہ ہے کہ میں بتاؤں کہ فلاں حدیث درست ہے اور فلاں غلط . . . . پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جب کوئی نبی آ جائے تو پہلے نبی کا علم بھی اسی کے ذریعہ ملتا ہے۔ یوں اپنے طور پر نہیں مل سکتا۔ اور ہر بعد میں آنیوالا نبی پہلے نبی کے لئے بمنزلہ سوراخ کے ہوتا ہے۔ پہلے نبی کے آگے دیوار کھینچ دی جاتی ہے اور کچھ نظر نہیں آتا سوائے آنے والے نبی کے ذریعہ دیکھنے کے۔ یہی وجہ ہے کہ اب کوئی قرآن نہیں سوائے اس قرآن کے جو حضرت مسیح موعود نے پیش کیا۔ اور کوئی حدیث نہیں سوائے اس حدیث کے جو حضرت مسیح موعود کی روشنی میں نظر آئے اور کوئی نبی نہیں سوائے اس نبی کے جو حضرت مسیح موعود کی روشنی میں دکھائی دے اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اسی ذریعہ سے نظر آئیگا کہ حضرت مسیح موعود کی روشنی میں دیکھا جائے۔ اگر کوئی چاہے کہ آپ سے علیحدہ ہو کر کچھ دیکھ سکے۔ تو اسے کچھ نظر نہ آئے گا۔ ایسی صورت میں اگر کوئی قرآن کو بھی دیکھیگا۔ تو وہ اس کے لئے "یہدی من یشاء" والا قرآن نہ ہوگا بلکہ "یضل من یشاء" والا قرآن ہوگا۔ اسی طرح اگر حدیثوں کو اپنے طور پر پڑھیں گے۔ تو وہ مداری کے پٹارے سے زیادہ وقعت نہ رکھیں گی۔ حضرت مسیح موعود فرمایا کرتے تھے۔ حدیثوں کی کتابوں کی مثال مداری کے پٹارے کی ہے۔ جس طرح مداری جو چاہتا ہے اس میں سے نکال لیتا ہے۔ اسی طرح ان سے جو چاہو نکال لو۔

(میاں محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان کا خطبہ جمعہ مندرجہ اخبار الفضل قادیان جلد ۱۲ مورخہ ۱۵ جولائی ۱۹۲۴ء)

صحیح حدیثیں صرف وہ ہیں جو ان کے لئے مفید مطلب ہیں

اس امت میں نبی کا نام پانے کے لئے میں ہی مخصوص کیا گیا اور دوسرے تمام لوگ اس نام کے مستحق نہیں، اور ضرور تھا کہ ایسا ہوتا۔ جیسا کہ احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ ایسا شخص ایک ہی ہوگا وہ پیش گوئی پوری ہو جائے۔

(حقیقۃ الوحی ص ۳۹۱ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی صاحب)

اس امت میں نبی صرف ایک ہی آ سکتا ہے جو مسیح موعود ہے اور قطعاً کوئی نہیں آ سکتا۔ جیسا کہ دیگر احادیث پر نظر کرنے سے یہ امر محقق ہو چکا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف مسیح موعود کا نام نبی اللہ رکھا ہے۔ اور کسی کو یہ نام ہرگز نہیں دیا۔

(رسالہ تشحیذ الاذہان۔ قادیان جلد نمبر ۹ نمبر ۳ ص ۳۰ تا ۳۲ ماہ مارچ ۱۹۱۴ء)

پس یہ آیت "یا ایھا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما" کی رو سے اور ان احادیث کی رو سے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کی تاکید پائی جاتی ہے حضرت مسیح موعود (مرزا صاحب) علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود بھیجنا بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھیجنا ازبس ضروری ہے

(رسالہ درود شریف مصنفہ محمد اسمٰعیل صاحب قادیانی ص ۱۳۶)

از روئے سنت اسلام و احادیث نبویہ ضروری ہے کہ تصریح سے آپ کی آل کو بھی درود میں شامل کیا جائے۔ اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر یہ بات ضروری ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بھی تصریح سے درود بھیجا جائے اور اس اجمالی درود پر اکتفا نہ کیا جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کے وقت آپ کو بھی پہونچ جاتا ہے۔

(رسالہ درود شریف بحوالہ الاربعین نمبر ۲ ص ۶ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی صاحب)

نبوت کا دروازہ کھلا ہے

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں صرف محدثیت ہی جاری نہیں۔ بلکہ اس سے اوپر نبوت کا سلسلہ جاری ہے، پس یہ بات بالکل روز روشن کی طرح ثابت ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ کھلا ہے اور جب کہ نبوت کا دروازہ علاوہ محدثیت کے امت محمدیہ میں کھلا ثابت ہو گیا۔ تو یہ بھی ثابت ہو گیا کہ مسیح موعود بھی نبی اللہ تھے۔

(حقیقۃ النبوۃ ص ۲۲۸۔۲۲۹ مصنفہ میاں محمود احمد خلیفہ قادیان)

حقیقی نبی

پس شریعت اسلامی نبی کے جو معنی کرتی ہے۔ اس کے معنی سے حضرت (مرزا صاحب) ہرگز مجازی نبی نہیں ہیں بلکہ حقیقی نبی ہیں۔

(حقیقۃ النبوۃ ص ۱۷۴ مصنفہ میاں محمود احمد خلیفہ قادیان)

حضرت مسیح موعود (مرزا صاحب) نے اپنے آپ کو کھلے طور پر نبی اللہ اور رسول اللہ پیش کیا ہے، اور اپنے آپ کو زمرۂ انبیاء

مرسلین میں شامل فرمایا ہے۔ اور جن آیات قرآنیہ کو اپنے دعوے میں پیش کیا ہے ان میں صریح طور سے الفاظ رسول یا مرسل کے موجود ہیں۔ جن کا حضور (مرزا صاحب) نے اپنے آپ کو مصداق ٹھہرایا ہے۔ پس آیات قرآنیہ جن کے لفظ رسول کا اپنے آپ کو مصداق ٹھہرانا صاف اور صریح اس امر کی بیّن دلیل ہے کہ حضرت مسیح موعود من حیثیت النبوۃ ان ہی معنوں میں نبی اللہ اور رسول اللہ تھے۔ جن معنوں میں ان آیات سے دیگر انبیاء یقین مراد لیے جاتے ہیں۔

(اخبار الفضل قادیان جلد ۲ نمبر ۳۸ مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۱۴ء)

نبی کس لیے آتے ہیں؟

نیا دین انبیاء اس لیے آتے ہیں تا کہ ایک دین سے دوسرے دین میں داخل کریں۔ اور ایک قبلہ سے دوسرا قبلہ مقرر کرا دیں اور بعض احکام کو منسوخ کریں اور بعض نئے احکام لا دیں

(مکتوبات احمدیہ جلد پنجم نمبر چہارم ص۳۳ مجموعہ مکتوبات مرزا غلام احمد قادیانی صاحب)

اب اتباع کس کی سنت کی ہوگی

سوال:۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام (مرزا صاحب) کے بعد بھی جب نبی آنے کا امکان ہے۔ تو آپ کو آخری زمانہ کا نبی کہنے کا کیا مطلب ہے؟

جواب:۔ آخری زمانہ کا نبی اصطلاح ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے توسط کے بغیر کسی کو نبوت کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا اب کوئی ایسا نبی نہیں آ سکتا۔ جو پہلے کہ رسول کریمؐ سے براہ راست تعلق پیدا کر کے نبی بن سکا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ میری اتباع کے بغیر کسی کو قرب الٰہی حاصل نہیں ہو سکتا پس آئندہ خواہ کوئی نبی ہو۔ اس کے لیے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانا ضروری ہے۔

(ارشاد میاں محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان مندرجہ اخبار الفضل قادیان نمبر ۱۳۰ جلد ۲۰ مورخہ ۲ مئی ۱۹۳۳ء)

اے مسلمان کہلانے والو! اگر تم واقعی اسلام کا بول بالا چاہتے اور باقی دنیا کو اپنی طرف بلاتے ہو تو پہلے خود سچے اسلام کی طرف آ ؤ جو مسیح موعود (مرزا غلام احمد قادیانی صاحب) میں ہو کر ملتا ہے۔ اسی کے طفیل آج بِرّ و تقویٰ کی راہیں کھلتی ہیں۔ اس کی پیروی سے انسان فلاح و نجات کی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے وہ وہی فخر اولین اور آخرین ہے جو آج سے تیرہ سو برس پہلے رحمت اللعالمین بن کر آیا تھا۔ اور اب اپنی تکمیل تبلیغ سے ذریعہ ثابت کر گیا کہ واقعی اس کی دعوت جمیع ممالک و ملل عالم کے لیے تھی۔ فصلی اللہ علیہ وسلم۔

(اخبار الفضل قادیان جلد ۳ نمبر ۴۱ مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۹۱۵ء)

[یہ ہے مرزا صاحب اور ان کے متبعین کے نزدیک احادیث نبویؐ اور اتباع سنت رسول اللہؐ کی حیثیت، خدا کی شان کہ یہ لوگ بھی طلوع اسلام کو "منکر حدیث" اور "منکر سنت" قرار دے کر مطعون کرتے رہتے ہیں۔ (طلوع اسلام)

مطبوعات طلوع اسلام

معراج انسانیت — (از پرویز)۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرور کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ بڑے سائز کے تقریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ مضبوط و حسین جلد مع گرد پوش۔ قیمت بیس روپے

ابلیس و آدم — (از پرویز) سلسلہ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق۔ قصۂ آدم۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۴ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستور پاکستان — اس میں پاکستان کے لیے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت۔ علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ ۲۴۴ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۲۰۸ صفحات قیمت دو روپے

سلیم کے نام — (از پرویز)۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوئے ہیں ان کا شگفتہ مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۲۲۵ صفحات۔ قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے — روزمرہ کی زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے

اسباب زوال امت — (از پرویز)۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ۱۵۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے — ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دور آزادی کی سسکتی ہوئی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناس رسول — یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول! مزاج شناس کون ہیں۔ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۴۰ صفحات۔ قیمت چار روپے

مقام حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے تقریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد چار روپے

فردوس گم گشتہ — (از پرویز)۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے۔ اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف چار سو سولہ صفحات۔ قیمت چھ روپے۔

نوادرات — از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت — (از پرویز) مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ بکھری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔ صفحات ۱۹۲ قیمت دو روپے

نوٹ:۔ تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ ادارۂ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۳۱۲۔ کراچی

حقائق و عبر

تکلف برطرف

۲ر اپریل کے طلوع اسلام میں ہم نے ایک مضمون "قرآن اور حدیث کی صحیح پوزیشن" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ جیسا کہ ہم نے نوٹ میں واضح کر دیا تھا۔ وہ مضمون مولانا مودودی کی تحریروں سے اس طرح مرتب کیا گیا تھا کہ تمام الفاظ انہی کے تھے۔ ہم نے جن جن اقتباسات کو نقل کیا ان کے حوالے بھی دیدیئے تھے اور یہ لکھ دیا تھا کہ قارئین حوالے دیکھ کر اپنا اطمینان خود کر لیں کہ اقتباسات سیاق و سباق کے مطابق ہیں۔ یا توڑ موڑ کر لکھے گئے ہیں، ہم نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ ان اقتباسات کو یکجا کرنے سے جو مسلک سامنے آتا ہے بعینہٖ وہی طلوع اسلام کا ہے لیکن اس کے باوجود طلوع اسلام کو منکر حدیث اور کیا کیا کچھ کہہ دیا جاتا ہے؟ اور جماعت اسلامی اور اس کے امیر سب سے بڑے حامی حدیث اور متبع سنت بنتے ہیں۔

اس پر معاصر "تسنیم" بہت چراغ پا ہوا ہے، اس نے یہ نہیں بتایا کہ اقتباسات غلط ہیں یا انہیں سیاق و سباق سے توڑ موڑ کر لکھا گیا ہے، بلکہ اس نے یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اگر کوئی شخص نیچے حاشیے میں حوالے نہ دیکھے تو وہ یہ بھی نہیں جان سکتا کہ ان نقروں کا حسب و نسب کیا ہے؟ یعنی اعتراض ملاحظہ فرمایئے کہ اگر کوئی شخص ان حوالوں کو نہ دیکھے جو خود طلوع اسلام نے دیدیئے ہیں تو وہ یہ نہ کہہ سکے گا کہ اقتباسات کہاں سے لئے گئے ہیں انہیں کون بتائے کہ حوالے دیئے ہی اس لئے جاتے ہیں کہ ان سے مضمون کا ماخذ معلوم ہو سکے اور اگر کوئی شخص حوالوں کو نہ دیکھے تو چشمۂ آفتاب را چہ گناہ۔ لیکن یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کے بعد ارشاد ہے۔

تفسیر کا ایک مشہور اصول تفسیر قرآن بالقرآن ہے یعنی اگر قرآن کی کسی آیت کا مطلب سمجھنا ہو تو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا خود قرآن میں کسی دوسرے مقام پر کوئی آیت اس کی تشریح کرتی ہے؟ اگر قرآن ہی سے کسی آیت کی تشریح ہو جائے تو یہ تشریح سب سے معتبر اور مستند سمجھی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی نظام ربوبیت کے مدعیوں نے جو قرآن کے بغیر نوالہ نہیں توڑتے مولانا مودودی کے معاملہ میں بھی یہی اصول اختیار کیا ہے۔ اور ان کے کلام کی تفسیر انہی کے کلام سے کی ہے۔

انداز تحریر سے مترشح ہوتا ہے کہ انہیں اس اصول پر تو اعتراض نہیں کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے۔ البتہ اعتراض اس پر ہے کہ مولانا مودودی کے کلام کی تفسیر انہی کے کلام سے کیوں کی جائے؟ گویا مودودی صاحب کے کلام کی تفسیر ان کے کلام میں تلاش نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ کہیں اور ڈھونڈھنی چاہیئے، کیا "تسنیم" ہمیں بتائے گا کہ وہ "مثلاً مع" کیا ہے جس سے مودودی صاحب کے کلام کی تفسیر ہو سکتی ہے اور وہ کہاں سے دستیاب ہوتی ہے؟

تکلف برطرف ہم صالحین جماعت اسلامی سے باادب پوچھتے ہیں کہ اگر مودودی صاحب کے مفہوم و معانی کو ان کے کلام میں نہ ڈھونڈا جائے تو اور کہاں دیکھا جائے۔ نیز ہم نے اقتباسات کو ترتیب دے کر جو معانی پیدا کئے ہیں، اگر وہ غلط ہے، تو ہمیں بتایئے کہ قرآن اور حدیث کی صحیح پوزیشن کے بارے میں مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کا نظریہ کیا ہے؟ اگر مودودی صاحب کا کوئی مربوط مضمون ایسا ہے جس سے اس باب میں ان کا مسلک بیک جا واضح ہو جاتا ہے، تو اس کی نشان دہی کر دیجئے تاکہ ہم اسے دیکھ سکیں، اگر مودودی صاحب کے علاوہ کسی اور صاحب نے کہیں اور یہ پوزیشن واضح کی ہے۔ تو از راہ کرم وہ ہمیں بتا دیجئے، تاکہ معاملہ صاف ہو جائے، لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ حضرات کبھی متعین طور پر نہیں بتائیں گے (نہ مودودی صاحب نہ ان کے متبعین) کہ ان کے نزدیک حدیث و سنت کی پوزیشن کیا ہے، ان کی تکنیک یہ ہے کہ کسی ایک جگہ بات واضح اور متعین طور پر نہ کہی جائے، ہر بات مبہم رکھیے اور ہر جگہ متضاد بات کہیے۔ تاکہ اس مداری کے پٹارے سے جس وقت جی چاہے حسب منشا مبات نکال لی جائے۔

ہم جماعت اسلامی کے ذمہ دار حضرات سے پھر درخواست کرتے ہیں کہ وہ حدیث اور سنت کے بارے میں اپنا اور مودودی صاحب کا متعین مسلک بتائیں۔ تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ منکر حدیث کون ہے۔

سنت رسول اللہ

۲ر اپریل کے طلوع اسلام میں عنوان بالا کے تحت لمعات میں یہ بتایا گیا تھا کہ ہمارے نزدیک اتباع سنت کی صحیح پوزیشن کیا ہے ہم نے اس کے ساتھ ہی پاکستان کے مختلف افراد اور اداروں سے بالعموم اور جماعت اسلامی سے بالخصوص یہ درخواست کی تھی کہ وہ ہمیں بتائیں کہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کوئی غلطی ہے اور ہے تو کہاں؟ اس مقالہ کی اشاعت کے بعد ہم نے نعیم صدیقی اور امین احسن اصلاحی صاحبان کی خدمت میں خطوط لکھ کر ان کی توجہ اس درخواست کی طرف مبذول کرائی، اس وقت تک ان کی طرف سے (نہ کسی اور طرف سے) ہمیں کوئی جواب موصول ہوا ہے ہمیں توقع ہے کہ وہ ہماری درخواست پر ضرور غور کریں گے۔ (طلوع اسلام)

نقد و نظر (ص۱۵ سے آگے)

گرہست، دوستی، غور و فکر، کام، قیادت، بڑھاپا اور مسرت کے عنوانوں پر دلچسپ بحث کی ہے، ان کی بحث کا انداز عام فہم اور دل نشین ہے، گو ہر باب اپنی جگہ پر مکمل ہے لیکن پوری کتاب میں ربط اور تسلسل بھی موجود ہے عوام اور خواص ہر طبقے کو اس کتاب میں ان کی دلچسپی اور ان کے ذوق کی تسکین کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور مل جائے گا۔ ترجمہ رواں اور شگفتہ ہے، جب ہم اس قسم کی کتابوں کو دیکھتے ہیں تو بے اختیار ہمارے لب تاسف آگین ہو جاتے ہیں کہ اگر ان لوگوں کے سامنے وحی کی روشنی ہوتی۔ تو جس زندگی کی تلاش میں یہ اس قدر مضطرب و بیقرار رہتے ہیں۔ وہ کس طرح از خود بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آ جاتی۔ لیکن وحی کی روشنی ان تک کیسے پہنچے جب وحی کے وارثین کی اپنی زندگی اس قدر تلخ اور ناکام ہے کہ وہ اپنی راہ نمائی کے لئے ان لوگوں کی دریوزہ گری کرنے پر مجبور ہو رہی ہے۔

پیشگی خریدار

پیشگی خریداروں کی تجویز کے سلسلہ میں عام طور پر یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ماہانہ قسطیں پچیس روپے کی نہ ہوں بلکہ کم کی ہوں چنانچہ قارئین کی سہولت کے لئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ایک سو روپے کی پیشگی رقم دس روپے کی ماہانہ قسطوں میں بھی ادا کی جا سکتی ہے، جو اصحاب اس سے زیادہ کی ماہانہ قسط دینا چاہیں وہ حسب منشاء ایسا کر سکتے ہیں۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

طلوع اسلام کا دفتر

۲۳/۱ فاؤلرز لائن۔ نیپئر بارکس میں واقع ہے

صدر کی طرف سے آنے والے حضرات نیپئر بارکس میں داخل ہو کر بجائے سیدھے جناح اسپتال کی طرف جانے کے بائیں ہاتھ ڈرگ روڈ کی طرف مڑ جائیں تو تھوڑے فاصلہ پر بائیں ہاتھ کو پی، ڈبلیو، ڈی کے انکوائری آفس کے عقب میں طلوع اسلام کا دفتر ہے۔

اسی دفتر میں

ہر اتوار کو صبح ۹ بجے

محترم پرویز صاحب قرآن پر لیکچر دیتے ہیں۔

سلسلہ مطبوعات طلوع اسلام

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلق اویسؓ و چادر زہراؓ
(اقبال)

مزاج شناس رسولؐ

جماعتِ اسلامی کی خطرناک ڈکٹیٹرشپ پر
طلوع اسلام کا بے لاگ تبصرہ

شائع کردہ
ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

ضخامت ۴۴۸ صفحات - مجلد مع گرد پوش -
قیمت -/۴ روپے علاوہ محصول ڈاک

دورِ حاضرہ کی ایک عجیب و غریب کتاب
ہماری بصیرت کے مطابق

قرآنی فیصلے

ایسے متعدد امور کے متعلق جنہیں
سمجھا کچھ اور جاتا ہے - اور وہ ہیں کچھ اور

شائع کردہ۔ ادارہ طلوع اسلام کراچی

ضخامت ۴۰۸ صفحات مجلد مع گردپوش
قیمت -/۴ روپے علاوہ محصول ڈاک

سلسلہ مطبوعات طلوع اسلام

بچوں، عورتوں کم پڑھے لکھے لوگوں اور سرکاری ملازموں کیلئے

اسلامی معاشرت

جس میں آسان زبان میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کسے کہتے ہیں
اور قرآن کی رو سے مسلمانوں کا معاشرہ کس قسم کا ہونا چاہیئے

پرویز

شائع کردہ
ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

ضخامت ۱۹۲ صفحات مجلد مع گرد پوش
قیمت -/۲ روپے علاوہ محصول ڈاک

اسبابِ زوالِ امت

قیمت -/۸/۱ روپیہ

اسلامی نظام

قیمت -/۲ روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ - کراچی

فردوسِ گم گشتہ

دورِ حاضرہ کے نوجوان طبقے کے دلوں میں جس عقابی روح کی بیداری کے
آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ اُس کے بال و پر کی بالیدگی میں
"مفسرِ قرآن" و "ترجمانِ اقبال" جناب پرویز
کے فکرِ عمیق اور اسلوبِ بلیغ کا حصہ نمایاں ہے۔
"فردوسِ گم گشتہ" اسی صاحبِ نظر کے فکر و اسلوب کا دلکش مجموعہ ہے
جو ملت کی متاعِ گم شدہ کی بازیابی کی راہ بتاتا ہے۔ اور ہر حساس
قلب کو جس میں تخلیقِ نو کی آرزو موجزن ہے، پکار پکار کر کہتا ہے کہ

صورت گری را از من بیاموز
شاید کہ خود را باز آفرینی

ضخامت ۲۱۴ صفحات مجلد مع گرد پوش قیمت -/۶
علاوہ محصولِ ڈاک

Title Printed at Mueid Art Press. Thathai Compound. Bunder Road. Karachi. Text at Adabi Press. Robson Road, Karachi.

طلوع اسلام

جلد ۸
شمارہ ۱۲

کراچی: ہفتہ ۔ ۲۳ ۔ اپریل ۱۹۵۵ء

قیمت چار آنہ
سالانہ دس روپے

بیاد گار اقبال

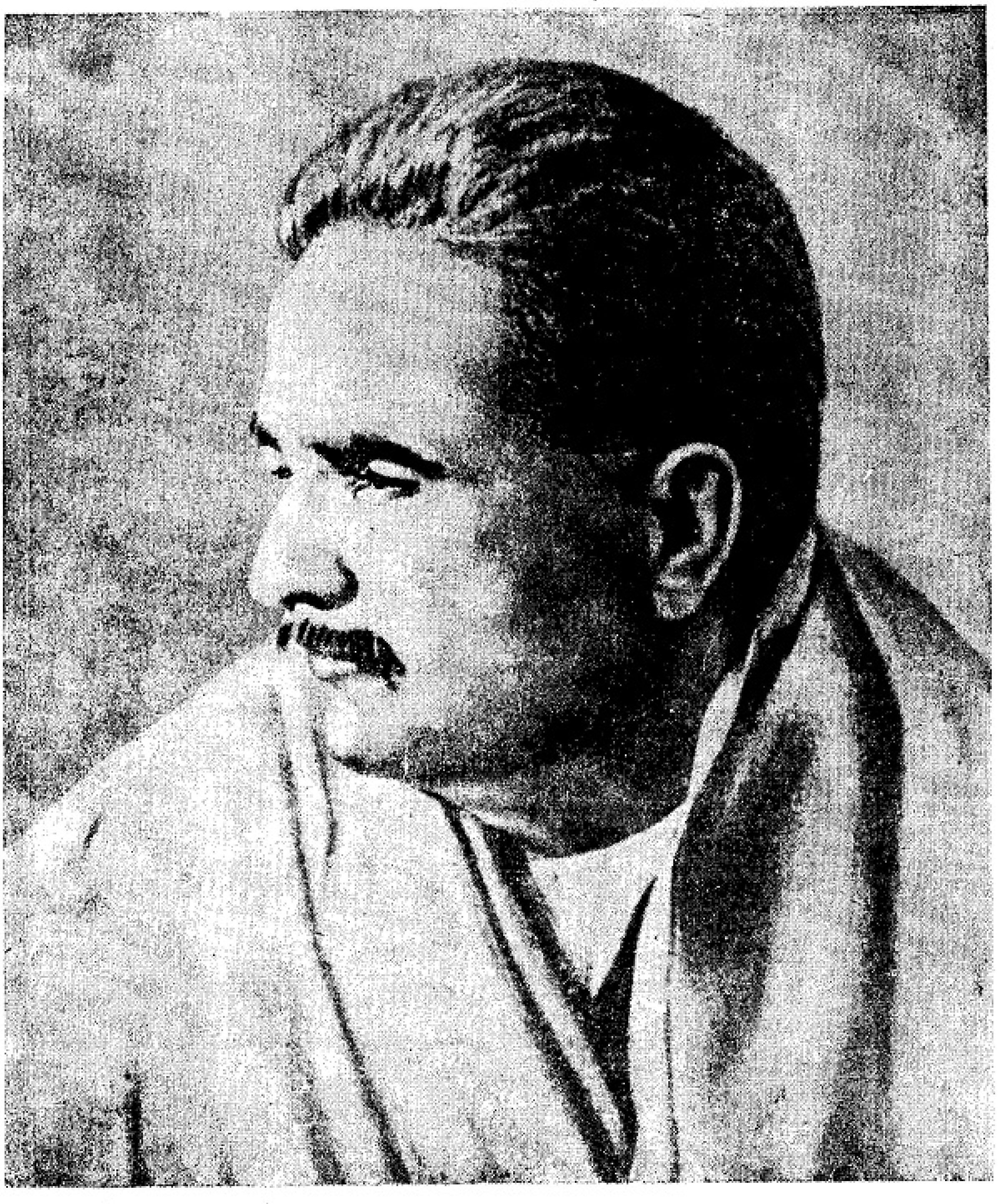

Contents of Tolu-e-Islam Magazine
23 April 1955

مجلسِ قلندرانِ اقبال	Page 3
نشانِ منزل	Page 5
یومِ اقبال	Page 6
نظامِ پاکستان کے متعلق علامہ اقبال کا خط	Page 7
سرودِ رفتہ	Page 7
جنابِ سالک کی کتاب کا ادبی تبصرہ	Page 8
مُلکِ خداداد کا تصوّر	Page 9
اِقبال کا پاکستان	Page 10
روٹی کا مسئلہ	Page 14
کشمیر ـــــ اقبال کی نظر میں	page 16
درِ منثور	Page 18
ضربِ کلیم	Page 20
تلمیحاتِ اقبال	page 25

مجلسِ قلندرانِ اقبال

(بیٹھے ہوئے دائیں سے بائیں) عبدالرب - پرویز - عبدالوہاب عزام - حفیظ جالندھری
(کھڑے ہوئے دائیں سے بائیں) سراج الحق - حمید انصاری - عبدالشکور - عزیز الحسن - عارف حسین - خورشید عالم - مجیب انصاری

مجلسِ قلندرانِ اقبال

(خورشید)

شروع ۱۹۵۱ء کا ذکر ہے کہ محترم پرویز صاحب کو یہ پیغام ملا کہ نئے سفیر مصر ان سے ملنے کے متمنی ہیں۔ مملکت مصر کا نمائندہ اور ایک درویش سے ملنے کی خواہش! بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ پرویز صاحب اسی پر محو تحیر تھے کہ پیغامبر نے کہا کہ ان کے اس شوقِ ملاقات کا جذبہ محرکہ وہ نسبت ہے جو آپ کو اقبال سے ہے۔ اس پر پرویز صاحب کی آنکھوں کے سامنے یہ سارا نقشہ پھر گیا (جس کا تجربہ انھیں عمر بھر ہوتا رہا ہے) کہ کس طرح "بڑے لوگ" ضرورت کے وقت اقبال سے وابستگی کا اظہار کرتے ہیں اور ایسے ضرورت کے موقع پر وہ طالب علمانِ اقبال کو کیسے استعمال کرتے ہیں۔ اس خیال نے پرویز صاحب کے دل سے اس ملنے سے ردعمل کو بھی ختم کر دیا جو مجرد تمنائے ملاقات سے قدرتاً پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ انھوں نے معذوری کا اظہار کیا۔ لیکن پیغامبر (سید عبدالواحد صاحب سکرٹری مجلس اقبال) نے اصرار کیا اور یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ صاحب موصوف کی طلب صادق ہے اور جذبہ خالص۔ ناچار پرویز صاحب آمادۂ ملاقات ہوگئے۔

پہلی ملاقات سفارت خانہ مصر میں ہوئی۔ یہ اس لئے کہ پرویز صاحب خود وہاں چلے گئے۔ ورنہ سفیر صاحب نے تو یہ کہلا بھیجا تھا کہ انھیں بتایا جائے کہ کب اور کس وقت وہ پرویز صاحب سے ملنے کے لئے آئیں؟ سفارت خانے عجیب دنیا ہوتے ہیں۔ ان میں جھانک کر دیکھئے، شان و شوکت، ٹھاٹھ، تصنع، تکلف، ظاہرداری (بے اختیار منافقت کا لفظ زبان قلم پر آ رہا ہے) اور دیگر بے شمار بظاہر حسین مگر بہ باطن خبیث دختران بادر ڈپلومیسی قدم قدم پر نظر آئیں گی۔ یہ تن کی دنیا ہے جو سود و سودا اور مکر و فن سے معمور ہے نہ کہ سوز و مستی جذب و شوق سے آباد من کی دنیا۔ اس جہانِ گندم و جو میں ان درویشوں کا کہاں گذر جن کے قلوب و اذہان میں قرآن اور اقبال نے اقدار کی ایک ایسی دنیا بسا رکھی ہو جس میں اضطراب موج کے ساتھ ساتھ سکون گہر بھی ہو۔ جو بدلتے رہنے کے باوجود نہ بدلیں، اور جن کی حالت یہ ہو:

زبیرون درگذشتم ز درون خانہ گفتم
سخنِ نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم

بہرحال پرویز صاحب گئے اس حال میں کہ "آیا نہیں لایا گیا ہوں میں" سفیر مصر ڈاکٹر عبدالوہاب عزام سے ملاقات ہوئی اور گفتگو شروع ہوئی، چند ہی لمحوں کے بعد پرویز صاحب نے محسوس کیا کہ وہ کلاہِ نمائندہ شاہی میں نہیں بلکہ کسی حجرۂ درویش میں ہیں، وہ درویش خدامست جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔ ایک طرف ان کا علم و فضل تھا جو عالمانہ نمائش سے پاک تھا، اس میں سراسر طالب العلمانہ تجسس تھا، دوسری طرف ان کا عشق تھا جس نے انھیں سراپا سوز و گداز بنا رکھا تھا۔ یہ اقبال ہی کا فیض ہو سکتا تھا۔ اب پرویز اور عزام اس دنیا میں تھے جہاں تمام حجابات یک لخت اٹھ جاتے ہیں اور ملنے والے "من تو شدم تو من شدی" کی حقیقی "الفتہ بین قلوبکم" کی تصویر بن جاتے ہیں۔

یہ منفرد ملاقات "مجلس قلندران اقبال" کا نقش اول بنی۔ اس بے مثل مجلس کی کوئی باقاعدہ رسمی تاسیس نہیں ہوئی۔ حق تو یہ ہے کہ اس کا بیج ارکان مجلس کی کشت جاں میں بو دیا گیا۔ اس کا باقاعدہ نام بھی تجویز نہیں ہوا۔ جوں جوں سفر بڑھتا گیا مجلس کا نقشہ صاف تر ہوتا گیا۔ تاآنکہ ایک وقت اسے مجلس قلندران اقبال کہہ دیا گیا، اور پھر اسے یہی کہا جانے لگا۔ بہرحال مجلس کی طرح یوں پڑی کہ عزام صاحب نے جو پیام مشرق کا عربی ترجمہ مکمل کر چکے تھے، اور اس کی اشاعت کے انتظامات میں مصروف تھے یہ خواہش ظاہر کی کہ انھیں (عزام صاحب اور پرویز صاحب کو) باقاعدہ ملتے رہنا چاہیئے تاکہ وہ آئندہ جس کتاب کا ترجمہ کریں اسے ترجمے سے پہلے اکٹھے بیٹھ کر از اول تا آخر پڑھ لیں۔ سید عبدالواحد صاحب جنھوں نے پیغامبری کے فرائض سرانجام دیئے تھے بے اختیار بول اٹھے کہ اگر ایسی بات ہے تو اس میں انھیں بھی شریک کیا جائے تاکہ وہ بھی ان مباحث سے مستفید ہو سکیں۔ اس سے بات چل نکلی اور یہ فیصلہ ہوا کہ جو اور احباب اس محفل میں شریک ہونا چاہیں انھیں بھی شریک کر لیا جائے۔ لیکن صرف انہی کو جو اس میں قلندرانہ رنگ میں شریک ہونا چاہیں۔ اس طرح ایک باقاعدہ اجتماع منعقد ہونا شروع ہوا۔

رفتہ رفتہ قلندروں کی تعداد ایک درجن کے لگ بھگ پہنچ گئی۔ گو ایسے حضرات بھی تھے جو آتے رہے اور کبھی کبھی آ جاتے تھے لیکن ایک درجن کے قریب بالعموم پابندی سے شریک مجلس ہوتے رہے۔ لفظ "پابندی" شاید موزوں نہ ہو۔ لیکن ہم سب کا یہ حال تھا کہ مجلس ہو رہی ہوتی تو ہم اس میں شریک ہوتے تھے اور نہیں ہو رہی ہوتی تھی تو اس کے لئے انتظار اور تمنا میں لگے رہتے تھے۔ ہمارے لئے یہ وہ فضا تھی جس کے بغیر سینے کی کشود ممکن ہے نہ قلب کا حضور۔ اور جب یہ دولت ہاتھ آ جاتی ہے تو کوئی اس کو بہ قیام ہوش و حواس ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اور قلندران اقبال کے لئے تو ہوش و حواس کا کھونا از قبیل محالات ہے۔

با چنیں زور جنوں پاس گریباں داشتم
در جنوں از خود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست

مجلس بالعموم ہفتے میں ایک بار ہوا کرتی تھی۔ ہفتہ واری اجتماع، کسی مجلس کے لئے بظاہر بڑا کافی ہے لیکن جس کے نزدیک گردش بیل و نہار کا معیار "اوقات جہاں بودکہ با یار بسر رفت" ہو، انھیں تو ہر وقت یہ خلشِ احساس رہتی ہے کہ "حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد"۔ مجلس کے لئے دن کا کوئی تعین نہیں تھا۔ گو وقت عموماً شام کے پانچ بجے کا ہوا کرتا تھا۔ یہ دن کی عدم تعیین قلندروں کے شوق کا عجیب امتحان ہوا کرتی تھی۔ ہر بار نئی واردات اور نئی کیفیات کا حامل۔ عام طور پر مجلس برخاست ہونے سے پیشتر یہ طے کر لیا جاتا تھا کہ آئندہ اجتماع کب ہو؟ اس میں ایک کاوٹ ہوا کرتی تھی اور وہ تھی سفیر صاحب کی سرکاری مصروفیات کی۔ انھیں بہرحال ان کے مطابق وقت مقرر کرنا پڑتا تھا۔ اور محفل صرف اسی ایک کاوٹ کے سامنے جھکنے کے لئے تیار ہوتی تھی۔ ورنہ کوئی اور مصروفیت آئندہ یوم انعقاد کے تعین پر حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ تعین کا منظر بھی قابل دید ہوا کرتا تھا۔ "آئندہ کب؟" کے سوال پر سفیر صاحب اپنی ڈائری منگواتے تاکہ معین مصروفیات کا جائزہ لیں مگر انتظار کیا جاتا کہ سفیر صاحب ڈائری دیکھ کر فارغ دن کا اعلان کریں لیکن بے صبری یا بے خودی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ ڈائری آتے آتے کئی دن "مقرر" ہو جایا کرتے تھے۔ ڈائری آتی تو سفیر صاحب اس کی ورق گردانی کرتے اور مجلس ان کے چہرے کو پڑھتی۔ خود سفیر صاحب کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کہیں ہفتے سے زیادہ کا وقفہ ہو گیا ہے تو وہ متردد نظر آتے تھے۔ اس وقت عجیب سودا بازی شروع ہو جاتی۔ چلئے ہم صبح صبح آ جائیں گے۔ اچھا یوں کیجئے۔ آپ ڈنر سے واپس آیئے اور پھر شب زمیان ہوگی بہت سا حساب بیباق ہو جائے گا۔ ایک مرتبہ ایسے ہی رات کی بات ہو رہی تھی تو سفیر صاحب نے بڑی بیساختگی سے کہا "حتیٰ مطلع الفجر"۔ اس کے بعد مجلس میں یہ ضرب المثل ہو گئی تھی۔ اس سے ذوق و شوق کے پیمانوں کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ مجلس کا وقت اس خیال سے مقرر کیا گیا کہ اس سے فارغ ہو کر سفیر صاحب اپنی "غیر مجلسی" مصروفیت سے عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ لیکن ذوق حضور دل میں طرح طرح کی راہیں تراشنا شروع کر دیتا۔ "یہ موضوع زیادہ اہم ہے"۔ "یہ نکتہ زیادہ غور طلب ہے"۔ "اسے ایک ہی نشست میں نپٹا لینا چاہیئے"۔ وغیرہ وغیرہ سب کچھ رہ رہ کے خیال (اور بہت حد تک افسوس) سفیر صاحب کی مصروفیت کا آ رہا ہے۔ سفیر صاحب یہ کہ فرماتے ہیں کہ مجھے بھی جلدی نہیں تیار ہو کر چلے جانا ہے چند منٹ اور بیٹھ لیتے ہیں، چند منٹ اور ——— تاآنکہ ایک منٹ کا پس و پیش خلاف مصلحت ہو جاتا۔ اور سب بادل نخواستہ اٹھ کھڑے ہوتے۔

کسی مجلس کے ذکر یا تصور سے معاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے عہدیدار کون ہیں؟ سطور بالا سے آپ کی توجہ شاید اس طرف نہ گئی ہو۔ یا ہو سکتا ہے آپ نے یہ نتیجہ نکال لیا ہو کہ مجلس قلندران اقبال میں مناصب کی تقسیم نہیں ہوگی۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ ہو بھی کیسے؟ اس مجلس کو باقاعدہ طور پر معرض وجود میں نہیں لایا گیا، اور یوں بھی اس کی اٹھان اور فضا انجمنوں کے عام انداز و معیار سے بالکل مختلف رہی۔ لیکن نہیں، اس میں بھی مناصب پیدا ہو گئے تھے، اور اس طریق سے جیسے وہ پہلے سے "مقدر" تھے سب سے بڑا عہدہ پرویز صاحب کو ملا۔ وہ شیخ قلندراں کہلائے۔ اس کی صورت یوں ہوئی کہ ہرچند مجلس کی تشکیل سفیر صاحب کی تحریک پر ہوئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر پرویز صاحب نہ ہوتے تو یہ تحریک لباس تشکیل اختیار ہی نہ کر سکتی۔ اگر سفیر صاحب نے مجلس کا ڈھانچہ تیار کیا تو پرویز صاحب اس میں روح پھونکی۔ چونکہ پرویز صاحب ہی اقبال پڑھا اور پڑھایا کرتے تھے۔ اور اپنے مطالعہ اقبال اور تدبر فی القرآن کی بدولت وہی اس کے اہل بھی تھے۔ اس لئے انھیں شیخ قلندراں کہا جانے لگا۔ سفیر صاحب کو بھی منصب سے محروم نہیں رکھا گیا۔ اس میں ان کے سرکاری عہدے اور علمی مشاغل کی رعایت رکھی گئی کہ انھیں "سفیر اقبال" کا لقب دیا گیا۔ وہ نہ محض والہانہ جوش سے ہر جگہ اقبال کا پیغام پہنچاتے تھے بلکہ کلام اقبال کا عربی میں ترجمہ کر کے انھوں نے پوری دنیائے عرب کو فکر اقبال کے نور سے منور کر دیا اور اس طرح اس دنیا کے لئے تنہا "سفیر اقبال" قرار پائے۔

ایک منصب "ساقی" کا تھا۔ آج وہی ساقی ساقی گری کی شرم رکھ کر اس اجڑی محفل کی یاد کو دل و دماغ میں لیئے اس کی داستان گوئی کا فرض ادا کر رہا ہے۔ یہ منصب بھی بلاوجہ عطا نہیں ہوا۔ در اصل منصب بقدرِ ظرفِ عمل ہوتا تھا۔ ہر منصب کا استحقاق عمل تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ مجلس شروع ہوتی تو سفیر صاحب کے ملازمین چائے کی تیاری شروع کر دیتے۔ (میں نے اس وقت انھیں "ملازمین" محض تعارف کے لئے لکھا ہے۔ ورنہ وہ بھی درحقیقت اس مجلس کا ایک جزو بن چکے تھے اور انھیں کسی بڑے سے بڑے مہمان کی تواضع میں وہ لطف نہیں ملتا تھا جو ان قلندروں کی رفاقت سے ملتا تھا) جب چائے تیار ہو چکتی تو چائے کا دور چلتا۔ شروع شروع میں ایسے ہوا کہ چائے آئی تو اتفاق سے راقم الحروف نے چائے بنائی۔ دو ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا۔ ایک مرتبہ چائے رکھ دی گئی لیکن شروع نہ کی گئی کیونکہ شیخ قلندراں اپنا بیان ختم نہیں کر چکے تھے۔ جونہی بیان ختم ہوا سفیر صاحب نے فرمایا "ساقی" اور چائے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی بے ساختہ داد دی گئی۔ اور ساقی پر ساقی گری کی دائمی ذمہ داری آ پڑی۔ چائے کے ساتھ کچھ نہ کچھ کھانے کے لئے ضرور ہوتا تھا۔ اس کی تقسیم کی ذمہ داری ساقی پر نہ تھی۔ ساقی کا کام "سقایتِ مجلس" تک محدود تھا۔ تقسیم کا کام "قاسم" کے سپرد ہوا۔ قاسم ہمیشہ ساقی کے معاون رہے۔ ساقی کا پیالہ بڑھتا تو قاسم کی پلیٹ اس کے ساتھ پہنچتی۔ ساقی گری بڑی نازک ذمہ داری ہے، پھر قلندروں کی ساقی گری! کچھ پوچھئے نہیں۔ دس بارہ قلندر جن کی "ہر لحظہ نئی شان نئی آن"۔ اسے کم دودھ، اسے تیز قہوہ، یا اتنی شکر وہ اتنی شکر۔ مجلس قلندراں کی ساقی گری ظرف شناسی سے کہیں زیادہ مزاج شناسی تھی اور مزاج شناسی کا امتحان شکر کے معاملہ میں ہوا کرتا تھا کیونکہ جہاں ایسے قلندر تھے کہ جو چائے کو شکر آمیز کرنے کے روادار نہیں تھے وہاں ایسے قلندر بھی تھے جو تلخیٔ چائے کو شکر سے انگبیں بنا کر کام و دہاں کی آزمائش کیا کرتے تھے۔ ساقی کو اس نشیب و فراز کی خصوصی رعایت مدنظر رکھنا پڑتی تھی۔ ساقی کو قاسم کی بھی خصوصیت سے رعایت رکھنا پڑتی تھی کیونکہ اس کی "قسمت" کی پلیٹ قاسم کے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی۔ قریب قریب ہر محفل میں دونوں آنکھوں آنکھوں میں پیالی اور پلیٹ کے ایسے سودے کر لیتے تھے کہ قلندروں کو خبر تک نہ ہوتی تھی! اس راز کا افشا کرتے ہوئے ساقی کو یقین ہے کہ اگر وہ محفل سے پوچھے کہ کیا وہ مجھے ساقی تسلیم نہیں کرتے تو ان کا جواب "بلیٰ" ہوگا۔ قلندروں کے انداز بڑے نرالے ہوتے ہیں! یہ قاسم تھے سب کے ہر دلعزیز، عزیز الحسن۔

ایک عہدہ جو دیا نہیں گیا لیکن جس کا پورا پورا استحقاق پایا جاتا ہے "علی بخش" کا ہے یعنی خدام مجلس کو زیب دیتا ہے جن کے دماغ اقبال کو نہ پا سکے لیکن جن کے دل قلندروں کی طرح گرم اور ہاتھ قلندروں کی طرح سرگرم تھے۔ ابراہیم، خمیس، احمد وہ "علی بخش" ہیں جو سفیر صاحب کے خدام خانہ تھے۔ وہ مجلس کے دن کا اتنی ہی بیتابی سے انتظار کرتے تھے جتنا کہ بڑے سے بڑا قلندر کر سکتا تھا۔ دوپہر کے بعد ان کا سارا کاروبار بند ہو جاتا تھا۔ وہ محبت آمیز انہماک سے چائے اور اس کے لوازمات تیار کرتے تھے۔ یہ ذہنی طور پر جائے شریک نہیں تھے لیکن روحانی طور پر ہم سے بالکل جدا نہیں تھے۔

ایک عہدے کا اور ذکر کرنا ہے جو آخری ایام میں دیا گیا۔ پرویز صاحب دفتر میں تھے تو سفیر صاحب کی طرف سے عام طور پر ان کو ٹیلیفون پر پروگرام میں کمی بیشی کی اطلاع مل جایا کرتی تھی۔ جب پرویز صاحب نے چھٹی لے لی تو ایک اور قلندر جو ٹیلیفون پر موجود ہوا کرتے تھے اس اطلاع کے لئے منتخب ہوئے۔ آہستہ آہستہ ایام مجلس کا تعین انہی کے سپرد ہو گیا، اور وہی سب کو فرداً فرداً اطلاع بھی کیا کرتے تھے۔ اس سے لامحالہ عہدے کی نام دہی کا سوال پیدا ہوا۔ چنانچہ انھیں "صدر قلندراں" کہا جانے لگا۔

مجلس کا معمول یہ تھا کہ پرویز صاحب اقبال کے اشعار پڑھتے جاتے اور ساتھ ساتھ ان کی تشریح بھی کرتے جاتے۔ یوں بھی ہوتا تھا کہ نئی کتاب یا نیا موضوع شروع کرنے سے پہلے ایک جامع تمہیدی تقریر ہوتی جس میں موضوع کا مبسوط بیان ہوتا۔ اقبال کا کلام اور پرویز صاحب کا بیان محفل کو علمی اور وجدانی طور پر ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتی۔ کراچی کی بے آب و گیاہ وادی میں مصری سفارت خانہ بمنزلہ نخلستان تھا۔ وہ نخلستان جہاں روح کی بالیدگی کے بے حساب سامان تھے۔ پرویز صاحب کے بیان کے بعد یوں تو بہت کم کسی سوال کی گنجائش رہ جاتی لیکن جب کبھی ان کے علم کے نخلِ بلند تک کسی کا کوتاہ ہاتھ نہ پہنچتا وہ درخت خود جھک کر اس کے دامن کو بھرپور کر دیتا۔

ایسا بیان کوئی آدھ گھنٹے تک کے لئے ہوتا۔ اس کے بعد "علی بخش" محفل کا رنگ بدل دیتے پھر محفل کا چارج ساقی کے سپرد ہوتا۔ اور شیخ ذرا سستا لیتے۔ قلندر مطالعہ اقبال میں مستغرق بحر قرآن کی غواصی کر رہا ہوتا تو کیا اور چائے کی میز پر مائل بہ تفریح ہو گیا۔ وہ "رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز" ہوتا ہے۔ دونوں اس کی ذات کے شئون ہیں اور وہ دونوں میدانوں میں قلندر ہے۔ وقفہ چائے میں لطافت و ظرافت کی مخصوص فضا پیدا ہوتی، وہ فضا جس کے تصور سے اب بھی روح میں شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد شمع پھر شیخ قلندراں کے سامنے پہونچ جاتی۔ پرویز صاحب ہمیں ان گذرگاہوں میں لے جاتے کہ ستارے بھی جن کی گرد راہ بن جاتے اور فلک نے بین معلوم دیتے۔ اس جذب و انہماک میں سفیر اقبال "زمین کے ہنگاموں" کو نہ بھولتے اور انھیں پتہ ہوتا کہ ترجمہ کرتے وقت ان کو کیا دقتیں پیش آئیں گی۔ وہ ان دقتوں کو پیش کرتے اور پرویز صاحب ان کا حل کرتے۔ سفیر اقبال کے متعلق غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ ایک زمانے سے اقبال کے مطالعہ میں مصروف ہیں خود بلند پایہ ادیب اور شاعر ہیں۔ عربی تو ان کی مادری زبان ٹھہری، انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور فارسی تک میں انھیں دستگاہ ہے۔ اس کے باوصف جب وہ پرویز صاحب سے ملے تو انھیں معلوم ہوا کہ جب علم و فکر قرآن کی بھٹی سے ہو کر نکلتے ہیں تو کیا بن جاتے ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ انھوں نے اب اقبال کو سمجھا ہے انھوں نے سمجھا ہی نہیں۔ وہ سمجھاتے بھی پھرتے ہیں۔ "سفیر اقبال" کا لقب انہی کو زیب دے سکتا ہے۔ آپ وہ پیام مشرق، ضرب کلیم اور اسرار و رموز کا عربی ترجمہ کر چکے ہیں۔ پہلے دونوں ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ اور تیسرا پریس میں تھا کہ آپ کا تبادلہ ہو گیا۔ آپ نے ایک کتاب اقبال کی سیرت، فلسفہ اور شاعری پر بھی لکھی ہے۔ آپ نے ضرب کلیم کے ترجمے کا تعارف پرویز صاحب سے لکھوایا اور اپنے مقدمے میں مجلس قلندراں کا بڑی عقیدت سے ذکر کیا۔

اس مجلس میں ضرب کلیم، بال جبریل، ارمغان حجاز (حصہ اردو) جاوید نامہ، اسرار و رموز، پس چہ باید کرد، بانگ درا، (چیدہ چیدہ) لفظاً لفظاً پڑھی گئیں۔ ہمیں اس کمی کا احساس ہے کہ کوئی مختصر نویس مہیا نہ ہو سکا کہ جو ان مجالس کے نوٹ لے سکتا۔ یہ دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے متعلق اس سے پہلے کبھی اتنا کچھ اور اس طرح کہا یا سنا نہیں گیا۔ اگر یہ سب کچھ جمع ہو جاتا تو اقبال پر کئی مجلدات تیار ہو جاتیں اور پھر شاید ایک عرصہ تک اس سے آگے بات نہ کی جا سکتی۔ لیکن بقول غالب

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

سفیر اقبال نے دامن بھر بھر کے اس متاع فقر کو دنیائے عرب میں لٹا دیا۔

قارئین یہ سن کر متعجب ہوں گے کہ مجلس قلندراں ... ایک "ختم" کی تقریب بھی منایا کرتی تھی۔ یہ تقریب ہر کتاب کے خاتمہ پر منائی جاتی تھی۔ جب کسی کتاب کا صرف اس قدر حصہ باقی رہ جاتا جسے آئندہ نشست میں ختم ہو جانا تھا۔ تو اس کتاب کی آخری مجلس معمول سے ذرا دیر یعنی مغرب کے لگ بھگ منعقد کی جاتی۔ سفیر اقبال اپنی کتاب پر لکھتے کہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت فلاں جگہ کتاب ختم کی گئی۔ پھر اس تحریر کے نیچے تمام قلندروں کے دستخط ہوتے۔ اس کے بعد سب مل کر کھانا کھاتے۔ اس دعوت میں ساقی اور قاسم کے امتیازات ختم کر دیئے جاتے۔ ہر کوئی اپنا ساقی ہوتا اور اپنا قاسم۔ تکمیل مرحلہ کی خوشی قلندروں کی پیشانیوں سے ہویدا ہوتی اور گفتگو میں لطافت اور شگفتگی بن کر ظاہر ہوتی۔ محفل کا یہ رنگ چائے کے لگ بھگ تو ہوتا مگر اس کا دوران زیادہ ہوتا۔

اس مجلس کی آخری نشست ۱۱ر دسمبر کی شام کو منعقد ہوئی۔ یہ نشست عاجلانہ طور پر طلب کی گئی کیونکہ کسی فرزانے قلندر کو یہ سوجھ گئی کہ سفیر اقبال پاکستان سے رخصت ہو رہے ہیں تو ایک نشست کو متشکل کر کے محفوظ کر لیا جائے۔ "قلندران اقبال" کے نقوش و کیفیات کو دل کی لوح پر لئے پھرتے تھے، اب کے قائل ہو گئے۔ آخری نشست کا سماں دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ سینوں میں تلاطم تھا۔ گو چہرے سنجیدہ تھے بگریاں نہ خنداں۔ فراق کی خلش ضرور تھی لیکن یہ اطمینان تھا

نہ کر ذکرِ فراق و آشنائی کہ اصل زندگی ہے خودنمائی
نہ دریا کا زیاں ہے نہ گہر کا دل دریا سے گہر کی جدائی

اس لئے ہر ایک کی حالت یہ تھی

کشادم چشم و بربستم لب خویش
سخن اندر طریق ما گناہیست

ہمیں اطمینان تھا کہ ہمارا سفیر اقبال اس محفل کو سونا کر جائے گا تو کیا، وہ جہاں جائے گا نئی محفلیں آباد کرے گا۔ جو اس دریائی کا صدف بن جائیں گی۔ یہ ضبط بھی درحقیقت پیام اقبال اور تعلیم قرآن ہی کے صدقے میں تھا، ورنہ سینے میں تلاطم خیزیاں ساحل ناآشنا ہو رہی تھیں۔ یہاں تک تو ضبط نے ساتھ دیا۔ لیکن جب محفل شروع ہوئی تو اس کا نقشہ کچھ اور ہو گیا

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

هفت وار

طلوعِ اسلام

جلد ۸ ۲۳ر اپریل ۱۹۵۵ء نمبر ۱۲

نشانِ منزل

سفر اور آوارگی، دونوں میں انسان کے قدم اٹھتے ہیں۔ وہ راستہ طے کرتا ہے، اس کا وقت اور توانائی صرف ہوتی ہے۔ اس کے کام کاج کا ہرج ہوتا ہے۔ لیکن سفر کی ہر شخص تعریف کرتا اور اسے ضروری قرار دیتا ہے لیکن آوارگی انتہائی معیوب سمجھی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ سفر اور آوارگی میں فرق کیا ہے؟ ان میں فرق صرف اس قدر ہے کہ سفر میں چلنے والے کے سامنے ایک متعین منزل ہوتی ہے اور اس کا ہر قدم اس منزل کی طرف اٹھتا ہے۔ اس کے برعکس، آوارگی میں، چلنے والے کے سامنے کوئی منزل متعین نہیں ہوتی۔ اس کا قدم کسی خاص سمت کی طرف نہیں اٹھتا۔ وہ یونہی کبھی ادھر کو ہو لیتا ہے کبھی اُدھر کو۔ اس طرح وہ دن بھر چلتا رہتا ہے۔ اپنے کام کاج کا ہرج کرتا رہتا ہے۔ وقت اور قوت صرف کرتا ہے لیکن اسے حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ لہٰذا آوارگی کے معنی ہیں سفر بلا تعیینِ منزل۔

یوں تو جس زمانہ سے ان کی مرکزیت فنا ہوئی، تمام دنیا کے مسلمان فکر و نظر کی آوارگی میں مبتلا چلے آرہے تھے، لیکن بیسویں صدی کے رُبعِ اول میں، ہندوستان میں یہ بگولے کا رقص اپنی انتہائی شدت تک پہنچ گیا تھا۔ دیکھنے والے دیکھتے تھے کہ مسلمانانِ ہند کس طرح برق در آغوش کسی موہوم مقصد کے حصول کے لئے ہمہ تن اضطراب بن رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے سینے میں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں جو انہیں کسی وقت چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ کچھ کانٹے ہیں جو ان کے تلووں میں بُری طرح چبھ گئے ہیں اور وہ ان کے پاؤں کو کسی ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتے۔ ایک حرکتِ پیہم اور سعیِ مسلسل ہے جس نے اس قوم کو یکسر سیماب پا بنا رکھا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ قوم مصروفِ جد و جہد تھی لیکن کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ اس جد و جہد کا مقصود کیا ہے۔ ان کے قدم اٹھتے تھے لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ جا کدھر کو رہے ہیں؟ غیر تو ایک طرف، خود چلنے والوں کو اس کا پتہ نہیں تھا کہ ہم کیوں چل رہے ہیں اور ہمنے جانا کہاں ہے؟ قوم تنہا نہیں چل رہی تھی، راہ نماؤں کے ساتھ جا رہی تھی۔ اُن راہ نماؤں کے ساتھ جن کے خلوص میں شبہ نہیں تھا۔ لیکن خود ان راہ نماؤں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ہمنے کدھر جانا ہے اور قوم کو کہاں لے جانا ہے۔

قوم اس سفرِ بے منزل میں مصروفِ جادہ پیمائی تھی، لیکن ایک سادہ سا انسان تھا جو ان سب سے الگ ہٹ کر، ایک گوشے میں بیٹھا، ایک کتاب کو سامنے رکھے پوری خاموشی سے کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آتا تھا۔ قوم کے تیز خرام اسے آوازوں پر آوازیں دیتے، وہ ان کی طرف غم آلود آنکھوں سے دیکھتا اور پھر سے کتاب کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا۔ شعلہ پیکر راہ نمایانِ قوم بے عملی کا طعنہ دے کر اسے اُس کی فکر گاہ سے باہر کھینچنے کی کوشش کرتے لیکن ان کے یہ کچوکے بھی ناکام رہتے۔ بڑی سے بڑی جاذبیت اور سخت سے سخت ہنگامہ بھی اس کی نگاہوں کو ایک ثانیہ کے لئے بھی اس کتابِ عظیم کے صفحات سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکتے۔ وہ اسی طرح دریا کے تلاطم خیز اضطراب میں، سکوت و سکونِ گہر کے ساتھ، اپنی خلوت گاہ میں محوِ تفکر رہا، تا آنکہ ۱۹۳۰ء کی ایک شام وہ وہاں سے باہر نکلا اور ان رہ نوردانِ شوق کو الٰہ آباد کے مقام پر اکٹھا کر کے انہیں بتایا کہ تمہارا سفر، سفر نہیں آوارگی ہے۔ اور یہ آوارگی ہی رہے گا جب تک تم اپنی منزل کا تعین نہ کر لو۔ تمہاری منزل یہ ہے کہ تم ایک خطۂ زمین حاصل کرو جس میں تم اس کتابِ عظیم کے بتائے ہوئے نقشے کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکو۔ اس نے کہا کہ اگر یہ مقصد تمہارے سامنے نہیں تو تمہاری تمام جد و جہد بے سود اور تمام سعی و کاوش لا حاصل ہے۔ بے سود اور لا حاصل ہی نہیں، بلکہ سخت نقصان دہ اور ہلاکت انگیز ہے۔

پاکستان اس خطۂ زمین کا نام ہے، جو اس مردِ درویش کے دیئے ہوئے تصور کے مطابق اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے حاصل کیا گیا۔ یہ قوم کی انتہائی خوش بختی تھی کہ اسے عین اس وقت جب وہ اپنی بے پناہ "آوارگی" سے ہار تھک کر بیٹھ جانے کے قریب پہنچ چکی تھی، اسے اقبالؔ جیسا دانائے راہ مل گیا جس نے اپنی بصیرتِ قرآنی سے ان کے لئے ایسی درخشندہ و تابناک منزل کا تعین کر دیا۔ لیکن اس کے بعد، اس قوم کی یہ انتہائی بد قسمتی تھی کہ جب اسے وہ خطۂ زمین حاصل ہوا تو اقبالؔ ان سے جا چکا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ قوم پھر اس آوارگیٔ فکر و نظر کا شکار ہو گئی۔ پاکستان کی ہشت سالہ زندگی، اسی فکری تشتت اور ذہنی انتشار کی عبرت انگیز اور رسوا کن داستان ہے۔

اقبالؔ نے اس راہ گم کردہ قوم کے لئے صرف منزل کی نشان دہی ہی نہیں کی تھی۔ اس نے اس نقشے کے کچھ خط و خال بھی متعین کر دیئے تھے جس کے مطابق اس خطۂ زمین میں ایک قرآنی معاشرہ کو متشکل ہونا تھا۔ وہ حسین احمد صاحب مدنی کی نزاع کے سلسلہ میں اپنے زندہ جاوید جواب میں لکھتے ہیں:

> انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو۔ ایک لا متناہی سلسلہ ہے، باہم آویزشوں کا، خونریزیوں کا اور خانہ جنگیوں کا۔ کیا ان حالات میں عالمِ بشری میں ایک ایسی امت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر مؤسس ہو؟ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہو سکتی ہے، بشرطیکہ توحیدِ الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسبِ منشاء الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

> اگر عالمِ بشریت کا مقصد اقوامِ انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے، تو سوائے نظامِ اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آ سکتا کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے .... نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔

اسی طرح وہ ڈاکٹر نکلسن کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

> اسلام بلکہ کائناتِ انسانیہ کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدودِ ملک پر ہے دنیائے اسلام میں استیلا کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوعِ انسانی کی حیثیت سے انہیں یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشو و ارتقا ہے۔

چونکہ اقبالؔ کے تصور کے مطابق، پاکستان کو اس مقصدِ عظیم کا اولین گہوارہ بننا تھا، اس لئے ظاہر ہے کہ بنی آدم کی نشو و نما کے سلسلہ کا آغاز بھی خود یہیں سے ہونا تھا۔ اس ضمن میں وہ قائدِ اعظم محمد علی جناح کے نام ایک مکتوبِ گرامی میں (جو ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء میں لکھا گیا تھا) رقمطراز ہیں:

اس وقت حالت یہ ہے کہ آئین جدید (۱۹۳۵ء کے ایکٹ) کے مطابق، اعلیٰ ملازمتیں امراء کے بیٹوں کے حصے میں آجائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہو جائیں گی (عوام اور متوسط درجے کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح) دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی داناؤں نے کبھی عوام کی مرفہ الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گذشتہ دو سو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا کیا علاج ہو...

...... ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما دی جاسکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش فروز مل جاتا ہے۔ اگر ہندوؤں نے اشتراکی جمہوریت (SOCIAL DEMOCRACY) کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے ٹکرائے نہیں، اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں ہوگا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں، جیسا کہ وہ شروع میں تھا۔

جہاں تک پاکستان میں اسلامی قوانین کی تدوین کا تعلق ہے، وہ تبسم صاحب کے نام اپنے ایک خط میں (جو ستمبر ۱۹۳۵ء میں لکھا گیا تھا) رقمطراز ہیں:

> میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے جوریس پروڈنس یعنی اصولِ فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کریگا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور نوعِ انسانی کا سب سے بڑا خادم بھی وہی ہوگا..... زمانہ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانہ کے میلانِ طبع سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا۔

یہی وہ موٹے موٹے خطوط جو اقبالؒ نے اس نقشے کے لئے اپنی تحریروں میں چھوڑے ہیں۔ ان سے وہ نقشہ آسانی سے مرتب ہو سکتا ہے جس کے مطابق پاکستان میں اس قرآنی معاشرہ کی تشکیل ہو سکتی ہے جس کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا ہے۔ لیکن اگر اقبالؒ ان خطوط کو ہمارے لئے نہ بھی چھوڑ جاتا۔ یا انہیں ہم نا تمام پائیں۔ تو بھی کوئی ہرج نہیں۔ خدائے حکیم کی وہ کتاب زندہ جس پر غور و فکر سے اقبالؒ نے ان تصورات کو اخذ کیا تھا، خود ہمارے پاس موجود ہے۔ اس پر غور و فکر سے ہم پورے کے پورے نقشے کو مرتب کر سکتے ہیں۔ اگر ہم نے یہ کچھ کر لیا تو پھر وہ مقصد حاصل ہوگا جس کے لئے اقبالؒ نے اس خطۂ زمین کے حصول کی تلقین کی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوا اور ہم نے سمجھ لیا کہ مقصود بالذات یہ خطۂ زمین ہی ہے خواہ اس میں کسی قسم کی حکومت کیوں نہ قائم کر لی جائے۔ تو یہ پاکستان نہ تو اقبالؒ کے تصور کا پاکستان ہوگا اور نہ قرآن کی رو سے ایک مسلمان کی زندگی کا منتہائے نگاہ۔ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے اسے آزادی نہیں کہا جائے گا۔ یہ غلامی بدترین قسم کی غلامی ہوگی۔ اقبالؒ ہمیں آج بھی بار بار ان الفاظ کی یاد دلا رہا ہے جن پر اس نے (حسین احمد صاحب مدنی کے نام) اپنے جواب کا خاتمہ کیا تھا وہ الفاظ یہ تھے کہ

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کا خاتمہ کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہی نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں۔ بلکہ ہمارا اول مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں ان ہی اصولوں پر ہوں جس پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟
>
> ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیۃً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار

لعنت بھیجتا ہے اور ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا، سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے۔

لیکن یہ "دارالاسلام" مُلّا کے تصور کا دارالاسلام نہیں ہوگا، قرآن کے تصور کا دارالاسلام ہوگا جس کا (قائم کرنا تو ایک طرف، سمجھنا تک بھی مُلّا کے بس کی بات نہیں۔ کیونکہ اقبال کے الفاظ میں)

مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب
کور مادر زاد و نورِ آفتاب

بہرحال، اس وقت تو "اقبال کے پاکستان" میں یہی حالت ہے

کہ درویشی بھی عیّاری ہے سلطانی بھی عیّاری

اور اس عیّاری کا علاج، قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ اقبالؒ کے سارے پیغام کا ملخص یہی ہے۔ اگر ہم اسے اپنی زندگی کا نصب العین نہیں بناتے تو اقبالؒ کا نام جپتے رہنے سے کیا فائدہ؟ ہے!

یومِ اقبال

ہر کہ و مہ کو تسلیم ہے کہ پاکستان کا تصور حکیم الامت علامہ اقبالؒ کا عطا فرمودہ ہے اس اعتراف کے باوجود ہر سال یومِ اقبال آتا ہے اور اسے اس بے اعتنائی سے گذر نے دیا جاتا ہے جیسے کہ وہ عام ایام میں سے ایک یوم ہے اور اسے ویسے ہی ضائع کر دینا چاہیئے۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد قدرے اس سے متعلق جوش و خروش کا مظاہرہ کیا گیا لیکن جلد ہی یہ جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ قارئین ذرا پیچھے مڑ کر دیکھیں کہ اس احسان ناشناس قوم نے اپنے محسنِ اعظم کو کس طرح لوحِ حافظہ سے محو کیا۔

طلوعِ اسلام نے ۱۹۴۸ء میں تاسیسِ پاکستان کے بعد پہلے یومِ اقبال پر مرکزی حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ اسے عام تعطیل قرار دیا جائے۔ لیکن اس سال کی فہرستِ تعطیلات میں اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ ہم نے حکومت کی توجہ اس فروگذاشت کی طرف مبذول کرائی تو ۱۶ر اپریل کے مراسلہ میں وزارتِ داخلہ نے ہمیں جواب دیا: "اس فہرست میں مزید اضافہ اور ڈاکٹر محمد اقبال کے یومِ وفات پر ۲۱ر اپریل کو تعطیلِ عام کرنا بہت بعد از وقت ہے۔ ہاں اس بات کو نوٹ کر لیا گیا ہے اور جب ۱۹۴۹ء کی تعطیلات کا عام مسئلہ زیرِ غور آئے گا، اس پر مناسب غور کیا جائے گا"۔ ہم نے جواب میں لکھا کہ اول تو حکومت کو ایسی فروگذاشت کا مرتکب ہونا ہی نہیں چاہیئے تھا۔ لیکن اگر ایسا ہو گیا ہے تو تلافیٔ مافات کی جاسکتی ہے، اور اس کی مثال موجود ہے۔ مہاتما گاندھی کے قتل کی خبر ملنے پر حکومت نے تین گھنٹے کے اندر اندر تعطیل کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کے جواب میں ہمیں ۱۹ر اپریل کا مراسلہ ملا جس میں تحریر تھا: "...... ۲۱ر اپریل علامہ اقبال کی (تشکیلِ پاکستان کے بعد) پہلی برسی کا دن ہوگا۔ حکومتِ مرکزیہ پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ نظریۂ پاکستان کے لئے مرحوم کی بے مثال عطایا کی یاد میں اس دن تمام دفاتر بند ہوں گے"۔ خرابیٔ بسیار کے بعد ہی سہی، ہم نے اسے غنیمت جانا۔ لیکن اقبال کے "بے مثال عطایا کی یاد" میں صرف ایک ہی سال چھٹی دی گئی۔ ہم ہر سال یاد دلاتے رہے اور حکومت ہر سال اسے نظر انداز کرتی رہی۔

خیر اس کے بعد یہ بھی غنیمت تھا کہ ۲۱ر اپریل کی تقریب پر ایک جلسہ گورنر جنرل ہاؤس میں منعقد ہوا اور ایک جلسۂ عام جہانگیر پارک میں، لیکن یہ بھی ایک مرتبہ ہوا۔ دوسری مرتبہ گورنر جنرل کے ہاں کی تقریب ختم ہو گئی اور جہانگیر پارک والا جلسۂ عام رہ سا رہ گیا۔ سالِ گذشتہ جہانگیر پارک میں ایک پھیکا سا جلسہ ہوا۔ اب کے جو کچھ کراچی میں ہو رہا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے: ڈینسو ہال میں شام کے ۶ بجے ایک جلسہ "بزمِ اقبال و جوہر" کے زیرِ اہتمام؛ (و بلا سے سرکاری) اقبال اکیڈیمی (۱۰ ر) کی بجائے ۲۳ر اپریل کو کراچی یونیورسٹی میں ایک جلسہ منعقد کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ کم از کم کچھ اعلان اب تک نہیں ہوا، نہ پبلک کی طرف سے نہ حکومت کی طرف سے۔

یہ عملی پہلو ہے اس زبانی اعتراف کا کہ پاکستان کے لئے اقبال کے عطایا بے مثال ہیں۔

یہ حالت صرف آٹھ سال میں ہو گئی ہے۔ ذرا اور وقت گذرنے دیجئے، آپ کے بچے یہ بھی نہیں جانیں گے کہ اقبال کون تھا۔ اور زندہ قومیں کہہ رہی ہوں گی کہ "قوموں کی حیات

(باقی صفحہ ۷ کالم ۱ کے نیچے)

نظامِ پاکستان کے متعلق علامہ اقبال کا خط

قائدِ اعظم مرحوم کے نام

پاکستان کا تصور علامہ اقبال کا دیا ہوا ہے۔ حصولِ پاکستان کے بعد، وہ پاکستان میں کس قسم کا نظام دیکھنا چاہتے تھے؛ اس کے متعلق انہوں نے اپنا نظریہ اُس خط میں واضح کیا تھا جو انہوں نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو قائدِ اعظم کے نام تحریر فرمایا تھا۔ انہوں نے اس خط میں پہلے یہ بتایا کہ مسلم لیگ کا نصب العین کیا ہونا چاہیئے اور اس کے بعد یہ کہ اگر ان کے تصور کے مطابق مسلمانوں کی جداگانہ مملکت قائم ہوگئی تو اس کا نظام کن خطوط پر متشکل ہونا چاہیئے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

لیگ کو آخر الامر یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ ایک ایسی جماعت رہنا چاہتی ہے جو صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمایندگی کرے یا وہ عوام کی نمایندگی کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت تک عوام نے لیگ میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اس کی ان کے پاس وجوہات ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی مرفہ الحالی کا وعدہ نہیں دے سکتی، عوام کے لئے کبھی جاذبِ نگاہ نہیں بن سکے گی۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ آئینِ جدید (یعنی ۱۹۳۵ء کے آئین) کے مطابق، اعلیٰ ملازمتیں امراء کے بیٹوں کے حصہ میں آجائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہو جائیں گی۔ (عوام اور متوسط درجہ کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ یہ تو رہا ملازمتوں کی بابت، اسی طرح) دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عوام کی مرفہ الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گذشتہ دو سو سال سے پیچھے ہی پیچھے جا رہا ہے ...... اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہو۔ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک اس سے بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشو و نما (DEVELOPMENT) دیا جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش (SUBSISTENCE) ضرور مل جاتا ہے (ہندوؤں کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں) اگر ہندوؤں نے اشتراکی جمہوریت (SOCIAL DEMOCRACY) کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندو مت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو لیسے مناسب اُمور سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے ٹکرائے نہیں، اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں ہوگا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے اس منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا وہ شروع میں تھا۔

بقیہ "لمعات" (صفحہ ۷ کے بعد)

ان کے تخیل پہ ہے موقوف"

کوئی ہے جو سوچے یہ کیا ہو رہا ہے: دراس کا مداوا کیا ہے؟ یاد رکھئے کہ یومِ اقبال سے یہ مطلب نہیں کہ یہ یادگار ہے ایک ایسے آدمی کی جو سیالکوٹ میں پیدا ہوا اور کچھ عرصہ لاہور میں وکالت کرنے کے بعد، وہیں فوت ہو گیا۔ یہ درحقیقت یادگار ہے اس پیغام کی جس نے قوم کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیا اور صحرا میں کھوئے ہوئے قافلہ کو نشانِ منزل سے روشناس کرا دیا۔ اس یادگار کا دلوں سے محو کر دینا، اس پیغام کو بھلا دینے کے مرادف ہے۔ و ذٰلک خسران المبین۔

سرودِ رفتہ

(نوروز ۱۹۳۸ء کو حکیم الامت حضرت علامہ اقبال کی طرف سے لاہور ریڈیو اسٹیشن سے ایک پیغام نشر ہوا تھا جو تہذیبِ حاضرہ پر ایک حقیقت افروز تنقید اور انسانی فلاح و فوز کی طرف راہ نمائی کے لئے ایک شمعِ ہدایت تھا۔ اس پیغام کو نشر ہوئے آج سترہ برس سے زائد عرصہ ہو گیا لیکن چونکہ کوئی حقیقت مرورِ زمانہ سے پرانی نہیں ہوا کرتی۔ اس لئے یہ آج بھی ویسا ہی پیغامِ عبرت و بصیرت ہے جیسا اس وقت تھا۔ یہ آخری پیغام تھا۔ جو اس دیدہ ور کی طرف سے اقوامِ عالم تک پہنچا، اور جسے ہم آج غم و مسرت کے مخلوط جذبات سے پھر اقوامِ عالم تک پہنچانے کا فخر حاصل کرتے ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

پیغام

دورِ حاضر کو علومِ عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقیات پر بہت بڑا فخر و ناز ہے، اور یہ فخر و ناز بلاشبہ حق بجانب ہے۔ آج زمان و مکان کی پہنائیاں سمٹ رہی ہیں اور انسان قدرت کے اسرار کی نقاب کشائی اور قوائے فطرت کی تسخیر میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کر رہا ہے لیکن ان تمام ترقیات کے باوجود اس زمانے میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے اور کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کے نیچے دنیا بھر کے تمام گوشوں میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ جن نام نہاد مدبرین کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی تھی، وہ خونریزی، سفاکی اور زبردست آزاری کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاقِ انسانی کے نوامیسِ عالیہ کی حفاظت کریں۔ انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح بلند کریں۔ انھوں نے ملوکیت اور استعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک اور پامال کر ڈالا۔ صرف اس لئے کہ ان کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہونچ جائے۔ انھوں نے کمزور قوموں پر تسلط حاصل کرنے کے بعد ان کے اخلاق، ان کے مذہب، ان کی معاشرتی روایات، ان کے ادب اور ان کے اموال پر دستِ تطاول دراز کیا۔ پھر ان کے درمیان تفرقہ انگیزی کر کے ان بدبختوں کو خونریزی اور برادر کشی میں مصروف کر دیا تاکہ وہ غلامی کی افیون سے مدہوش اور غافل رہیں اور استعمار کی جونک چپ چاپ ان کا لہو پیتی رہے۔

جو سال گزر چکا ہے، اس کو دیکھو اور آج نوروز کی خوشیوں کے درمیان بھی دنیا کے واقعات پر نظر ڈالو، حبش ہو یا فلسطین، ہسپانیہ ہو یا چین، اس خاکدانِ ارضی کے گوشہ گوشہ میں یہی قیامت برپا ہے۔ لاکھوں انسان بیدردانہ موت کے گھاٹ اتارے جا رہے ہیں۔ سائنس کے تباہ کن آلات سے تمدنِ انسانی کے عظیم الشان آثار کو معدوم کیا جا رہا ہے اور جو حکومتیں فی الحال آگ اور خون کے اس تماشے میں عملاً شریک نہیں ہیں۔ وہ اقتصادی میدان میں کمزوروں اور ضعیفوں کے خون کے آخری قطرات تک چوس رہی ہیں۔ غرض ایک ہنگامۂ محشر ہے جس میں نفسی نفسی کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ تمام دنیا کے مفکر دم بخود ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ کیا تہذیب و تمدن کے اس عروج اور انسانی ترقی کے اس کمال کا انجام یہی ہونا تھا کہ انسان ایک دوسرے کی جان و مال کے لاگو ہو کر اس کرۂ پر زندگی کا قیام ناممکن بنا دے؟

یاد رکھو انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ جب تک تمام دنیا کی تعلیمی طاقتیں اپنی توجہ کو محض احترامِ انسانیت کے درس پر مرتکز نہ کر دیں گی۔ یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہسپانیہ کے باشندے ایک نسل، ایک زبان، ایک مذہب اور ایک قوم رکھنے کے باوجود محض اقتصادی عقائد کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں۔ اس ایک واقعے سے صاف ظاہر ہے کہ قومی وحدت بھی ہرگز قائم و دائم نہیں۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوعِ انسان کی وحدت ہے جو نسل، زبان، رنگ اور قوم سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے گا۔ جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کا قائل نہ ہو جائے گا۔ جب تک جغرافیائی وطن، نسل و

جنابِ رسالتمآب کا ادبی تبصرہ

علامہ اقبال

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد کی عربی شاعری کی نسبت وقتاً فوقتاً جن ناقدانہ خیالات کا اظہار فرمایا ان کی روشنی صفحاتِ تاریخ کے لئے خطِ باشاں کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن دو موقعوں پر جو تنقیدات آپ نے ارشاد فرمائیں اُن سے مسلمانانِ ہند کو آج کل کے زمانہ میں بہت بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے کہ ان کا ادب اُن کے قومی انحطاط کے دور کا نتیجہ ہے اور آج کل اُنہیں ایک نئے ادبی نصب العین کی تلاش ہے۔ شاعری کیسی ہونی چاہیئے اور کیسی نہ ہونی چاہیئے۔ یہ وہ عقدہ ہے جسے جنابِ رسالتمآب صلعم کے وجدان نے اس طرح حل کیا ہے۔ امراءالقیس نے اسلام سے چالیس سال پہلے کا زمانہ پایا ہے۔ روایت ہمیں بتاتی ہے کہ جنابِ پیغمبر صلعم نے اس کی نسبت ایک موقع پر حسبِ ذیل رائے ظاہر فرمائی۔ اشعر الشعرا و قائدھم الی النار یعنی وہ شاعروں کا سرتاج تو ہے ہی لیکن جہنم کے مرحلے میں ان سب کا سپہ سالار بھی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امراءالقیس کی شاعری میں وہ کونسی باتیں ہیں جنہوں نے حضور سرورِ کائنات صلعم سے یہ رائے ظاہر کروائی۔ امراءالقیس کے دیوان پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں شراب ارغوانی کے دور، عشق و حسن کی ہوشربا داستانوں اور جاں گداز جذبوں، آندھیوں سے اڑی ہوئی پرانی بستیوں کے کھنڈروں کے مرثیوں، سنسان ریتیلے ویرانوں کے دل ہلا دینے والے منظروں کی تصویریں نظر آتی ہیں اور یہی عرب کے دورِ جاہلیت کی کل تخیلی کائنات ہے۔ امراءالقیس قوتِ ارادی کو جنبش میں لانے کی بجائے اپنے سامعین کے تخیل پر جادو کے ڈورے ڈالتا ہے اور ان میں بجائے ہوشیاری کے بے خودی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکیمانہ تنقید میں فنونِ لطیفہ کے اس اہم اصول کی توضیح فرمائی ہے کہ صنائع و بدائع کے محاسن اور انسانی زندگی کے محاسن یہ کچھ ضروری نہیں کہ یہ دونوں ایک ہی ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ شاعر بہت اچھا شعر کہے لیکن وہی شعر پڑھنے والے کو اعلیٰ علیین کی سیر کرانے کی بجائے اسفل السافلین کا تماشا دکھائے۔ شاعری دراصل ساحری ہے اور اس شاعر پر حیف ہے جو قومی زندگی کے مشکلات و امتحانات میں دل فریبی کی شان پیدا کرنے کی بجائے وہ فرسودگی و انحطاط کو صحت اور قوت کی تصویر بنا کر دکھا دے اور اس طور پر اپنی قوم کو ہلاکت کی طرف لے جائے۔ اس کا تو فرض ہے کہ قدرت کی لازوال دولتوں میں سے زندگی اور قوت کا جو حصہ اسے دکھایا گیا ہے اس میں اوروں کو بھی شریک کرے۔ نہ یہ کہ اٹھائی گیرہ بن کر جو رہی سہی پونجی ان کے پاس ہے، اس کو بھی ہتھیائے۔

ایک دفعہ قبیلہ بنو عبس کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا گیا۔

ولقد ابیت علی الطوی واظلہٗ
حتی انال بہٖ کریم الماکل

(ترجمہ) میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کی ہیں تاکہ میں اکلِ حلال کے قابل ہو سکوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کی بعثت کا مقصدِ وحید یہ تھا کہ انسانی زندگی کو شاندار بنائیں اور اس کی آزمائشوں اور سختیوں کو خوش آیند اور مطبوع کر کے دکھائیں، اس شعر کو سن کر بے انتہا محظوظ ہوئے اور اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوقِ ملاقات نہیں پیدا کیا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے نگارندہ کے دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے۔"

اللہ اکبر! توحید کا وہ فرزندِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جس کے چہرۂ مبارک پر ایک نظر ڈال لینا نظارگیوں کے لئے دینوی برکت اور اخروی نجات کی دوگونہ سرمایہ اندوزی کا ذریعہ تھا خود ایک بُت پرست عرب سے ملنے کا شوق ظاہر کرتا ہے کہ اس عرب نے اپنے شعر میں اس کی گون کی بات کہی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عزت عنترہ کو بخشی اس کی وجہ ظاہر ہے۔ عنترہ کا شعر ایک صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی، بولتی چالتی تصویر ہے۔ حلال کی کمائی میں انسان کو جو سختیاں اٹھانی پڑتی ہیں، جو کڑیاں جھیلنی پڑتی ہیں ان کا نقش پردۂ خیال پر شاعر نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کھینچا ہے۔ حضور خواجۂ دوجہاں صلعم (بابی انت وامی) نے جو اس قدر شعر کی تعریف فرمائی اس سے صنعت کے ایک دوسرے بڑے اصول کی شرح ہوتی ہے کہ صنعت حیاتِ انسانی کے تابع ہے اس پر فوقیت نہیں رکھتی۔

ہر وہ استعداد جو مبدءِ فیاض نے فطرتِ انسانی میں ودیعت کی ہے اور ہر وہ توانائی جو انسان کے دل و دماغ کو بخشی گئی ہے، ایک مقصدِ وحید اور ایک غایت الغایات کے لئے وقف ہے یعنی قومی زندگی جو آفتاب بن کر چمکے، قوت سے لبریز ہو، جوش سے سرشار ہو، ہر انسانی صنعت کو غایتِ آخرین کی تابع اور مطیع ہونی چاہیئے اور ہر شئے کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہیئے کہ اس میں حیات بخشی کی قابلیت کس قدر ہے۔ تمام وہ باتیں جن کی وجہ سے ہم جاگتے جاگتے اونگھنے لگیں اور جو بیتی جاگتی حقیقتیں ہمارے گرد و پیش موجود ہیں (کہ انہیں پر غلبہ پانے کا نام زندگی ہے) ان کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لیں، انحطاط اور موت کا پیغام ہیں۔ صنعت گر کو چنیا بیگم کے حلقۂ عشاق میں داخل نہ ہونا چاہیئے۔ مصورِ فطرت کو اپنی رنگا رنگ نگار آرائیوں کا اعجاز دکھانے کے لئے افیون کی چسکی سے احتراز واجب ہے۔ یہ پیش پا افتادہ فقرہ جس سے ہمارے کانوں کی آئے دن تواضع کی جاتی ہے کہ کمالِ صنعت اپنی غایت آپ ہے، انفرادی، اجتماعی انحطاط کا ایک عیارانہ حیلہ ہے جو اس لئے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکا دے کر چھین لی جائے۔ غرض یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجدانِ حقیقی نے عنترہ کے شعر کی خوبیوں کا جو اعتراف کیا، آپ نے اصل الاصول کی بنیاد ڈال دی کہ صنعت کے ہر کمال کی صحیح شان ارتقاء کیا ہونی چاہیئے۔

ملک خداداد کا تصور

(صفحہ ۹ کا بقیہ)

جب تم اپنی نگاہ میں یہ تبدیلی پیدا کر لوگے تو تمہاری خارجی دنیا خود بخود بدل جائے گی۔

توبع دیگر بیں، جہاں دیگر شود — ایں زمین و آسمان دیگر شود

یہ ہے اس نظام کا تصور جسے علامہ اقبال قرآنی نظام سمجھتے تھے۔ جاوید نامہ کے دیگر مقامات اور حضرت علامہ کی دوسری تصانیف میں اس نظام کے خط و خال بڑی وضاحت سے بیان ہوئے ہیں جنہیں کسی دوسرے وقت پیش کیا جائے گا۔ ہماری کس قدر شوریدہ بختی ہے کہ حضرت علامہ پاکستان کا تصور تو دے سکے، لیکن وہ اس وقت ہم میں موجود نہ ہوئے جب اس کے نظام کی ترتیب کا مسئلہ سامنے آیا۔ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو پاکستان کا نظام خود مرتب فرماتے۔ اور کسی کو مجالِ اختلاف نہ ہوتی۔ لیکن اس باب میں مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، حضرت علامہ کے تصورات کا سرچشمہ قرآن ہے اور قرآن ہمارے ہاں ہر وقت زندہ ہے۔ ہم آج قرآن کی روشنی میں اپنا نظام خود مرتب کر سکتے ہیں، جو وہی نتائج برآمد کرے گا جس کا نقشہ حضرت علامہ نے اپنے عالمِ تصور میں کھینچا ہے یعنی

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا۔ حاکم و محکوم نیست

اس کی تشریح میں وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبین ایں است و بس

کا امتیاز کاملاً مٹ جائیگا۔ انسان اس دنیا میں فوز و کامرانی کی زندگی بسر کر سکے گا اور اخوت، حریت اور مساوات کے الفاظ کبھی شرمندۂ معنی نہ ہوں گے۔

آؤ اس نئے سال کو اس دعا سے شروع کریں کہ خدائے بزرگ و برتر اربابِ حکومت و اقتدار کو انسان بنائے اور انہیں انسانیت کی حفاظت کرنا سکھائے۔ آمین۔

"ملکِ خداداد" کا تصوّر

(اقبالؒ کے نزدیک)

علامہ اقبالؒ نے جاوید نامہ" میں اپنے مختلف تصورات کو مختلف طرق و اسالیب سے پیش کیا ہے کہیں مکالمات کی شکل میں، کہیں مشاہیر سلف کے ارواح کی زبان سے، کہیں کسی مقام کی کیفیات کا نقشہ کھینچ کر، کہیں خود اپنے واردات کے خط و خال بیان کر کے۔ ایک مقام پر انہوں نے یہ بتایا ہے کہ جب دنیا میں آئین خداوندی کے مطابق نظامِ معاشرت قائم ہوگا۔ تو اس وقت خطۂ ارض کی حالت کیا ہو جائے گی۔ انھوں نے اس خطے کے مثالی بیان کے لئے فلکِ مریخ اور مرغدین کا شہر منتخب کیا ہے جسے وہ "ملکِ خداداد" کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش　　　خوب روئے و نرم خوئے و سادہ پوش

خوش کلام، خوش گل، نرم طبع۔ سادہ پوش، تسخیرِ قوائے فطرت میں اتنی بلندیوں پر پہنچے ہوئے کہ اپنے کاروبار کے لئے تمام توانائی (ENERGY) سرچشمہ حرارت (آفتاب) سے براہ راست حاصل کرنے والے۔

فکرشاں ریسد در سوزِ اکتساب　　　رازدانِ کیمیائے آفتاب

ہر کہ خواہد سیم و زر گیرد ز نور　　　چوں نمک گیریم ما از آبِ شور

وہاں علم و ہنر کا مقصد نوعِ انسان کی خدمت ہوگا۔ نہ کہ حصولِ سیم و زر۔ سکوں کا اس مقام پر رواج ہی نہ ہوگا۔

خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر　　　کار ہا را کس نمی سنجد بزر

کس ز دینار و درم آگاہ نیست　　　ایں بتاں را در حرم ہا راہ نیست

نہ وہاں ایسی مشینیں ہوں گی جو بھوتوں کی طرح انسان کے سر پر سوار ہوں گی۔ نہ فیکٹریوں کی چمنیاں فضائے آسمانی کو دھواں دھار بنا دی ہوں گی، مشینیں خدمت گذار، دھوئیں کی جگہ آفتابی حرارت۔

بر طبیعت دیو ماشیں چیرہ نیست　　　آسمانہا از دخانہا تیرہ نیست

وہاں کا ہر کسان نہایت مرفہ الحال اور خوش و خرم ہوگا، نہ زمیندار کی سلب و نہب (EXPLOITATION) اس کا خون چوسے گی نہ اس کی محنت کا حاصل کوئی اور چھین کرلے جائے گا۔

محنت کش دہقاں چراغش روشن است　　　از نہابِ دہ خدایاں ایمن است

کشت و کارش بے نزاع آبجو است　　　حاصلش بے شرکتِ غیرے از وست

چونکہ وہاں سلب و نہب (EXPLOITATION) کا تصور ہی نہ ہوگا۔ اس لئے باہمی مفاد کا تصادم (CLASH OF INTERESTS) کا بھی سوال پیدا نہ ہوگا۔ اور جب مفاد کا تصادم نہ ہوگا تو پھر کشت و خون بھی نہ ہوگا، ہر طرف امن ہی امن ہوگا۔ اس لئے وہاں بے کار فوجیں (STANDING ARMY) رکھنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔

اندراں عالم نہ لشکر نے قشوں　　　نے کسے روزی خورد از کشت و خوں

وہاں کے اہلِ قلم بھی پروپیگنڈے کی دروغ بافیوں میں مصروف نہ ہوں گے۔

نے قلم در مرغدیں گیرد فروغ　　　از فنِ تحریر و تشہیر دروغ

نہ وہاں کوئی بے کار ہوگا نہ گداگر

نے بہ بازاراں ز بے کاراں خروش　　　نے صداہائے گدایاں درد گوش

ایک شہر میں یہ سمجھئے کہ نہ وہاں کوئی سائل ہوگا نہ محروم، نہ کوئی کسی کا آقا نہ غلام، نہ کوئی کسی کا حاکم نہ کوئی کسی کا محکوم

کس دریں جا سائل و محروم نیست　　　عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

یہ تھا اقبالؒ کے الفاظ میں مرغدین کا نقشہ جہاں آئین خداوندی کے مطابق نظام قائم ہوگا۔ اقبال کہتے ہیں کہ جب وہاں کے حکیم نے مجھ سے کہا کہ اس جگہ نہ سائل ہوتا ہے نہ محتاج۔ نہ حاکم نہ محکوم، تو میں نے اس سے کہا کہ ہم (مشرق کے مذہب پرست) یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ امیری اور غریبی، حاکمی اور محکومی سب خدا کی طرف سے ہے۔ یہ سب باتیں تقدیر سے متعلق ہیں تو یہاں یہ کیسے ہے کہ سب ایک جیسے ہیں یہاں لوگوں کی تقدیریں مختلف کیوں نہیں، کیا تم لوگوں نے تدبیر سے تقدیر کو مٹا دیا ہے؟

سائل و محروم تقدیرِ حق است　　　حاکم و محکوم تقدیرِ حق است

جز خدا کس خالقِ تقدیر نیست　　　چارۂ تقدیر از تدبیر نیست

اس کے جواب میں حکیم مریخی نے کہا کہ تم لوگوں نے تقدیر کا مطلب ہی غلط سمجھ رکھا ہے۔ تقدیر کے معنی ہیں پیمانہ، خدا کے ہاں مختلف پیمانے رکھے ہیں۔ جتنی ہمت تم کرو گے۔ وہ پیمانے سے ناپی جائیگی اور اس پیمانے کے مطابق نتیجہ مرتب ہو جائے گا۔ اس لئے اگر کوئی ایک پیمانہ تمہاری ضرورت کو پورا نہیں کرتا تو اپنی ہمت کو بڑھا لو، دوسرا پیمانہ مل جائے گا۔

گر ز یک تقدیر خوں گردد جگر　　　خواہ از حق حکمِ تقدیرِ دگر

تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست　　　زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہاست

تم لوگوں نے اپنے آپ کو بھلا دیا۔ کارگہِ ہستی میں انسانی ذات کے موثرات کو فراموش کر دیا۔ اور سمجھ لیا کہ سب کچھ کہیں اوپر سے ہوتا ہے۔

ارضیاں نقدِ خودی در باختند　　　نکتۂ تقدیر را نشناختند

آؤ تمہیں سمجھاؤں کہ تقدیر کسے کہتے ہیں، تقدیر سے مقصود ہے خدا کا قانون، جس قسم کی کوئی چیز ہوگی۔ اسی قسم کا قانون اس پر منطبق ہو جائے گا۔ یا یوں سمجھو کہ تقدیر نام ہے کسی شے کے جوہرِ ذاتی (INTRINSIC CHARACTERISTICS) کا۔ جس قسم کے یہ جوہرِ ذاتی ہوں گے اسی قسم کے خواص اس چیز سے مرتب ہوں گے۔ یہی اس کی تقدیر ہے۔

رمز باریکش بحرفے مضمر است　　　تو اگر دیگر شوی او دیگر است

یہ نہ کہو کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہ کہو کہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے جیسے تم بن جاؤ گے، اسی قسم کا خدا کا قانون تم پر عاید ہو جائے گا۔

خاک شو نذرِ ہوا سازد ترا　　　سنگ شو بر شیشہ انداز د ترا

شبنمی؟ افتندگی تقدیرِ تست　　　قلزمی؟ پائندگی تقدیرِ تست

اگر تم تقدیر کو اس طرح سے سمجھو تو کائنات کے گنج گراں مایہ تمہارے قبضے میں ہوں گے۔ لیکن اگر تم نے تقدیر کا مفہوم وہی رکھا جو "مذہب" کے غلط تصور نے پیدا کر رکھا ہے تو اس سے محتاج محتاج تر اور کمزور کمزور تر ہوتا جائے گا۔

اصلِ دیں ایں است اگر اے بے خبر　　　می شود محتاج از و محتاج تر

یہی وہ مذہب ہے جو انسان کو سلا دیتا ہے

وائے آں دینے کہ خواب آرد ترا　　　باز در خوابِ گراں دارد ترا

کہو! یہ دین ہے یا افیون؟

سحر و افیون است یا دین است ایں　　　حب افیون است یا دین است ایں

اس کے بعد حکیم مریخی نے بتایا کہ تمہارے ہاں معاشرہ میں جو اس قدر ناہمواریاں اور فساد انگیزیاں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے اشیاء کو افراد کی ملکیت تصور کر رکھا ہے۔ ملکیت کا تصور تمام فسادات کی بنیاد ہے۔ یہاں ہر شے خدا کی ملکیت ہے اور انسانوں کے سپرد بطور امانت کی جاتی ہے۔

اے کہ می گوئی متاعِ ما ز ماست　　　مرد ناداں ایں ہمہ ملکِ خداست

زمین خدا کی ہے اور افراد اس کے مالک بن بیٹھتے ہیں۔ یہ قرآن کے حکم کی صریح مخالفت ہے۔

ارضِ حق را ارضِ حق دانی بگو　　　چیست شرحِ آیۂ لا تفسدوا[1]

لہٰذا صحیح نظام یہ ہے کہ ہر شے "خدا کی ملکیت" میں دیدی جائے

کس امانت را بکارِ خود نہ برد　　　اے خوش آں کو ملکِ حق با حق سپرد

ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ　　　تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ

یہ تمام محتاجی، غریبی، افلاس اور زبوں حالی اس لئے ہے کہ خدا کی ملکیت کو انسانوں نے اپنی ملکیت سمجھ رکھا ہے

زیرِ گردوں فقر و مسکینی چرا است　　　آنچہ از مولاست می گوئی ز ماست

باقی صفحہ پر

[1] لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا۔ زمین میں ناہمواریاں پیدا ہو جانے کے بعد پھر سے ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔

اِقبال کا پاکستان

اس وقت پاکستان کے مستقبل کا مسئلہ زیرِ غور ہے۔ ہر طرف سے مختلف قسم کی آوازیں اٹھ رہی ہیں کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ پاکستان کا تصور حکیم الامت علامہ اقبال کی بصیرتِ قرآنی کا نتیجہ تھا۔ اس لئے یہی بتا سکتے تھے کہ اس خاکہ میں کس قسم کا رنگ بھرا جائیگا۔ پاکستان کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ وہ اقبال کی قیادت سے محروم رہ گیا۔ اگر آج اقبال زندہ ہوتے تو وہ اپنے تصور کو قرآن کی روشنی میں عملی شکل عطا کر دیتے۔

ہر چند ہم میں آج اقبال موجود نہیں لیکن اقبال کی فکر ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم اس فکر کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں کہ ان کے نزدیک پاکستان کی اسلامی مملکت کا نقشہ کیا ہونا چاہیئے تھا۔ ذیل میں ہم فکرِ اقبال کے بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک ترتیب سے پیش کرتے ہیں تاکہ یہ ہمارے لئے نشاناتِ راہ کا کام دے سکیں۔ ان میں سے کئی چیزیں اس سے پیشتر قارئین طلوعِ اسلام کے سامنے آچکی ہیں۔ لیکن یہ چیزیں ایسی ہیں کہ جتنی بار سامنے آئیں، ان کی افادی حیثیت بڑھتی جاتی ہے۔ دیکھئے کہ اقبال کے نزدیک اس نقشہ کے خطوط کیا تھے۔

قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں

عرشی صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ علامہ اقبال سے پوچھا کہ: "خارج از قرآن ذخیرۂ احادیث و روایات اور کتبِ فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے؟" انھوں نے فرمایا: "یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ کن ضروریات کے ماتحت وضع کی گئیں لیکن نفسِ اسلام قرآن مجید میں بکمال و تمام آچکا ہے۔ خداوند تعالیٰ کا منشا دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں"۔ (البیان۔ دسمبر ۱۹۲۱ء)

مقامِ حدیث

احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے، اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے۔ اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے۔ کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی انکا استصواب فرما دیا ہو) انھیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے۔ جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔

شاہ صاحبؒ نے کہا ہو کہ پیغمبرانہ طریقِ تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسولؐ کے احکام ان لوگوں کے عاداتؒ اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اُصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اُصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انھیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انھیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رو سے رسولؐ کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی انھیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی فقہ کا مدار احادیث پر کیوں نہیں رکھا۔ ان حالات کی روشنی میں میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے۔ امام ابوحنیفہ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہو کہ احادیث ہمارے لئے من و عن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا۔ جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

(خطباتِ اقبال ص ۱۶۳، ۱۶۴)

احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کیا جائے

مجھ کو ان[1] کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ شریعتِ محمدیہؐ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ معاملات کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آجکل شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لئے مدت درکار ہے، ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اس کی ضرورت کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے۔ شیخ علی رزاق اور دوسرے علمائے مصر کے مباحث سے مولوی صاحب آگاہ ہوں گے۔ علیٰ ہٰذالقیاس ترکی میں بھی یہی مسائل زیرِ غور ہیں اس پر ایک آدھ کتاب بھی تصنیف ہو چکی ہے۔ اس میں زیادہ تر زمانۂ حال کے مغربی اصولِ فقہ کو ملحوظ رکھ کے فقہِ اسلامی پر بحث کی گئی ہے۔ ترکوں نے جو "چرچ" اور "سٹیٹ" میں امتیاز کر کے ان کو الگ کر دیا ہے۔ اس کے نتائج نہایت دور رس ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افتراق اقوامِ اسلامی کے لئے باعثِ برکت ہوگا یا شقاوت۔ غرضکہ مولوی صاحب یا ان کے رفقا کو جو کلامِ الٰہی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ میں اور مجھ ایسے اور لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ رسالہ "بلاغ" امرتسر کے ہر نمبر میں اور مولوی حشمت علی صاحب کے رسالہ "اشاعۃ القرآن" کے ہر نمبر میں اسی پر بحث ہوتی ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص موخرالذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروج ہیں، ان پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصولِ فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کریگا۔ وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں یا قوانینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدینِ شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرضکہ یہ وقت عملی کام کا ہے۔ کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہبِ اسلام گویا زمانہ کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

(مکتوب بنام صوفی غلام مصطفیٰ تبسم۔ محررہ ۲ر ستمبر ۱۹۲۵ء)

مسلمانوں کا نصب العین

الفاظ شرفِ انسانی کے متعلق کسی کو دھوکا نہیں ہونا چاہیئے اسلامیات میں ان سے مراد وہ حقیقتِ کبریٰ ہے جو حضرت انسان کے قلب و ضمیر میں ودیعت کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ اس کی تقویم فطرۃ اللہ ہے اور اس شرف کا غیر ممنون یعنی غیر منقطع ہونا منحصر ہے اس تڑپ پر جو توحیدِ الٰہی کے لئے اس کے رگ و ریشہ میں مرکوز ہے۔ انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو، ایک لاانتہاہی سلسلہ ہے باہم آویزشوں کا، خونریزیوں کا اور خانہ جنگیوں کا۔ کیا ان حالات میں عالمِ بشری میں ایک ایسی امت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پرور ہو؟ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ توحیدِ الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسبِ منشائے الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے۔ ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبیر کا کرشمہ نہ سمجھیئے بلکہ

[1] مولانا خواجہ احمد الدین صاحب

یہ رحمت للعالمین کی ایک شان ہے۔ کہ اقوام بشری کو ان کے تمام خود ساختہ تفوقوں اور فضیلتوں سے پاک کرکے ایک ایسی امت کی تخلیق کی جائے جس کو امۃ مسلمۃ لک کہہ سکیں اور اس کے فکر و عمل پر شہداء علی الناس کا خدائی ارشاد صادق آسکے۔ (حسین احمد مدنی کے جواب میں۔ متعلقہ قومیت)

اسلام رنگ و نسل و جغرافیہ سے بلند ہو کر انسانیت کو دعوت دیتا ہے

(۱) اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدہ کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگ گراں ہے۔ نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ رینان کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس، اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ درصل اسلام بلکہ کائناتِ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود و ملک پر ہے۔ دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے۔ اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظرانداز کرکے اس عقیدہ کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوع کی حیثیت سے انھیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشو و ارتقاء ہے۔ نسل اور حدود و ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیاتِ اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اسے یہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں اس چیز کا مخالف ہوں کہ اسے انسانی قوتِ عمل کا مظہرِ اتم سمجھ لیا جائے۔

یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے لیکن مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیشِ نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے۔ بلکہ در اصل عملی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے۔ کیونکہ یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔ مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں، کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائناتِ انسانیت کے اتحادِ عمومی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے اور کہتا ہے: تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم۔ (ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب۔ متعلقہ "فلسفہ سخت کوشی")

—— (۲) ——

اسلام کے مذکورہ بالا دعوے پر عقلی دلائل کے علاوہ تجربہ بھی شاہد ہے۔ اول یہ کہ اگر عالمِ بشریت کا مقصد اقوامِ انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظامِ اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے، جو اس کے قومی اور نسلی نقطہ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخِ ادیان اس بات کی شاہدِ عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں "دین" قومی تھا، جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا۔ جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ عقائد کا نام ہے۔ اس واسطے انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف اسٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوعِ انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے، نہ نسلی، نہ انفرادی، نہ پرائیویٹ بلکہ خالصۃً انسانی ہے اور اس کا مقصد، باوجود تمام فطری امتیازات کے عالمِ بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل قوم اور نسل پر بنا نہیں کیا جا سکتا، نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کیا جا سکتا ہے صرف یہی ایک طریق ہے جس سے عالمِ انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک امت کی تشکیل اور اس کے بقا کے لئے ضروری ہے۔ کیا خوب کہا ہے مولانا رومؒ نے:

ہم دلی از ہم زبانی بہتر است!

اس سے علیحدہ رہ کر جو راہ اختیار کی جائے وہ راہ لادینی کی ہوگی اور شرفِ انسانیت کے خلاف ہوگی۔ چنانچہ یورپ کا تجربہ دنیا کے سامنے ہے۔ جب یورپ کی دینی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔ اور یورپ کی اقوام علیحدہ علیحدہ ہو گئیں تو ان کو اس بات کی فکر ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس کیا قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ مسیحیت ایسا اساس نہ بن سکتی تھی۔ انھوں نے یہ اساس وطن کے تصور میں تلاش کی۔ کیا انجام ہوا اور ہو رہا ہے ان کے اساس انتخاب کا؟ وہ تحریکِ اصلاح، تحریکِ عقلیت کا دور، اصولِ دین کا اسٹیٹ کے اصولوں سے افتراق بلکہ جنگ، یہ تمام قوتیں یورپ کو دھکیل کر کس طرف لے گئیں۔ لادینی، دہریت اور اقتصادی جنگوں کی طرف!

(حسین احمد مدنی کے جواب میں —— مضمون متعلقہ وطنیت)

—— (۳) ——

نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہیے کہ بنی نوعِ انسان کی اقوام کو باوجود شعوب و قبائل اور الوان و السنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے، ان کو ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے جو زمان، مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہمکنار رہتا ہے، یہ ہے مقامِ محمدی، یہ ہے نصب العین ملتِ اسلامیہ کا۔ اس کی بلندیوں تک پہنچنے میں معلوم نہیں حضرتِ انسان کو کتنی صدیاں لگیں، مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اقوامِ عالم کی باہمی مغایرت دور کرنے اور باوجود شعوبی، قبائلی، نسلی، لونی اور لسانی امتیازات کے ان کو ایک رنگ کرنے میں جو کام اسلام نے تیرہ سو سال میں کیا ہے وہ دیگر ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا۔ یقین جانیئے کہ دینِ اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس حیاتی اور نفسیاتی عمل ہے، جو بغیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالمِ انسانی کے فکر و عمل کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسے عمل کو حال کے سیاسی مفکرین کی جدت طرازیوں سے مسخ کرنا ظلمِ عظیم ہے۔ بنی نوعِ انسان پر اور اس نبوت کی ہمہ گیری پر جس کے قلب و ضمیر سے اس کا آغاز ہوا۔ (حسین احمد مدنی کے جواب میں —— مضمون متعلقہ وطنیت)

عالمگیر پیغام کیلئے بھی ایک سوسائٹی کی ضرورت ہوتی ہے

مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفہ کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے لیکن باعتبارِ اطلاق و انطباق مخصوص و محدود، ایک حیثیت سے ان کا ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعر اور فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے لیکن اگر اسے مؤثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں۔ تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطب اولیں نہیں ٹھہرائیں گے اور ایسی ایک مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرہ مخاطبت محدود کر دیں گے جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہِ عمل رکھتی ہو لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔

(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب —— متعلقہ فلسفہ سخت کوشی)

—— (۲) ——

میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں بلکہ میری قوتِ طلب و جستجو صرف ایک چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشری نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک معاشری نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصدِ وحید ذات پات، رتبہ و درجہ، رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔ اسلام دنیوی معاملات کے باب میں نہایت ژرف نگاہ بھی ہے، اور پھر انسان میں بے نفسی اور دنیوی لذائذ و نعم کے ایثار کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔ اور حسنِ معاملت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے ہمسایوں کے بارے میں اسی قسم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یورپ اس گنج گرانمایہ سے محروم ہے اور یہ متاع اسے ہمارے ہی فیضِ صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب —— متعلقہ فلسفہ سخت کوشی)

مذہب نجی معاملہ نہیں

سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اس کی صحیح حیثیت کیا ہے۔ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ نہیں؟ اور آپ یہ چاہتے ہیں کہ اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظامِ سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ باعتبارِ آبادی ہم لوگ اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی ابادت محض انفرادی اور ذاتی واردات ہیں، اہلِ مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا۔ کہ وہ ایک مشربِ رہبانیت ہے جس نے دنیائے مادیات سے

منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالمِ روحانیت پر ڈالی ہے۔ اس قسم کے عقیدے سے لازماً یہی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واردات مذہب کی حیثیت جیسا کہ قرآن پاک میں ان کا اظہار ہوا ہے، اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہے کہ ان کا تعلق محض صاحب اردات کے اندرونِ ذات سے ہو لیکن اس کے باہر اس کے گردو پیش کی معاشرت پر انکا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اولیں نتیجہ سے ایک ایسے نظامِ سیادت کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی والہام پر ہے۔ لہٰذا اس کا مذہبی نصب العین اس معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے، الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔

(خطبۂ صدارت مسلم لیگ ۱۹۳۰ء)

———(۲)———

یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقدِ اجتماعی کا پابند ہو۔ ریاست اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر وحجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔　(ایضاً)

اسلام اپنے اُصولوں میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا

اسلام بحیثیت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اور بحیثیت اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں، بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو، نامعقول و مردود ہے۔

(بجواب حسین احمد مدنی ——— متعلقہ قومیت)

———(۳)———

امت مسلمہ جس دینِ فطرت کی حامل ہے۔ اس کا نام دینِ قیّم ہے۔ دینِ قیّم کے الفاظ میں ایک عجیب و غریب لطیفہ قرآنی مخفی ہے اور وہ یہ کہ صرف دین ہی مقوم ہے۔ اس گروہ کے امور معاشی اور مادی کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے نظام کے سپرد کر دے۔ بالفاظِ دیگر یہ قرآن کی رُو سے حقیقی تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم، دین اسلام ہی سے تقویم پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وصاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیر اسلام ہو نامعقول ومردود ہے۔　(ایضاً)

ملائیت، تصوّف، ملوکیت

۱۔ ملائیت:۔ علماء ہمیشہ اسلام کے لئے ایک قوتِ عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں لیکن صدیوں کے مرور کے بعد خاص کر زوالِ بغداد کے زمانہ سے وہ بیحد قدامت پرست بن گئے۔ اور آزادی اجتہاد (یعنی قانونی اُمور میں آزاد رائے قائم کرنا) کی مخالفت کرنے لگے۔ وہابی تحریک جو انیسویں صدی کے مصلحین کے لئے حوصلہ افزا تھی درحقیقت ایک بغاوت تھی علماء کے اسی جمود کے خلاف۔ پس انیسویں صدی کے معلمین اسلام کا پہلا مقصد یہ تھا کہ عقائد کی جدید تفسیر کی جائے اور بڑھتے ہوئے تجربہ کی روشنی میں قانون کی جدید تعبیر کرنے کی آزادی حاصل کی جائے

۲۔ تصوّف: مسلمانوں پر ایک ایسا تصوّف مسلط تھا جس نے حقائق سے آنکھیں بند کر لی تھیں جس نے عوام کی قوتِ عمل کو ضعیف کر دیا تھا اور ان کو ہر قسم کے توہم میں مبتلا کر رکھا تھا۔ تصوّف اپنے اس اعلیٰ مرتبہ سے جہاں وہ روحانی تعلیم کی ایک قوت رکھتا تھا، نیچے گر کر عوام کی جہالت اور ضعفِ اعتقادی سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اس نے بتدریج اور غیر محسوس طریقہ پر مسلمانوں کی قوتِ ارادی کو کمزور اور اس قدر نرم کر دیا تھا کہ مسلمان اسلامی قانون کی سختی سے بچنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے مصلحین نے اس قسم کے تصوّف کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا اور مسلمانوں کو عصرِ جدید کی روشنی کی طرف دعوت دی۔ یہ نہیں کہ یہ مصلحین مادہ پرست تھے۔ انکا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اسلام کی روح سے آشنا ہو جائیں۔ جو مادہ سے گریز کرنے کی بجائے اس کی تسخیر کی کوشش کراتی ہے۔

۳۔ ملوکیت: مسلمان سلاطین کی نظر اپنے خاندان کے مفاد پر جمی رہتی تھی۔ اور اپنے اس مفاد کی حفاظت کے لئے اپنے ملک کو بیچنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ سید جمال الدین افغانی کا مقصد خاص یہ تھا کہ مسلمانوں کو دنیائے اسلام کے ان حالات کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔

(ختم نبوت ——— بجواب پنڈت جواہر لال نہرو)

پاکستان کی آزادی مسلمانوں کے جمود کو توڑ ڈالے گی

میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازن قوت کی بدولت امن وامان قائم ہو جائیگا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب وتمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانۂ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔　(ایضاً)

اسلام ایک طرح کی سوشلزم ہی

سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیات کے مذہب کے مخالف ہیں۔ اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادّی تاریخ سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا، جس کی تشریح میں نے ان تحریروں میں جابجا کی ہے اور سب سے بڑھکر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی۔ جو روحانیت میرے نزدیک مغضب ہو یعنی افیونی خواص رکھتی ہے اس کی تردید میں نے جابجا کی ہے، باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔

(مکتوب بنام غلام السیدین۔ محررہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

یہی اسلام کی منزہ شکل ہے

لیگ کو آخر الامر یہ طے کرنا ہو گا کہ وہ ایک ایسی جماعت رہنا چاہتی ہے جو صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کرے یا وہ عوام کی نمائندگی کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت تک عوام نے لیگ میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اس کی ان کے پاس وجوہات ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی مرفہ الحالی کا وعدہ نہیں دے سکتی۔ عوام کے لئے کبھی جاذب نگاہ نہیں بن سکے گی۔ (اس وقت حالت یہ ہو کہ) آئینِ جدید (یعنی ۱۹۳۵ء کے آئین) کے مطابق اعلیٰ ملازمتیں امراکے بیٹوں کے حصے میں آجائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہو جائیں گی۔ (عوام اور متوسط درجے کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہو گا۔ یہ تو رہا ملازمتوں کی بابت۔ اسی طرح) دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عوام کی مرفہ الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گزشتہ دو سو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہو؟ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما (ڈویلپمنٹ Development) دی جا سکتی ہے اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش Subsistence ضرور مل جاتا ہے (ہندوؤں کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں) اگر ہندوؤں نے اشتراکی جمہوریت (Social Democracy) کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندو مت کا خاتمہ ہو جائیگا۔ لیکن اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے ٹکرائے نہیں۔ اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں ہو گا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہو گا کہ ہم اسلام کو پھر سے منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں۔ جیسا وہ شروع میں تھا۔

(مکتوب بنام قائد اعظم محمد علی جناح۔ مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء)

اشتراکیت

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل   یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل!
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است   قلبِ او مومن دماغش کافر است
غربیاں گم کردہ اند افلاک را   در شکم جویند جانِ پاک را
رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک   جز بہ تن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس   بر مساواتِ شکم دارد اساس
تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخ او در دل نہ در آب و گل است

ہم چناں بینی کہ در دورِ فرنگ   بندگی با خواجگی آمد بجنگ
روس را قلب و جگر گردید خوں   از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں
آں نظامِ کہنہ را برہم زد است   تیز نیشے بر رگِ عالم زد است
کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ   لا سلاطیں لا کلیسا لا الٰہ
فکرِ او در تندبادِ لا بماند   مرکبِ خود را سوئے الا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں   خویش را زیں تندباد آرد بروں
در مقامِ لا نیاساید حیات   سوئے الا می خرامد کائنات
لا و الا سازو برگِ امتاں   نفیِ بے اثبات مرگِ امتاں
در محبت پختہ کے گردد خلیل   تا نگردد لا سوئے الا دلیل
اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن   نعرۂ لا پیشِ نمرودے بزن
اے کہ می بینی نبرزد باد و جو   از جلالِ لا الٰہ آگاہ شو
ہر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لا است
جملہ موجودات را فرمانروا است

الارض للہ

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت   ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا نکتۂ از من پذیر   رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
صحبتش تا کے تو بودو او نبود   تو وجود و او نمودِ بے وجود
تو عقابی طائفِ افلاک شو   بال و پر بکشا و پاک از خاک شو
باطنِ الارض للہ ظاہر است   ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است
من نگویم در گذر از کاخ و کوے   دولتِ تست ایں جہانِ رنگ و بو
دانہ دانہ گوہر از خاکش بگیر   صید چوں شاہیں ز افلاکش بگیر
تیشۂ خود را بکہسارش بزن   نورے از خود گیر و بر نارش بزن
از طریقِ آزری بیگانہ باش   بر مرادِ خود جہانِ نو تراش
دل برنگ و بوے و کاخ و کو مدہ
دل حریمِ اوست جز با او مدہ

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست   ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست
بندۂ مومن امیں حق مالک است   غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است
رایتِ حق از ملوک آمد نگوں   قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں
آب و ناں ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم کنفسِ واحدہ

اے کہ می گوئی متاعِ ما زماست   مرد ناداں ایں ہمہ ملکِ خداست

ارضِ حق را ارضِ حق دانی بگو   چیست شرحِ آیۂ لا تفسدوا
ابنِ آدم دل بابلیسی نہاد!   من زِ ابلیسی ندیدم جز فساد
کس امانت را بکارِ خود نبرد   اے خوش آں کو ملکِ حق با حق سپرد
بردہ چیزے کہ از آنِ تو نیست   دانم از کارے کہ شایانِ تو نیست
گر تو باشی صاحبِ شے می سزد   ور نباشی خود بگو کے می سزد
ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ   تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ
زیرِ گردوں فقر و مسکینی چرا است   آنچہ از مولاست می گوئی زماست
بندہ کز آب و گل بیروں نجست   شیشۂ خود را بسنگِ خود شکست
اے کہ منزل را نمی دانی زرہ   قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگہ
تا متاعِ تست گوہر گوہر است   ورنہ سنگ است از شررے کمتر است
نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود
ایں زمین و آسماں دیگر شود

قرآن کا مثالی معاشرہ

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش   خوب روئے و نرم خوئے و سادہ پوش
فکرِ شاں بے دردِ سوزِ اکتساب   راز دانِ کیمیائے آفتاب
خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر   کار بارا کس نمی سنجد بزر
کس ز دینار و درم آگاہ نیست   ایں بتاں را در حرم ہا راہ نیست
سخت کش دہقاں چراغش روشن است   از نہابِ دِہ خدایاں ایمن است
حاصلش بے شرکتِ غیرے از دست   کشت و کارش بے نزاعِ آبجو است
نے کسے روزی خورد از کشت و خوں   اندراں عالم نہ لشکر نے قشوں
از فنِ تحریر و تشہیرِ فروغ   نے قلم در مرز و بومش گیرد فروغ
نے صداہائے گدایاں در گوش   نے بہ بازاراں ز بیکاراں خروش
کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

حاصلِ مملکتِ اسلامیہ

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

ابلیس کی زبان سے

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں   ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں   بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف   ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر   حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے   نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف   منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب   بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب   یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں
ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

یہ ہے اقبال (اور قرآن) کے مطابق پاکستان کا صحیح نقشہ اور اسی کے مطابق ہونا چاہیئے اس کا دستور۔

روٹی کا مسئلہ

(اقبال کی نظر میں)

اقبال نے اپنے آپ کو شاعرِ فردا کہا تھا۔ کیونکہ قوموں کی زندگی میں امروز و فردا صدیوں کے پیمانے سے ماپے جاتے ہیں۔ اس لئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس فردا کا طلوع کب ہوگا۔ جب مسلمان اقبال کے صحیح مقام اور اس کے پیغام کے صحیح مفہوم سے آشنا ہو سکے گا۔ لیکن یہ حقیقت تو ابھی سے بے نقاب ہونا شروع ہو گئی ہے کہ اقبال "دیارِ غیر" کا شاعر تھا چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ انگلستان فرانس جرمنی اور اٹلی میں اقبال کے کلام کے ترجمے شائع ہو رہے ہیں اور اس کی شرحیں لکھی جا رہی ہیں۔ لیکن خود پاکستان میں یہ حالت ہے کہ سال بھر کے بعد اپریل کے مہینے میں دو چار مقامات پر انفرادی طور پر "یومِ اقبال" کے جلسے منعقد کر لئے جاتے ہیں اور اس کے بعد اس "دفترِ بے معنی" کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ دوران سال میں اتنا ہوتا ہے کہ کبھی کسی قوال نے اقبال کی کوئی غزل گا دی یا کبھی ریڈیو والوں نے اپنے پروگرام کا خلا پر کرنے کے لئے اس کی کوئی نظم سنا دی۔ یوں یاد قائم رکھی جا رہی ہے اس شخص کی جس نے (اور تمام باتوں کو چھوڑیئے) اس قوم کو اس پاکستان کا تصور دیا جس سے اب اس کی زندگی وابستہ ہو اور جس کی وجہ سے اسے وہ مواقع حاصل ہو گئے ہیں کہ اگر یہ چاہے تو دنیا کی ممتاز ترین قوموں کی صف میں جگہ پا سکتی ہے۔ اتنی بڑی احسان فراموشی مسلمانوں ہی سے ظہور میں آ سکتی تھی۔

ہمارے نزدیک اقبال کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے قوم کو پھر سے قرآن سے آشنا کرانے میں مسلسل جدوجہد کی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مملکت پاکستان بھی ایک گراں بہا نعمت ہے لیکن اقبال کے الفاظ میں مملکت ایک کوشش ہوتی ہے (قرآنی) نصب العینی اصولوں کو زمان و مکان میں صورت پذیر کرنے کی آرزو ہوتی ہے ان اصولوں کو کسی خاص انسانی ادارہ میں روبہ عمل لانے کی"۔ یعنی اسلامی نقطۂ نگاہ سے مملکت کی اہمیت محض اس لئے ہوتی ہے کہ وہ انسانیت کے ان بلند مقاصد کو جنہیں قرآن نے عطا کیا ہے عملی پیکروں میں ڈھالنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اقبال کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے قرآن کے ان بلند مقاصد کو قوم کے سامنے بے نقاب کیا اور انہیں بتایا کہ ان کی زندگی اور سرفرازی کا راز انہی مقاصد کی عملی تشکیل میں ہے۔

اقبال نے جو کچھ سمجھا، قرآن سے سمجھا، اور جو کچھ سمجھایا، قرآن سے سمجھایا۔ قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے بلند مقاصد کو اصولی طور پر بیان کرتا ہے اور ان کی جزئیات کو بالعموم غیر متعین چھوڑ دیتا ہے۔ تاکہ قرآن پر عمل کرنے والی قوم ان جزئیات کو اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں خود متعین کرتی جائے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس دور میں زندگی کا کوئی تقاضا نمایاں حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس تقاضے سے متعلق قرآن کے اصول بھی نمایاں طور پر سامنے آ جاتے ہیں۔ ہمارے دور میں انسانی زندگی کے جس تقاضے نے سب سے زیادہ نمایاں حیثیت اختیار کی ہو۔ وہ روٹی کا مسئلہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب سے انسان نے تمدنی زندگی شروع کی ہے۔ روٹی کا مسئلہ اس کے ساتھ ساتھ رہا ہے لیکن اس مسئلہ نے ایک عالمگیر تقاضے کی حیثیت ہمارے ہی دور میں اختیار کی ہے۔ یہ غیر ممکن تھا کہ اقبال جو زندگی کے تقاضوں پر قرآن کی روشنی میں غور کرتا تھا، اپنے دور کے ایسے اہم تقاضے سے غیر متاثر رہتا۔ اور قرآن نے اس باب میں جو راہنمائی دی ہے اسے پیش نہ کرتا۔ اقبال کا پہلا دور ان بڑھتے ہوئے تقاضوں سے متاثر ہونے کا ہے۔ دوسرا دور اس حل پر غور و فکر کرنے اور اسے قرآنی روشنی میں پرکھنے کا ہے جو تنہا عقل انسانی نے اس مشکل کے لئے دریافت کیا۔ اور تیسرا دور وہ ہے جس میں اس نے اس مشکل کا قرآنی حل پیش کیا ہے۔ اس اثر پذیری کی آواز ہم سب سے پہلے "خضرِ راہ" میں سنتے ہیں۔ جب وہ خضر سے سوال کرتے ہیں کہ ؎

زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے؟ — اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

اور اس کے جواب میں خضر کہتا ہے ؎

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر — شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

الغرض اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے — مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اس کے بعد پیامِ مشرق میں دیکھئے۔ وہ "صحبتِ رفتگاں" کے عنوان میں ٹالسٹائی، کارل مارکس، ہیگل، مزدک، کوہکن وغیرہ سب کو جمع کرتے ہیں اور ان کی زبان سے اس اہم تقاضے کی ترجمانی مختلف اور یہ ہائے نگاہ سے کرتے ہیں۔ ٹالسٹائی کہتا ہے ؎

بارکش اہرمن لشکری شہریار — از پئے نانِ جویں تیغِ ستم برکشید
وارثِ پیہوشیش تاج، کلیسا، وطن — جانِ خدا داد را خواجہ بجامے خرید

کارل مارکس کہتا ہے ؎

رازدانِ جزو و کل از خویش نامحرم شد است — آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شد است

ہیگل اپنا فلسفۂ اضداد پیش کرتا ہے۔ اور ٹالسٹائی اسے "عقلِ دو رو" کی چابکدستی قرار دے کر اس کی تردید کرتا ہے۔ مزدک اعلان کرتا ہے کہ ؎

دورِ پرویزی گزشت اے کشتۂ پرویز خیز — نعمتِ گم کردہ خود را از خسرو باز گیر

فرانسیسی فلاسفر کومٹ مزدور کو یہ سبق دیتا ہے کہ ——— نیاید ز محمود کارِ ایاز ——— اور مزدور ایک پر معنی تبسم سے جواب دیتا ہے کہ ؎

حق کوہکن دادی اے نکتہ سنج — بہ پرویز پرکار و نابردہ رنج

آخر میں "قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور" میں وہ ان دونوں کا تقابل نہایت وضاحت اور خوبصورتی سے کرتا ہے۔ جہاں سرمایہ دار مزدور سے کہتا ہے کہ ؎

غوغائے کارخانۂ آہن گری زمن — گلبانگِ ارغنونِ کلیسا از آنِ تو
نخلے کہ شہ خراج بردی تہد ز من — باغِ بہشت سدرہ و طوبیٰ از آنِ تو
ایں خاک آنچہ در شکمِ او از آن من — وز خاک تا بہ عرشِ معلّٰی از آنِ تو

اور اس کے بعد "نوائے مزدور" میں کہتا ہے کہ ؎

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز — مئے کہ شیشہ گداز دو بہ ساغر اندازیم
مغان و دیر مغاں را نظامِ تازہ دہیم — بنائے میکدہ ہائے کہن برانداز یم
ز رہزنانِ چمن انتقامِ لالہ کشیم — بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم

یہی دعوتِ انقلاب ہے جسے ہم زبورِ عجم میں اس سے بھی تیز انداز میں دیکھتے ہیں۔ جہاں اقبال کہتا ہے کہ ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب — از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب

انقلاب، اے انقلاب!

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام — آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

انقلاب

انقلاب، اے انقلاب!

"بالِ جبریل" میں "فرشتوں کا گیت" اسی نظامِ سرمایہ پرستی کی تباہ انگیزیوں کے خلاف صدائے احتجاج ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ ؎

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر — تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست — بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

یہی وہ احتجاج ہے جس کے جواب میں خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملتا ہے کہ ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اسی کتاب میں لینن کی وہ مشہور درخواست بھی ہے جس میں وہ خدا سے کہتا ہے کہ ؎

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

یہ ہیں نظامِ سرمایہ پرستی کے انسانیت سوز نتائج جنہیں اقبال کی نگہ بصیرت نے بھانپا اور جو اس کے قلبِ حساس کی گہرائیوں سے نشتروں کی شکل میں سطح سے اوپر ابھرے۔ یہی ہیں وہ اشعار جنہیں کمیونسٹ اپنے جلسوں اور جلوسوں میں گاتے ہیں اور ان میں ثابت کرتے ہیں کہ اقبال بھی کمیونسٹ تھا لیکن اقبال کمیونسٹ نہیں تھا، نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کمیونزم کے دو حصے ہیں۔ ایک تو ان کا یہ دعویٰ کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ رزق کو سمیٹ کر اپنے قبضہ میں لے لے جبکہ غریب اور محتاج

کے بچے بھوکوں مر رہے ہوں۔ جہاں تک اس دعویٰ کا تعلق ہے۔ اس کا ہر وہ مسلمان ہمنوا ہے جو قرآن سے راہنمائی حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اقبال بھی اس کا ہمنوا تھا۔ اسے اس کا ہمنوا ہونا چاہیئے تھا لیکن دوسری چیز ہے کمیونزم کا وہ فلسفہ جس پر اس دعوے کی بنیاد رکھتے ہیں یعنی ہیگل کی جدلیت اور کارل مارکس کی تاریخ کی معاشی تعبیر۔ یہ وہ فلسفہ ہے جس کی تائید کوئی مسلمان نہیں کر سکتا اور چونکہ اقبال مسلمان تھا۔ اس لئے وہ اس فلسفہ کا سخت مخالف تھا۔ چنانچہ وہ خواجہ غلام السیدین کے نام سے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں (جو ۱۹۳۶ء میں لکھا گیا تھا) کہ:

"سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے مخالف ہیں، اور اسے افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے سیاسی مفہوم کا...... جو روحانیت میرے نزدیک مغضب ہے۔ یعنی افیونی خواص رکھتی ہے۔ اس کی تردید میں نے جابجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے، جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ اقبال کارل مارکس کو "کلیم" تو کہتا ہے لیکن بے تجلی اور "مسیح" قرار دیتا ہے لیکن بے صلیب جیسا کہ وہ جاوید نامہ میں افغانی ؒ کی زبان سے یہ کہلاتا ہے ؎

صاحب سرمایہ از نسلِ خلیل　　یعنی آں پیغمبر بے جبرئیل

زانکہ حق در باطلِ او مضمر است　　قلب او مومن دماغش کافر است

غربیاں گم کردہ اند افلاک را　　در شکم جویند جانِ پاک را

دین آں پیغمبر ناحق شناس　　بر مساواتِ شکم دارد اساس

وہ کہتا ہے کہ جب روٹی کے مسئلہ کو خالص مادی بنیادوں پر حل کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے انسان حیوانی سطح پر تو زندہ رہ سکتا ہے لیکن اس کی انسانیت یکسر مردہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس قسم کی اشتراکیت ہو یا مغرب کی ملوکیت، انسانیت کے حق میں دونوں کا نتیجہ ایک ہے ؎

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب　　ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب

زندگی ایں را خروج آں را خراج　　درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج

غرق دیدم ہر دو را در آب و گِل　　ہر دو را تن روشن و تاریک دل

زندگانی سوختن با ساختن

در گِلے تخمِ دلے انداختن

یہی "سوختن با ساختن" ہے جسے اقبال لَا اور اِلَّا سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ روس کا اشتراکی نظام درحقیقت لَا کے گرداب میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کی تمام کوششیں تخریبی ہی تخریبی ہیں۔ وہ "ساختن" یعنی اِلَّا (تعمیر) کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ چنانچہ وہ "پس چہ باید کرد" میں روس کی اسی کش مکش کے بارے میں کہتا ہے ؎

روس را قلب و جگر گردیدہ خوں　　از ضمیرش حرفِ لَا آمد بروں

آں نظامِ کہنہ را برہم زد است　　تیز نیشے بر رگِ عالم زد است

کردہ اند ر مقاماتش نگاہ!　　لَا سلاطیں لَا کلیسا لَا الٰہ

فکر او در تند بادِ لَا بماند　　مرکبِ خود را سوئے اِلَّا نراند

یہاں سے وہ تیسرا دائرہ شروع ہوتا ہے، جہاں اقبال اس اہم تقاضے کے متعلق قرآنی حل کو پیش کرتا ہے۔ وہ سب سے پہلے "سوختن اور ساختن" کے اصول کو لیتا ہے اور کہتا ہے کہ ؎

نکتۂ می گویم از مردانِ حال　　امتاں را "لَا" جلال "اِلَّا" جمال

لَا و اِلَّا احتسابِ کائنات　　لَا و اِلَّا فتحِ بابِ کائنات

ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون　　حرکت از لَا زاید از اِلَّا سکون

در مقامِ لَا نیاساید حیات　　سوئے اِلَّا می خرامد کائنات

لَا و اِلَّا ساز و برگِ امتاں　　نفی بے اثبات مرگِ امتاں

لَا کے معنی ہیں ہر غلط نظام کو تباہ کر دینا۔ اور اِلَّا کے معنی ہیں۔ اس کی جگہ ایک صحیح نظام کو قائم کرنا۔ یہ صحیح نظام صرف مستقل اقدار کی بنیادوں پر قائم کیا جا سکتا ہے اور مستقل اقدار تنہا عقل کی رو سے کبھی نہیں مل سکتیں۔ یہ اقدار صرف وحی کی رو سے مل سکتی ہیں اس لئے کہ ؎

عقل خود بیں غافل از بہبودِ غیر　　سود خود بیند نہ بیند سودِ غیر

وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ　　در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

اسی لئے اقبال نے افغانی کی زبانی (جاوید نامہ میں) روس کو یہ پیغام دیا تھا کہ ؎

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی　　دل ز دستورِ کہن پرداختی

کردہ کارِ خداونداں تمام　　بگذر از لَا جانبِ اِلَّا خرام

در گذر از لا اگر جویندۂ　　تا رہِ اثبات گیری زندۂ

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے　　جستۂ او را اساسِ محکمے؟

اقبال کے نزدیک نظامِ عالم کے لئے اس قسم کی محکم اساس قرآن کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے اس نے روس سے کہا کہ ؎

داستانِ کہنہ شستی باب باب　　فکر را روشن کن از امّ الکتاب

اس کے بعد وہ کہتا ہے ؎

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ　　دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو　　لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا

با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ　　ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

اقبال کو خالی تخریبی قوت یا تخریبی پروگرام کی ناکامی پر اس قدر یقین تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ روس زیادہ دیر تک تخریب کے گرداب میں رہ نہیں سکتا۔ چنانچہ اس نے اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد" میں یہاں تک کہہ دیا کہ ؎

آیدش روزے کہ از زورِ جنوں　　خویش را زیں تند باد آرد بروں

چنانچہ اقبال اپنے ایک خط میں جو انھوں نے سر فرانسس ینگ ہزبنڈ کو ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا (اور جو ۳۱ر جولائی کے سول اور ملٹری گزٹ میں شائع ہوا تھا) لکھتے ہیں:

"ذاتی طور پر میں نہیں سمجھتا کہ روسی فطرۃً لامذہب ہیں۔ اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ روسی عورتیں اور مرد بڑے مذہبی رجحانات رکھتے ہیں اور روسی ذہن کا موجودہ منفی رجحان ہمیشہ باقی نہیں رہے گا کیونکہ کوئی عمرانی نظام دہریت کی اساس پر باقی نہیں رہ سکتا۔ جونہی اس ملک میں حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ اور اس کے باشندوں کو اطمینان سے غور کرنے کا وقت ملے گا۔ وہ مجبوراً اپنے نظام کی کوئی مثبت بنیاد تلاش کریں گے۔ چونکہ بالشویت کے ساتھ خدا کا قائل ہونا اور اسلام قریب قریب ایک ہی چیز ہیں۔ اس لئے مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوگا۔ اگر کچھ زمانے کے بعد روس اسلام کو ہضم کر لے یا اسلام روس کو۔"

لیکن اقبال ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو ہمیشہ اسی انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ یورپ کا فلاں ملک مسلمان ہو جائے تو اسلام کا بول بالا ہو جائے اور ہماری بھی قسمت جاگ اٹھے۔ وہ مسلمانوں سے ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ تمھاری قسمت تمہارے اپنے ہاتھوں ہی سے بیدار ہوگی۔ لہٰذا اس نے مسلمانوں سے کہا۔ کہ اس وقت زمانہ کے تقاضوں سے جو معاشی کش مکش پیدا ہو رہی ہے، تم اس کی روشنی میں قرآن پہ غور کرو۔ اس سے تمھیں قرآن ایسی راہنمائی دے دیگا جس سے نہ صرف یہ کہ تمھاری قسمت بیدار ہو جائے گی بلکہ تمام اقوامِ عالم کی قیادت تمھارے حصّہ میں آ جائے گی چنانچہ وہ "ضربِ کلیم" میں کہتے ہیں کہ ؎

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم　　بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار

اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور　　فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار

انساں کی ہوس نے جنھیں رکھا تھا چھپا کر　　کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں　　اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

جو حرفِ "قُلِ العَفو" میں پوشیدہ ہے اب تک　　اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

چنانچہ جب خود اقبال نے زمانہ کے ان تقاضوں کی روشنی میں قرآن میں غور کیا تو اس کے سامنے یہ حقیقت آ گئی کہ قرآن کی رو سے رزق کے فطری سرچشموں پر کسی کی انفرادی ملکیت کا تصور یکسر باطل ہے۔ خدائے رب العالمین نے سامانِ رزق کو تمام نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے عام کر رکھا ہے۔ اس لئے اسے اس مقصد کے لئے عام ہی رہنا چاہیئے۔ رزق کے سرچشمے زمین سے پھوٹتے ہیں۔ اس لئے زمین کے متعلق اقبال صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ ؎

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت　　ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

دہ خدایا! نکتۂ از من پذیر   رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
باطن "الارض للہ" ظاہر است   ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است
رزق خود را از زمیں بردن رواست   ایں متاعِ "بندہ" و ملکِ خداست
آب و نانِ ماست از یک مائدہ   دودۂ آدم "کنفسٍ واحدہ"

بالِ جبریل میں قرآن کی اس حقیقت کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جہاں لکھا گیا ہے کہ ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟   کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟   خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟   موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں   تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں!

اقبالؒ پاکستان کا حصول بھی اسی مقصد کے لئے چاہتے تھے کہ یہاں خدا کے اس قانون کو رائج کیا جا سکے، چنانچہ انھوں نے اپنی وفات سے صرف ایک سال پہلے قائد اعظم کو ایک خط لکھا کہ:

"روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گزشتہ دو سو سال سے ان کی حالت مسلسل گرتی چلی جا رہی ہے .... لیگ کا مستقبل اس امر پر موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لئے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ کی طرف سے مسلمانوں کو افلاس کی مصیبت سے نجات دلانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی تو مسلمان پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق ہی رہیں گے .... شریعت اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے .... اسلام کے لئے سوشل ڈیموکریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج، جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا .... ان مسائل کے حل کے لئے ملک کی تقسیم کے ذریعہ ایک یا زائد اسلامی ریاستوں کا قیام اشد لازمی ہے۔"

یعنی اقبال کے نزدیک ایک الگ اسلامی مملکت کی ضرورت ہی اس لئے تھی کہ یہاں اسلامک سوشلزم کا نفاذ کیا جا سکے۔ جیسا کہ اقبال کو خود اندیشہ تھا۔ لیگ نے اس باب میں کچھ نہ کیا جس کا نتیجہ لیگ اور اس کے ساتھ سارا ملک بھگت رہا ہے۔

قرآن کی اس انقلابی دعوت کو جسے اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا تھا، آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے، مفاد پرستانہ مذہبیت کی طرف سے قرآن کی اس آواز کو دبانے کے لئے جو کچھ کیا جا رہا ہے، اس سے کون واقف نہیں۔ وہ سادہ لوح مسلمانوں کو یہ کہہ کر بھڑکاتا ہے کہ جس قرآنی نظام کی طرف "طلوعِ اسلام" دعوت دیتا ہے، وہ ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ جس کا کچل دینا بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔ وہ زمینداروں، جاگیرداروں اور سرمایہ پرستوں کو اطمینان دلاتا ہے کہ تمہارے لئے گھبرانے کی بات نہیں۔

> "اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں۔ بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے .... اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عاید کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں۔ جو شریعت کے جائز کئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر لینے والی ہوں .... جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں، اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔"
>
> (مسئلہ ملکیتِ زمین از ابو الاعلیٰ صاحب مودودی صفحہ ۵۲ و ۵۳)

ہمیں خطرہ صرف یہ ہے کہ اگر اس وقت مسلمانوں نے قرآن کے ان حقائق کو اپنے معاشرہ کی بنیادیں قرار نہ دیا تو کمیونزم کا طوفانِ بدتمیزی نہ معلوم انھیں کہاں سے کہاں لے جائے۔ اس کا ایک نتیجہ تو ہم نے ابھی ابھی مشرقی بنگال میں دیکھ لیا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر یہ خطرہ کیا شکل اختیار کر سکتا ہے۔ اس کی بابت بھی بہتر ہو کہ اقبال ہی کے الفاظ میں سنئے، جو کہہ گیا ہے ؎

کشمیر — اقبال کی نظر میں

اقبال کو کشمیر سے قلبی لگاؤ تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ کشمیری الاصل تھے، حسنِ فطرت کی فراوانی اور "تیز بیں و پختہ کار و سخت کوش" اہالیانِ کشمیر کی مظلومیت نے اقبال کے قلبِ حساس سے کشمیر کی یاد کبھی محو نہیں ہونے دی۔ اقبال نے جا بجا کشمیر کا تذکرہ کیا ہے۔ اس تذکرہ کا جائزہ خصوصی توجہ کا متقاضی ہے جو آج کی قلیل مہلت میں ممکن نہیں۔ اسے آئندہ فرصت پر اٹھا رکھتے ہوئے کشمیر سے متعلق کلامِ اقبال کے کچھ ٹکڑے بلا تبصرہ پیش کئے جاتے ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

میرا عقیدہ ہے کہ کشمیر کی قسمت عنقریب پلٹا کھانے والی ہے۔ (ایک مکتوب)

کشمیر کے سلسلے میں اس کی ضرورت نہیں کہ میں واقعات کے اس پس منظر کو بھی بیان کروں جو اس ملک میں حال ہی میں وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ ایسی قوم کا بظاہر اچانک قیام جس کا شرارِ خودی قریباً مردہ ہو چکا تھا۔ باوجود ان مصائب کے جو اس قیام کا لازمی نتیجہ ہیں۔ ہر اس شخص کے لئے مسرت کا باعث ہے جس کی نگاہ عصرِ حاضر کی ایشیائی تحریکاتِ آزادی کے محرکات پر ہے۔ اہالیانِ کشمیر کا مطالبہ بالکل حق بجانب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی ہونہار اور ہنرمند قوم کا اپنے تشخص میں اعتماد کا از سر نو احیاء آخر کار نہ صرف خود ان کے لئے بلکہ ہندوستان بھر کے لئے تقویت کا باعث ہوگا۔ سب سے زیادہ قابلِ مذمت فرقہ وارانہ منافرت ہے جو اس وقت ہندوستان میں عام ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی اہلِ کشمیر سے قدرتی دلچسپی سے ہندوؤں نے جوابی تحریک شروع کر دی ہے جس کا مقصد از رہِ یاس یہ ہے کہ پان اسلامزم اور برطانوی تسلط کے ہوّے کھڑے کر کے کشمیر کی بربری حکومت کو بچایا جائے۔ (خطبہ، مسلم کانفرنس ۱۹۳۲ء)

خوشا روزگارے خوشا نوبہارے   نجوم پرن رست از مرغزارے
زمیں از بہاراں چو بالِ تذروے   ز فوارہ الماس بار آبشارے
نہ پیچد نگہ جز کہ در لالہ و گل   نہ غلطد ہوا جز کہ بر سبزہ زارے
لبِ جو خود آرائی غنچہ دیدی   چہ زیبا نگارے چہ آئینہ دارے
چہ شیریں نوائے چہ دلکش صدائے   کہ می آید از خلوتِ شاخسارے
بہ تن جاں بہ جاں آرزو زندہ گردد   ز آوائے سارے ز بانگِ ہزارے
نوا ہائے مرغِ بلند آشیانے   در آمیخت با نغمۂ جوئبارے
تو گوئی کہ یزداں بہشتِ بریں را   نہاد است در دامنِ کوہسارے
کہ تا رحمتش آدمی زادگاں را   رہا سازد از محنتِ انتظارے

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است   سازِ قرآں را نوا ہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر   آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
حق اگر از پیشِ ما بردارد ش   پیش قومے دیگرے بگذاردش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن   ہر زماں جانم بلرزد در بدن
ترسم از روزے کہ محرومش کنند   آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

کس قدر دور رس تھیں اس مردِ حق آگاہ کی نگاہیں اور کیسا دردمند تھا اس مردِ مومن کا قلبِ حساس۔ کتنی محبت تھی اسے انسان اور مسلمان سے، اور کیا عشق تھا اسے خدا کے کلام سے ؎

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

چہ خواہم دریں گلستاں گر نہ خواہم   شرابے، کتابے، ربابے، نگارے
سرت گردم اے ساقیٔ ماہ سیما   بیار از نیاگانِ ما یادگارے
بہ ساغر فرو ریز آبے کہ جاں را   فروزد چو نورے بسوزد چو نارے
شقائق بروید ز خاکِ نژندم   بہشتے فرو چیں بہ مشتِ غبارے
نہ بینی کہ از کاشغر تا بہ کاشاں   ہماں یک نوا بالد از ہر دیارے
ز چشمِ امم ریختہ آں اشکِ نابے   کہ تاثیرِ او گل دماند ز خارے
کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ   بتے می تراشد ز سنگِ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے   خودی ناشناسے ز خود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او   نصیبِ تنش جامۂ تار تارے
نہ در دیدۂ او فروغِ نگاہے   نہ در سینۂ او دلِ بیقرارے

ازاں مے فشاں قطرہ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب   مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بیتاب
آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر   کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوزناک   مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر
کہہ رہا ہے داستاں بیدردیٔ ایام کی   کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ   ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو   تھرتھراتا ہے جہانِ چار سوئے رنگ و بو
پاک ہوتا ہے ظن و تخمیں سے انساں کا ضمیر   کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغِ آرزو
وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں   عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تارِ رفو
ضربتِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش   حاکمیت کا بتِ سنگیں دل و آئینہ رو

دراج کی پرواز میں ہے شوکتِ شاہیں   حیرت میں ہے صیاد یہ شاہیں ہے کہ دراج
ہر قوم کے افکار میں پیدا ہے تلاطم   مشرق میں ہے فردائے قیامت کی نمود آج
فطرت کے تقاضوں سے ہوا حشر پہ مجبور   وہ مردہ کہ تھا بانگِ سرافیل کا محتاج

جس خاک کے ضمیر میں ہے آتشِ چنار   ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

نصیبِ خطہ ہو یارب وہ بندۂ درویش   کہ جس کے فقر میں انداز ہوں کلیمانہ
چھپے رہیں گے زمانے کی آنکھ سے کب تک   گہر ہیں آبِ وُلر کے تمام یکدانہ

دگرگوں جہاں ان کے زورِ عمل سے   بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے
منجم کی تقویمِ فردا ہے باطل   گرے آسماں سے پرانے ستارے
ضمیرِ جہاں اس قدر آتشیں ہے   کہ دریا کی موجوں سے ٹوٹے ستارے
زمیں کو فراغت نہیں زلزلوں سے   نمایاں ہیں فطرت کے باریک اشارے
ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک   خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے

حاجت نہیں اے خطۂ گل شرح و بیاں کی   تصویر ہمارے دلِ پرخوں کی ہے لالہ
تقدیر ہے اک نام مکافاتِ عمل کا   دیتے ہیں یہ پیغام خدایانِ ہمالہ
سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اس کا   دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالہ
امید نہ رکھ دولتِ دنیا سے وفا کی   رم اس کی طبیعت میں ہے مانندِ غزالہ

زیرِ گردوں آدم آدم را خورد   ملتے بر ملتے دیگر چرد
جاں ز اہلِ خطہ سوزد چوں سپند   خیزد از دل نالہ ہائے دردمند

زیرکے و دراکے و خوش گل ملتے است   در جہاں تر دستیٔ او آیتے است
ساغرش غلطندہ اندر خونِ اوست   در نے من نالہ از مضمونِ اوست
از خودی تا بے نصیب افتادہ است   در دیارِ خود غریب افتادہ است
دست مزدِ او بدستِ دیگراں   ماہیِ رودش بہ شستِ دیگراں
کارواں ہا سوئے منزل گام گام   کارِ او ناخوب و بے اندام و خام
از غلامی جذبہ ہائے او بمرد   آتشے اندر رگِ تاکش فسرد
تا نہ پنداری کہ بود است ایں چنیں   جبہہ را ہموارہ سود است ایں چنیں

در زمانے صف شکن ہم بودہ است
چیرہ و جانباز و پردم بودہ است

کوہ ہائے خنگ سارِ او نگر   آتشیں دستِ چنارِ او نگر

در بہاراں لعل می ریزد ز سنگ   خیزد از خاکش یکے طوفانِ رنگ
لکہ ہائے ابر در کوہ و دمن   پنبہ پرّاں از کمانِ پنبہ زن
کوہ و دریا و غروبِ آفتاب   من خدا را دیدم آنجا بے حجاب
مرغکے می گفت اندر شاخسار   با پشیزے می نیرزد ایں بہار
لالہ رست و نرگسِ شہلا دمید   بادِ نوروزی گریبانش درید
عمرہا بالید ازیں کوہ و کمر   نسترن از نورِ قمر پاکیزہ تر
عمرہا گل رخت بربست و کشاد   خاکِ ما دیگر شہاب الدیں نزاد

بادِ صبا اگر بہ جنیوا گذر کنی   حرفے ز ما بہ مجلسِ اقوام باز گو
دہقان و کشت و جوے و خیاباں فروختند   قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

ہند را ایں ذوقِ آزادی کہ داد   صید را سودائے صیادی کہ داد
آں برہمن زادگانِ زندہ دل   لالۂ احمر ز روئے شاں خجل
تیز بین و پختہ کار و سخت کوش   از نگاہِ شاں فرنگ اندر خروش
اصلِ شاں از خاکِ دامنگیرِ ماست   مطلعِ ایں اختراں کشمیرِ ماست
خاکِ ما را بے شرر دانی اگر   بر درونِ خود یکے بکشا نظر
ایں ہمہ سوزے کہ داری از کجاست   ایں دمِ بادِ بہاری از کجاست

ایں ہمہ باد است کز تاثیرِ او
کوہسارِ ما بگیرد رنگ و بو

تو ز اہلِ خطہ نومیدی چرا؟

دل میانِ سینہ شاں مردہ نیست   اخگرِ شاں زیرِ یخ افسردہ نیست
باش تا بینی کہ بے آوازِ صور   ملتے برخیزد از خاکِ قبور
غم مخور اے بندۂ صاحب نظر   برکش آں آہے کہ سوزد خشک و تر
از نوا تشکیلِ تقدیرِ امم   از نوا تخریب و تعمیرِ امم

تازہ آشوبے فگن اندر بہشت
یک نوا مستانہ زن اندر بہشت

حجاز ہوٹل

(اینڈ ریسٹورنٹ)

نزد ٹی اسٹیشن عقب کاٹن ایکسچینج۔ پردہ دار۔ ہوادار رہائشی کمرے۔ خالص گھی کے عمدہ کھانے
قرآنی فکر و نظر والے اصحاب کی عمومی نشستگاہ ہے۔

ملک غلام کبریا منیجر

درِ منثور

ان موتیوں میں سے چند موتی جو اقبالؒ کے مکتوبات و دیگر تحریراتِ نثر میں جابجا بکھرے پڑے ہیں:

اسلام تقدیر کا محتاج نہیں۔ وہ بجائے خود تقدیر ہے۔ (خطبہ صدارت ۱۹۳۰ء)

زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ (دیباچہ پیامِ مشرق)

تاریخ انسانیت میں اسلام کا ظہور ایسے وقت میں ہوا جب کہ توحیدِ انسانیت کے دنیاوی اصول مثلاً خونی رشتے اور تخت و تاج کے علائق ناکام ہو رہے تھے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک توحیدِ انسانیت کا اصول گوشت و پوست سے متعلق نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ قلبِ انسانی میں ہے۔ انسانیت کے نام اسلام کا عمرانی پیغام یہی ہے کہ نسلی امتیازات مٹا دو۔ ورنہ خانہ جنگی میں تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ کہنا مبالغہ آمیزی نہیں ہوگا کہ اسلام قدرت کے نسل ساز مظاہر کو پسند نہیں کرتا اور اپنے مخصوص اداروں سے ایسے نقطۂ نگاہ کی تخلیق کرتا ہے جو قدرت کے نسل ساز قویٰ کو بیکار کر دے۔ انسانوں کے سدھارنے کے لئے اسلام نے ایک ہزار سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو عیسائیت اور بدھ مت سے دو ہزار سال سے اوپر میں بھی نہیں ہو سکا۔

(احمدیت سے متعلق۔ نہرو کے جواب میں)

اسلام کا مذہبی نصب العین اس معاشری نظام سے ناقابلِ شکست طریق سے وابستہ ہے جو اس نے تشکیل دیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک کا انکار دوسرے کے انکار کو مستلزم ہے۔ لہٰذا قومی خطوط پر کسی ہیئتِ اجتماعیہ کا قیام اسلامی اصولِ وحدت کا نقیض ہے۔ کوئی مسلمان اس کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ (خطبہ صدارت ۱۹۳۰ء)

اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے۔ جو اس کے قومی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ قدیم زمانے میں دین قومی تھا۔ جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے۔ پھر اسلام ہی تھا جس نے بنی نوعِ انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی ہے نہ انفرادی ہے اور نہ پرائیویٹ۔ بلکہ خالصتہً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالمِ بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالمِ انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک امت کی تشکیل اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے۔

(حسین احمد مدنی کے جواب میں بیان)

اسلام نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود معیّن کرتا ہے۔ ان حدود کے معیّن کرنے کا نام اصطلاحِ اسلام میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

اقوام و ملل کے عروج و زوال کی داستانوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوموں کی زندگی کی سوتیں خشک ہونا شروع ہوتی ہیں تو ان کا زوال بجائے خود ان کے شعرا، فلاسفہ، بہشتوں سیاسیین وغیرہم کو ایک نئی تحریکِ خیال سے ابھارتا ہے چنانچہ وہ پیغمبرانہ شان سے اٹھتے ہیں اور استدلال کے گورکھ دھندے تیار کر کر کے حیاتِ ملّی کے رذائل و ذمائم کے گیت گاتے ہیں اور انھیں خوش آیند و درخشاں بناتے ہیں یہ پیغمبر غیر شعوری طور پر قنوطیت کو رجائیت کے لگاہ فریب لباس میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اہلِ قوم کے عملی قویٰ کو مشلول کر دیتے ہیں اور ان کی روحانی قوتِ نمو کو یکسر فنا کر دیتے ہیں۔

(بیان متعلقہ احمدیت)

جب کسی کلچر میں علاماتِ زوال نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں تو اس کی فلسفیانہ بحثیں، اس کے تصورات اور اس کے وارداتِ روحانی کی شکلیں جامد اور غیر متحرک ہو جاتی ہیں۔ مجوسی کلچر ایسے ہی دور سے گزر رہی تھی کہ اسلام کا ظہور ہوا۔ جہاں تک میں تاریخ کلچر کا مطالعہ کر سکا ہوں۔ اسلام نے مجوسی کلچر کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ قرآن میں بیّن ثبوت اس امر کے ملتے ہیں کہ قرآن کا مقصد یہ تھا کہ وہ نہ صرف فکر کی نئی راہیں کھول دے بلکہ واردات و کیفیاتِ روحانی کی تشکیلِ نو کرے لیکن ہمارے مجوسی ورثہ نے اسلام کی زندگی کی سوتیں خشک کر دیں اور اس کی روح کی نشو و نما اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے سلسلے کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

(احمدیت سے متعلق — اخبار لائٹ کے جواب میں)

اسلام اس وقت زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ (صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب اور خود اپنے کمال کا مدّعی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں۔ (صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے جورس پروڈنس (اصولِ فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کریگا وہی اسلام کا مجدّد ہوگا۔ اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔

(صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے۔ اور قرآن کی تفسیر میں محاورہ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معانی لئے جاتے ہیں جو عربی زبان میں ہرگز نہیں۔ (سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

اسلام کے لئے اس ملک میں نازک زمانہ آ رہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ علماء میں مداہنت آ گئی ہے۔ یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیا اسلام سے بے پرواہ اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آجکل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں۔

(چودھری نیاز علی خاں کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

مسلمانوں پر اس وقت (دماغی اعتبار سے) وہی زمانہ آ رہا ہے جس کی ابتدا یورپ کی تاریخ میں لوتھر کے عہد سے ہوئی۔ مگر چونکہ اسلامی تحریک کی کوئی خاص شخصیت راہ نما نہیں ہے۔ اس واسطے اس تحریک کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں۔ نہ عامۃ المسلمین کو یہ معلوم ہے کہ اصلاح لوتھر نے مسیحیت کے لئے کیا کیا نتائج پیدا کئے ہیں۔ (سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۲۶ء)

میرے دل میں ممالک اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کر لے۔ (سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۲۶ء)

قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

ٹیپو ہندوستان کا آخری مسلمان سپاہی تھا جس کو ہندوستان کے مسلمانوں نے جلد فراموش کر دینے میں بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے۔ جنوبی ہندوستان میں جیسا کہ میں نے خود مشاہدہ کیا ہے اس عالی مرتبت مسلمان سپاہی کی قبر زندگی رکھتی ہے بہ نسبت ہم جیسے لوگوں کے جو بظاہر زندہ ہیں یا اپنے آپ کو زندہ ظاہر کر کے لوگوں کو دھوکہ دیتے رہتے ہیں۔

(میجر سعید محمد خاں کے نام خط۔ اس خط پر تاریخ درج نہیں)

اس وقت (ہندوستان کے) مسلمان دو امراض میں مبتلا ہیں۔ پہلا مرض ان قائدین کا فقدان ہے جو اسلام کی روح اور تقدیر کو بھی بخوبی سمجھتے ہوں۔ اور تاریخ جدید کے میلانات پر بھی ان کی نگاہ ہو۔ ایسے اشخاص ہی قوموں کی قوت متحرکہ ہوتے ہیں لیکن وہ خدا کی دین ہوتے ہیں اور ضرورت کے مطابق پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ دوسرا مرض احساس اجتماعیت کا فقدان ہے۔ اس سے افراد اور گروہ اپنی جداگانہ راہیں تلاش رہے ہیں اور عمومی فکر اور اجتماعی حرکت میں کوئی اضافہ نہیں کر رہے۔ اس وقت ہم سیاست میں وہ کچھ کر رہے ہیں جو مذہب میں صدیوں سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ مذہبی تفرقہ بازی قومی حدت کو زیادہ نقصان نہیں پہنچاتی۔ کیونکہ مذہبی فرقے اس حد تک باغی نہیں ہو جاتے کہ اسلام سے ہی منحرف ہو جائیں لیکن سیاسی انتشار بالخصوص ایسے نازک وقت میں کہ ملت کا اجتماعی مفاد اتحاد عمل کا متقاضی ہو، مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ (ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

قومی وحدت ہرگز قائم و دائم نہیں ہے۔ وحدت صرف ایک معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے۔ جو نسل، زبان، رنگ اور قومیت سے بالاتر ہے۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید و تولید ہو قابلِ احترام ہے۔ (دیباچہ پیامِ مشرق)

جو قوم دوسری اقوام سے متعلق جذباتِ نفرت رکھتی ہے ذلیل اور رذیل ہے۔

(خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

میں یورپی تصور کی وطنیت کا مخالف ہوں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس سے مسلمانوں کو کم تر مادی فوائد حاصل ہوں گے۔ بلکہ اس لئے کہ اس میں منکر خدا مادیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں جنہیں میں جدید انسانیت کے لئے عظیم ترین خطرہ سمجھتا ہوں۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

مسلم لیگ کو آخرکار یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ بدستور سابق مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی تک ہی محدود رہے گی یا مسلمان عوام کی نمائندگی بھی کرے گی۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ جو سیاسی جماعت عام مسلمانوں کا درجہ بلند کرنے کی داعی نہیں وہ عوام میں کبھی مقبول نہیں ہو سکتی۔

(قائداعظمؒ کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

آئین کے مطابق اعلیٰ عہدے امراء کی اولاد کے لئے وقف ہیں۔ اور نچلے درجے کے عہدے وزیروں کے دوستوں اور رشتہ داروں کا حصہ ہیں۔ دیگر امور میں ہمارے سیاسی اداروں نے عامۃ المسلمین کا عمومی درجہ بلند کرنے کا کبھی خیال تک نہیں کیا۔ پیٹ کا مسئلہ دن بدن لاینحل ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمانوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ وہ دو سو سال سے ذلیل سے ذلیل تر ہوتا جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے مسلمان کے افلاس کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے۔ لیگ کا سارا مستقبل اس مسئلہ کے حل پر منحصر ہے۔ اگر لیگ اس مسئلے کے حل سے قاصر رہی تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے دور رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اس کا حل اسلامی آئین کی تنفیذ میں ہے۔ طویل غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس طرز آئین کو کماحقہٗ سمجھ کر نافذ کر دیا جائے۔ تو کم از کم ہر ایک کا حق معیشت تو محفوظ ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانے کے پیدا کردہ مسائل کا حل ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لئے زیادہ آسان ہے۔ (قائداعظم کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

جن نام نہاد مدبرین کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی تھی وہ خونریزی، سفاکی اور زیردست آزادی کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاق انسانی کے نوامیس عالیہ کی حفاظت کریں، انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں۔ انھوں نے ملوکیت و استعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا۔ صرف اس لئے کہ ان کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے۔

(ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور خدا جانے اور کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ اور ان نقابوں کے نیچے دنیا بھر کے تمام گوشوں میں قدر حریت اور شرف انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ (ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

جب تک اقوام کی خودی قانونِ الٰہی کی پابند نہ ہو، امن عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے جس سے انحطاط کا مسحور اپنے قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔

(سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ صلعم سے ہوئی۔ (منشی سراج الدین کے نام خط۔ ۱۹۱۵ء)

ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا۔ بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ شعرائے عجم نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کی اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے۔ (سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ جس قوم میں توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجبِ تسکین۔ اس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور شکست کو جو ان کو تنازع البقا میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔

(سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

تصوف کا وجود سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی۔ (سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۱۷ء)

جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظامِ عالم نے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ (علامہ اسلم جیراجپوری کے نام خط۔ سنہ ۱۹۱۹ء)

ہندی اور ایرانی صوفیا میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفۂ وحدانیت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہو گئے۔ میرے عقیدے کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہے۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ سنہ ۱۹۳۶ء)

جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے، جس کا مقصد قوتِ نفس اور روحِ انسانی کا ترفع ہو۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ سنہ ۱۹۳۶ء)

اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال رہا ہے۔ تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے۔ (سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ سنہ ۱۹۳۳ء)

میرے زیر نظر حقائق اخلاقی و ملی ہیں۔ زبان میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ فن شعر سے بھی بحیثیت فن کے نابلد ہوں۔ (پروفیسر شجاع کے نام خط۔ سنہ ۱۹۳۱ء)

شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں۔ اس جانور میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں۔ (۱) خوددار و غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔ (۳) بلند پرواز ہے (۴) خلوت پسند ہے (۵) تیز نگاہ ہے۔ (مولوی ظفر احمد صاحب کے نام خط۔ سنہ ۱۹۳۶ء)

شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ سنہ ۱۹۱۹ء)

میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں۔ اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں، جن کے بیان کے لئے ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے ورنہ ؎

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست　　　　کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ سنہ ۱۹۳۵ء)

اسلام بلکہ کائنات انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے۔ اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدودِ ملک پر ہے دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدہ کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ (پروفیسر نکلسن کے نام خط۔ متعلقہ فلسفہ سخت کوشی)

نسل اور حدود ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیات اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اسے یہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں اس چیز کا مخالف ہوں کہ اسے انسانی قوتِ عمل کا مظہر اتم قرار دیا جائے۔

(پروفیسر نکلسن کے نام خط۔ متعلقہ فلسفہ سخت کوشی)

ضرب کلیم

[ذیل میں ضرب کلیم (عربی) کا تعارف پیش لفظ اور مقدمہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کی افادیت آج بھی وہی ہے جو وہ تحریر تھی۔ طلوع اسلام]

مقدمہ

خدایا! ہم تجھ ہی سے توفیق و ہدایت کے طلبگار ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے شاعر فیلسوف ڈاکٹر محمد اقبال کے فارسی دیوان "پیام مشرق" کا عربی ترجمہ تقریباً دس سال میں تیار ہو گیا۔ اپریل سنہ ۱۹۵۱ء میں علامہ مرحوم کی تیرھویں برسی کے موقعہ پر یہ عربی دیوان کراچی میں چھپ کر شائع ہوا اور مجلسِ اقبال نے یوم اقبال کے سرکاری اجتماع میں اس کو پاکستان کے گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔

عربی میں اقبال کے کلام کا یہ ترجمہ مرحوم کی دلی تمنا اور میری ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل تھی۔ آخر کار وہ منزل آ گئی جس کی طرف میں نے بارہا قدم بڑھانے کی کوشش کی تھی لیکن مصروفیتیں ہمیشہ سدِ راہ ہوتی رہی تھیں۔

"پیام مشرق" کے اس عربی ترجمہ "رسالۃ المشرق" نے پاکستان کے اہلِ علم، ادیب اور سیاسی طبقہ میں غیر معمولی اثرات پیدا کئے اور عربی خواں طبقہ میں اس کو خاص طور پر مقبولیت حاصل ہوئی۔

اس کامیابی نے مجھے اسی راہ پر گامزن رہنے کی دعوت دی کہ اس عظیم المرتبہ شاعر کے دوسرے دیوانوں کو بھی عربی میں منتقل کروں اور اس تحریک نے مجھے اس کام کو جس کی خود میں نے ابتدا کی تھی، جاری رکھنے اور اس کے لئے دشواریاں برداشت کرنے پر آمادہ رکھا۔ "رسالۃ المشرق" کی اس مقبولیت ہی کا نتیجہ تھا کہ بہت سے پاکستانی احباب اور متعارفین ایک دوسرے ترجمہ کی امید میں میری آنکھیں لگائے ہوئے تھے۔

"پیام مشرق" کے ترجمہ کے بعد میں نے اس مقصد کے لئے "جاوید نامہ" کو تجویز کیا جس کے ترجمہ کے لئے میں اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ ارادہ کر چکا تھا۔ "جاوید نامہ" ایک ایسی داستان ہے جس میں اقبال نے مسلمانوں کے بہت سے احوال کا تذکرہ کیا ہے اور سیاحت سیارات کے پیرایہ میں اپنے فلسفہ و افکار کی تشریح کی ہے اور اس سلسلہ میں مشہور صوفی شاعر جلال الدین رومی صاحب مثنوی کو اپنا دلیلِ راہ بنایا ہے۔ اس لئے میں نے کسی پس و پیش کے بغیر "پیام مشرق" کے بعد "جاوید نامہ" کو ترجمہ کے لئے منتخب کر لیا۔

لیکن اقبال کو پسند کرنے والے اور اس کے شیدائیوں میں سے ایک دوست نے جو نہ صرف اقبال کے کلام اور اس کے فلسفہ و سیرت پر گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ ان مخصوص افراد میں سے ہیں جن کو اقبال کی صحبتیں میسر رہی ہیں اور انھوں نے اقبال کے تعارف اور اس کے پیغام کی توضیح و تشریح میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے، ایک دوسرے دیوان کے ترجمہ کی تجویز میرے سامنے رکھی۔

ہمارے دوست جناب غلام احمد پرویز نے فرمایا: میری رائے ہے کہ آپ "ضرب کلیم" کا ترجمہ کریں۔ جو اقبال کا خود مرتب کردہ آخری دیوان ہے۔ ارمغان حجاز کے سوائے جو اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوا ہے اس کی آخری منظومات میں سے ہے۔ اس لئے اس دیوان "ضرب کلیم" میں اقبال کا فلسفہ اور اس کے محکم افکار و نظریات پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں اور ان خاص موضوعات میں جن کو اس نے دیوان کی فصول قرار دیا ہے۔ اس کا پیغام نہایت واضح ہے۔ "جاوید نامہ" ایک طویل مسلسل اور دقیق نظم ہے جس کے سمجھنے کے لئے فلسفہ و تاریخ کے کثیر سرمایہ کی ضرورت ہے، اور صرف ان لوگوں کے لئے اس کے مطالب کا سمجھنا آسان ہے جن کو علم و ادب سے بہرہ وافر میسر آیا ہو۔ "جاوید نامہ" کا مترجم ترجمہ کی تکمیل سے قبل اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتا اس کے برعکس "ضرب کلیم" کا مترجم ہر قطعہ کا ترجمہ کر لینے کے بعد ایک نتیجہ خیز کام کی تکمیل کر لیتا ہے، اور ایک فصل کو ختم کر کے ایک مرحلہ تک پہنچ جاتا ہے۔

ان تمام امور کے علاوہ ضربِ کلیم میں اشعار کی تعداد کم اور ترجمہ کی سہولت نسبتاً زیادہ ہو محترم دوست ہم اسی قسم کے دلائل پیش کرتے رہے یہاں تک کہ میں بھی ان کی رائے سے متفق ہو گیا کہ جاوید نامہ پر ضربِ کلیم کے ترجمہ کو ترجیح دوں اور اس داستان کو ایک بار پھر کسی دوسری فرصت کے لئے اٹھا رکھوں۔ الشیخ کا ہم

ہماری رائے تھی کہ ترجمہ سے پہلے اس دیوان کے مطالعہ تحقیق مطالب اور اس کی تعبیرات پر غور و فکر کے لئے ایک جگہ مجتمع ہوتے رہیں۔ اس کے لئے طے پایا کہ اس قسم کے اجتماعات مصری سفارت خانہ کراچی کے قصر میں منعقد ہوں۔ اور جب تک اس دیوان کے مطالعہ سے فراغت میسّر نہ آئے ہفتہ میں دو یا تین بار ہم جمع ہوتے رہیں۔ اس اندیشہ کے پیشِ نظر کہ مختلف مشغولیتیں ان مجالس میں سدِّ راہ نہ ہوں ہم نے اس امر کا اہتمام کیا کہ ایک مجلس سے اس وقت تک نہ اٹھیں جب تک آئندہ نشست کے لئے کوئی وقت مقرر نہ کر لیا جائے۔ ان مجالس کا اشتیاق اور ان کی یاد ہمیں ان کی شرکت کے لئے زیادہ مستعد رکھتی تھی۔

میں فاضل محترم غلام احمد پرویز اور محترم سیّد عبدالواحد (انسپکٹر جنرل جنگلات حکومتِ پاکستان) جو منسوبِ اقبال اور اس کی سیرت پر لکھنے والے مصنفین میں سے ہیں، اس مجلس کے ارکان تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے اقبال دوست احباب بھی ان مجالس میں شریک ہوتے۔ بعض لوگ پابندی سے آتے اور بعض ایک دو مجلسوں میں ہی شرکت کر سکتے تھے۔ اس لئے یہ حلقہ کبھی تنگ اور کبھی وسیع ہوتا رہتا تھا۔

وقتاً فوقتاً ہم دعوتوں کا اہتمام بھی کرتے تھے اور ان میں مجلسِ اقبال کے دوسرے ارکان اور اسکے صدر چودھری نذیر احمد کو بھی شرکت کی دعوت دیتے تھے۔ جو اس وقت پاکستان کے وزیرِ صنعت تھے۔

محترم غلام احمد پرویز شیخِ مجلس تھے۔ وہ کتاب پڑھتے۔ اس کی تشریح کرتے اور فکرِ اقبال کی بحث تفصیل میں کسی شعری و ادبی یا فلسفی موضوع کی انتہا تک پہونچ جاتے اور اس کے ساتھ ساتھ اقبال کے کلام کو قرآنی حقائق سے مربوط کرتے جاتے۔

ان مجالس کو 'مجلسِ اقبال' یا 'مجالسِ اقبال' کا نام دیا گیا تھا۔ ان میں شرکت کرنے والے 'درویشانِ اقبال' اور 'قلندرانِ اقبال' کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔ اور غلام احمد پرویز صاحب 'شیخ درویشاں' و 'شیخ قلندرانِ اقبال' تھے۔

عید الفطر کے بعد ۱۳۷۰ھ میں ہم نے 'ضربِ کلیم' کا مطالعہ شروع کیا اور جب اس سے فارغ ہوئے تو میں نے کتاب کے آخری صفحہ پر بطور یادداشت حسبِ ذیل کلمات لکھے:

"شنبہ ۵ محرم ۱۳۷۱ھ (۶ر اکتوبر ۱۹۵۱ء) کی شب میں دیوان کا مطالعہ تکمیل کو پہنچا۔
اوّل و آخر خدا ہی کے لئے حمد و ستائش ہے۔ اللہ تعالیٰ روحِ اقبال پر رحم فرمائے"

تین ماہ میں کتاب ختم ہو گئی۔ اگرچہ اس دوران میں بعض اوقات مشاغل کی کثرت کی وجہ سے ہم مجلس کی جانب پوری توجہ نہیں دے سکے اور ان کا سلسلہ ہمارے اندازے کے مطابق جاری نہ رہ سکا۔

شب دوشنبہ ۱۱ شوال ۱۳۷۰ھ (۱۶ر جولائی ۱۹۵۱ء) کو 'ضربِ کلیم' کے ترجمہ کی ابتدا ہوئی اور جب میں اس کے ترجمہ سے فارغ ہوا تو ان سطور کے نیچے جن میں مطالعہ کی تاریخ ثبت کی گئی تھی۔ میں نے ذیل کے کلمات تحریر کئے:

"اللہ تعالیٰ نے شب یک شنبہ ۱۸ صفر الخیر ۱۳۷۱ھ (۱۸ر نومبر ۱۹۵۱ء) کو ترجمہ کی تکمیل کی توفیق ارزانی فرمائی"

اس طرح تقریباً چار ماہ تک میں ترجمہ کے کام میں مشغول رہا اور مطالعہ کتاب کے ڈیڑھ ماہ بعد اس سے فراغت میسّر آ گئی۔

'پیامِ مشرق' کے ترجمہ میں طباعت کی صفائی اور دیدہ زیبی کے لحاظ سے جو فروگذاشتیں رہ گئی تھیں، ان کی مکافات کی غرض سے اس دیوان کی طباعت کے لئے میں نے مصر کو ترجیح دی۔ چنانچہ سفرِ وطن کی تیاری شروع کی اور جب ۲۰ر دسمبر کو وطن مالوف پہنچا تو سفر پیہم اور کثرتِ مشاغل کے دوران میں فرصت کے جو لمحات میسّر آئے ان میں دیوان کی تبییض اور اس کو طباعت کے لئے تیار کرنے کا شغل جاری رکھا۔ فاضل عزیز محمود جعفر الجبالی (ٹیکس انسپکٹر حکومتِ مصر) نے ان مبیضات کو ٹائپ کرنے کی ذمہ داری لے لی۔

لجنۃ الازہر نے میرے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس دیوان کو وہ اپنے اہتمام سے شائع کریں تاکہ یہ انہی کی مطبوعات میں شمار کیا جائے۔ میں نے شکر گزاری کے ساتھ ان کی یہ پیشکش قبول کر لی۔ میری خواہش تھی کہ اس کی طباعت میرے قیامِ وطن کے دوران میں مکمل ہو جائے تاکہ میں خود اس کی تصحیح کی نگرانی کر سکوں اور ضرورت ہو تو بعض کلمات میں ترمیم و تبدیل کا فرض بھی انجام دوں لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا اور کتاب کی طباعت سے قبل ہی مجھے پاکستان آنا پڑا۔

عزیز محترم جناب جبالی طباعت کی نگرانی اور پابندی کے ساتھ میرے پاس ہوائی ڈاک سے پروف بھیجتے رہنے کی ذمہ داری انجام دیتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

واقعی یہ ایک خوش نصیبی ہے کہ اس عظیم فلسفی شاعر اقبال کی تمنا میرے ذریعہ بر آ رہی ہے، اور اقبال کے بعض دواوین میرے توسط سے عربی میں منتقل ہو کر قرآنی زبان کی ادبی دولت میں اضافہ کر رہے ہیں۔

یہ امر بھی میرے لئے باعثِ مسرت ہے کہ اسلام کے اس ممتاز شاعر کی چودھویں سالانہ یادگار کے موقعہ پر میں 'ضربِ کلیم' کو عربی لباس میں پیش کر رہا ہوں۔ جیسا کہ اس سے قبل تیرھویں برسی کے موقعہ پر میں نے 'پیامِ مشرق' کے ترجمہ کی پیشکش کی تھی۔

بارہا میں نے یہ آرزو کی تھی کہ اقبال کے دواوین کا عربی میں ترجمہ کروں لیکن مجھے کبھی یہ امید نہیں تھی کہ توفیقِ الٰہی سے آٹھ ماہ سے کم مدت میں دو دیوانوں کے ترجمہ کی خدمت انجام دینا میرے لئے ممکن ہو سکے گا اور ایک ہی سال میں ان کی اشاعت کا مرحلہ طے ہو جائے گا۔

اس توفیقِ عظیم کے لئے اللہ ہی کا شکر و سپاس ہے اور اسی سے توفیق و الہام اور راستکاری کی التجا کی جاتی ہے۔ وھو حسبی و نعم الوکیل۔

عبدالوہاب عزام۔ کراچی ۱۹ر جمادی الثانی ۱۳۷۲ھ

تعارف

'ضربِ کلیم' اقبال کا ایسا مجموعۂ کلام ہے جو انسان بحیثیت فرد، انسان بحیثیت رکن جماعت، دین، تربیت، ادب و سیاست کے متعلق حکیمانہ افکار و نظریات پر مشتمل ہے۔ اس اعتبار سے یہ کلام شعریت کی نسبت فلسفہ و تفکر میں زیادہ ڈوبا ہوا ہے لیکن جذبات اور تخیل کی آمیزش نے اس کو شعری صف میں شامل کر دیا ہے۔ کائنات کی ہر وہ حقیقت شعر بن جاتی ہے، جو انسان کے جذبہ و وجدان سے آب و رنگ حاصل کر لیتی ہے۔ یا جس کو انسانی تخیل ایک خاص شکل و صورت میں نمایاں کر دیتا ہے۔

شعریت ایک دائرہ ہے اور موضوعاتِ شعر اس دائرہ کے خطِ محیط سے مرکز تک مرتب و منظم ہیں بعض موضوعات خطِ محیط سے قریب تر ہیں۔ ان کو شعر سے کم اور ان موضوعات سے زیادہ قریبی ربط ہوتا ہے۔ جو اس دائرہ سے خارج ہوں بعض موضوعات شعریت میں زیادہ دقیق ہوتے ہیں اور اس طرح جذبہ و تخیل کے تناسب کے ساتھ یہ ترتیب مرکزی دائرہ کی خاص شعریت تک پہنچ جاتی ہے۔

'ضربِ کلیم' میں بعض اوقات اقبال کا کلام شعر کی صنف میں جلوہ آرا ہوتا ہے جو مجرد حقائق سے قریب تر ہے۔ اور بعض مرتبہ خالص شعریت میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی وہ مرکزِ شعر کی بہ نسبت خطِ محیط سے زیادہ قریب ہے۔

اس بنا پر 'پیامِ مشرق' کی بہ نسبت مجھے 'ضربِ کلیم' کے ترجمہ میں زیادہ مشقت اور دشواری کا سامنا ہوا ہے۔ اس دشواری کی ایک خاص وجہ میری یہ زبردست خواہش بھی تھی۔ کہ ترجمے میں شعری نزاکتیں پوری طرح محفوظ رہیں۔ اصل کا حسنِ شعر پھیکا نہ ہو جائے اور وہ ہلکی سی رنگین شعری نقاب نہ اتر جائے جو اقبال نے حقائقِ فلسفیہ کے چہرے پر ڈالی ہے کہیں ایک چمن سے دوسرے چمن میں منتقل کرنے کی وجہ سے شعر کی ننھی ننھی کلیاں مرجھا نہ جائیں۔

بحیثیتِ مجموعی یہ کلام نغمۂ موسیقی نہیں بلکہ ایک ایسی ضربِ خارا شگاف ہے جو سینۂ سنگ سے چشمے پیدا کرتی ہے، جیسا کہ خود اقبال نے کہا ہے ؎

"نہ پوچھ ضربتِ کاری کا ہے مقام   میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ"

شاید پڑھنے والے اس کلام میں شاعرانہ انداز تخیل اور تازگی فکر کی جستجو کی بجائے ان حقیقتوں کو زیادہ شفاف محسوس کریں گے جن کو پیرایۂ شعر میں ظاہر کیا گیا ہے' اور شاید اس طرح وہ انشا پرداز اور مترجم کی ان دشواریوں کا بھی اندازہ لگا سکیں گے۔ جو ایک سنجیدہ اور متین اسلوبِ شعر میں ان حقائق کی نقاب کشائی میں پیش آتی ہیں۔

ابواب و فصول

شاعرِ مشرق نے 'ضربِ کلیم' کو چھ فصلوں پر تقسیم کیا ہے' اور ان سے پہلے دو قطعے اور ایک قصیدہ پیش کیا ہے۔ پہلا قصیدہ ان چند ابیات پر مشتمل ہے جن میں دیوان کو نواب حمید اللہ خاں والی بھوپال کے نام معنون کیا گیا ہے۔ دوسرے قطعے میں شاعر نے تاریخ سے خطاب کیا ہے اور قصیدہ کو دیوان کی تمہید کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

دیوان کی فصول حسبِ ذیل ہیں:

(۱) اسلام اور مسلمان (یہ اس دیوان کی سب سے طویل فصل ہے)
(۲) تعلیم و تربیت
(۳) عورت
(۴) فنونِ لطیفہ (یہ اس دیوان کی دوسری طویل فصل ہے)
(۵) سیاستِ مشرق و مغرب
(۶) محراب گل افغان کے افکار

فلسفۂ اقبال

اس موقعہ پر اقبال کے فلسفہ کے متعلق چند مختصر کلمات پیش کرنا مناسب ہے۔ جو اقبال کے مقاصد عالیہ اور اس کا منتہائے نظر سمجھنے میں پڑھنے والوں کے لئے مددگار ثابت ہوں گے۔ اقبال کے فلسفہ کی اساس وہ تصور ہے۔ جس کو اس نے خودی سے تعبیر کیا ہے۔ اقبال نے بہت سے اشعار میں اپنے اس مسلک کو واضح کیا ہے اور اس کے لئے ایک جداگانہ مثنوی بھی مخصوص کی ہے۔ جس کا نام اسرارِ خودی ہے۔

فلسفۂ خودی کا ماحصل یہ ہے کہ:

(۱) خودی جوہرِ کائنات ہے۔ نظامِ کائنات کی بنیاد اور اس کا سرِ حیات ہے۔

(ب) حیاتِ خودی مقاصد اور امنگوں کی تخلیق پر مبنی ہے۔

(ج) عشق آرزو، سعیِ پیہم، بیباک عمل اور خطر پسندی سے خودی کو فروغ میسر آتا ہے۔

(د) جہادِ مسلسل اور جہدِ پیہم سے زندگی قوت و نمو اور فروغ پاتی ہے۔ اور جھجک، تردد، آسائش طلبی اور پستیوں پر قناعت سے شعلۂ حیات افسردہ ہو جاتا ہے۔

انسان کے لئے یہ ضروری ہے کہ خود اعتماد ہو، فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ اور اپنے قول و فعل میں خودی کو نمایاں کرے۔ تقلید، غیر پر اعتماد اور دوسروں کے سامنے دستِ طلب بڑھانے سے اجتناب کرے، اور ان قوتوں سے غافل نہ ہو۔ جو اس کی ذات میں ودیعت کی گئی ہیں۔

ان چیزوں سے خودی محکم ہوتی ہے، اور خودی کا استحکام ہی اس زندگی کا مقصد ہے شیلغ مزق اشیا کی حسی اور معنوی قوتوں کا دلدادہ ہے اور اس لئے وہ جرمن فلسفی نیٹشے کو پسند کرتا ہے۔ لیکن اس پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ نیٹشے صرف جسم کا ادراک کر سکا اور عرفانِ روح سے بے بہرہ رہا۔ اس کی دسترس محض علم و عقل تک ہے۔ قلب و عشق تک اس کو رسائی حاصل نہیں ہو سکی۔ اور اس لئے اقبال کہتا ہے کہ وہ نکتۂ توحید کا اہل نہ تھا ؎

حریفِ نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم نگاہ چاہیئے اسرارِ لا الٰہ کے لئے

اقبال کے نزدیک قوت و قدرت عناصرِ جمال ہیں۔ جلال کے بغیر کمالِ جمال ناممکن ہے۔ جلال اور جمال کے عنوان سے ایک قطعہ میں وہ کہتا ہے ؎

میری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک
نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک

بلکہ وہ کہتا ہے کہ افسردہ و مضمحل شعلے عذاب کے لئے بھی موزوں نہیں ہیں ؎

مجھے سزا کے لئے بھی نہیں قبول وہ آگ کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

اقبال کے نزدیک حسن و قبح اور خیر و شر خودی کی پستی و بلندی کے تابع ہیں ؎

نمود جس کی فرازِ خودی سے ہو وہ جمیل جو ہو نشیب میں پیدا وہ قبیح و نامحبوب

پختہ اور محکم خودی کی انفرادیت جماعت میں منسلک ہونے کے باوجود فنا نہیں ہوتی۔ "رموزِ بیخودی" میں اقبال نے واضح کیا ہے کہ ایک فرد قوی کس طرح جماعت سے وابستہ رہ کر استفادہ کرتا ہے اور اس وابستگی کے باوجود اس کا انفرادی تشخص کس طرح برقرار رہتا ہے۔ "ضربِ کلیم" میں وہ "مردِ بزرگ" کے عنوان سے ایک قطعہ میں کہتا ہے ؎

شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

انسان کائنات کی عظیم ترین حقیقت ہے اور کائنات کی ہر چیز اس کے تابع فرمان ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے:

ولقد کرمنا بنی اٰدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقناھم من الطیبات وفضلناھم علٰی کثیر ممن خلقنا تفضیلا۔ وسخر لکم ما فی الارض جمیعا۔ وسخر لکم الانھار وسخر لکم الشمس والقمر دائبین وسخر لکم اللیل والنھار واٰتاکم من کل ما سالتموہ وان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا

انسان مجبور و بے اختیار نہیں بلکہ آزاد و خود مختار ہے۔ اس کا عزم نشانِ تقدیر ہے یا آثار قضا پر جاری ہے

ایک مومن آزاد اس دنیا میں بلکہ دنیا و آخرت میں صلح و فساد اور بقا و فنا کا معیار ہے ؎

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

نباتات و جمادات قانونِ طبیعت کے محکوم ہیں لیکن مردِ مومن اپنے پروردگار کے احکام کی اطاعت اور فرمانبرداری کے سوا کسی چیز کا پابند نہیں ؎

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

تہذیبِ جدید

اقبال کہتا ہے۔ یورپین تہذیب محض مادی ہے۔ جس میں نہ قلب ہے نہ روح اقبال نے اس تہذیب پر شدید نکتہ چینی کی ہے۔ وہ اس مادی تہذیب کے فلاسفہ کا تذکرہ کرتا ہے لیکن ان کے بیشتر نظریات کو رد کر دیتا ہے۔ وہ صرف اسلام اور اس کی تہذیب میں بشریت کی فلاح دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک اسلامی تہذیب ہی نوعِ انسانی کے باہمی ربط و ائتلاف کا ذریعہ بن سکتی ہے اور اس کو برادرانہ انس و تعاون کے ساتھ شاہراہِ حق پر مجتمع کر سکتی ہے

اقبال کا فلسفہ "ضربِ کلیم" میں

خودی اور عناصرِ خودی کے متعلق اقبال کا فلسفہ، اسلامی اور یورپی تہذیب کے متعلق اس کے نظریات اور ان کے علاوہ اسکے دوسرے حکیمانہ افکار و آراء یہاں تک کہ ادب اور فنونِ لطیفہ کے متعلق اس کے زاویۂ نگاہ "ضربِ کلیم" کی تقریباً ہر فصل میں جھلکتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک وہ موسیقی حرام ہے جس سے روح میں ضعف و اضمحلال پیدا ہوتا ہو ؎

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

مصور کے لئے ضروری ہے کہ زندگی کی عکاسی کرے اور فطرت کی محاکات کرتے ہوئے آثارِ طبیعت میں اپنا نقشِ خودی نمایاں کرے ؎

فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

فقر

"ضربِ کلیم" اور دوسرے دیوانوں میں بہت سے مواقع پر اقبال نے فقر پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا ہے۔ وہ فقر کو کلیدِ خیر و سعادت اور سربلندی کا وسیلہ قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک فقر خطرات میں بیباکانہ کود پڑنے کا محرک ہے ؎

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی

اس کا دعویٰ ہے ؎

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم عشق ہو جس کا جسور فقر ہو جس کا غیور

وہ کہتا ہے ؎

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے ضرب کاری ہے اگر سینہ میں ہے قلبِ سلیم
اس کی بڑھتی ہوئی بیباکی و بیتابی سے تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم

اور اس لئے اس کی تمنا ہے کہ:

اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار

اقبال کے کلام میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک فقر بے زری یا مال کی کمی کا نام نہیں ہے۔ نہ وہ احتیاجِ معاش اور احساسِ متاعِ دنیوی کی حاجت مندی کا نام ہے۔ جس کو انسان اپنے لئے باعثِ عزت سمجھتا ہے۔ بلکہ فقر سے اس کی مراد یہ ہے کہ نفس ہوس، ملک اور حرص و طمع کی قیود سے آزاد رہ کر عمل کی طرف اس طرح پیش قدمی کرتا ہے کہ کوئی کامیابی اس میں سرکشی اور کوئی محرومی اس میں پستی پیدا نہ کر سکے۔ بسا اوقات فقیر سیم و زر کے انبار کا بھی مالک ہو سکتا ہے اور بہت مرتبہ صاحبِ سطوت بادشاہ بھی لیکن مال و متاع کسی وقت بھی اس کی سطوت و جبروت کو درماندہ نہیں کر سکتے۔

فقر کا یہ مفہوم بعض صوفیا کی تشریح سے مختلف نہیں ہے
قشیری نے اپنے رسالے میں یحییٰ ابن معاذ کا قول نقل کیا ہے کہ:
"فقر کی حقیقت یہ ہے کہ خدا کے سوا ہر چیز سے بے نیازی ہو"

شبلی کا بیان ہے کہ:

"فقر کی ادنیٰ ترین علامت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمام دنیا کا مالک ہو کر اس کو ایک ہی دن میں خرچ کر ڈالے اور پھر اس کے قلب میں یہ خطرہ گذر جائے کہ اس میں سے صرف ایک دن کی روزی روک لیتا تو اس کا فقر صادق نہیں ہے"

رسالۂ قشیریہ میں ایک دوسرے موقع پر کہا گیا ہے:

"صحتِ فقر کا معیار یہ ہے کہ اس ذات کے سوا جس کی طرف فقیر کی احتیاج ہو

کسی چیز کے حصول سے استغنیٰ میسّر نہ آئے "۔

سہروردی نے عوارف المعارف میں کتانی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ:

"جب فقر الی اللہ درست ہو جاتا ہے تو غنا (غنی باللہ) میسّر آتا ہے، یہ دونوں احوال ہیں اور ایک کی دوسرے کے بغیر تکمیل نہیں ہوتی "۔

ان بیانات سے واضح ہے کہ فقر ملک و مال کے نقدان کا نام نہیں ہے۔ اس کی حقیقت صرف یہ ہے کہ انسان ان چیزوں سے وابستہ نہ ہو جن کو وہ پالیتا ہے یا کھو دیتا ہے یعنی یہ کہ دنیا اس کے دل میں بسی ہوئی نہ ہو خواہ اس کے ہاتھوں میں کھیلتی ہو۔

اقبال کہتا ہے:

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شانِ بے نیازی
یہ فقر غیور جس نے پایا! — بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری — اللہ سے مانگ یہ فقیری

پیش لفظ

جس کتاب کا ترجمہ آپ کے پیشِ نظر ہے۔ علامہ اقبال نے اس کا نام 'ضرب کلیم' رکھا، اور خود ہی اس کی تشریح ان الفاظ سے کر دی: "اعلانِ جنگ عصرِ حاضر کے خلاف"

میرے نزدیک یہ الفاظ علامہ اقبال کی صرف ایک کتاب 'ضرب کلیم' ہی کے شارح نہیں بلکہ ان کے پورے کے پورے پیغام کے ایک عظیم حصّہ کے مفسّر ہیں۔ اگر حضرت علامہ کے پورے پیغام کا تجزیہ کیا جائے۔ تو وہ دو اہم حصّوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک حصّہ نفیرِ انقلاب ہے۔ اس "غیر منزل من اللہ" اسلام کے خلاف جسے عجمی سازش نے نہایت سادگی اور پرکاری سے وضع کیا اور دامِ ہمرنگِ زمین کی صورت میں عین اسلام بنا کر اس امّت پر مسلّط کیا۔ جو ان غیر قرآنی تصورات کو نکالنے کے لئے مبعوث ہوئی تھی عجم کی یہ سازش درحقیقت انتقام تھی۔ یہود و نصاریٰ و مجوس کی ان شکستوں کا جو انھیں میدانِ جنگ میں مسلمانوں کی تیغِ حق کے مقابلے میں اٹھانی پڑیں۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ اس ملّتِ مجاہدین کی قوت و سطوت کا راز قرآن کی حیات بخش تعلیم میں ہے۔ لہٰذا انھوں نے ایسی چال چلی کہ مسلمانوں کو قرآن سے یکسر بیگانہ بنا کر غیر قرآنی اسلام کے فریب میں الجھا دیا۔ اور یہ کچھ اس کامیاب طریق سے کیا کہ سادہ لوح مسلم اس سرابِ رنگ و بو کو ہیچ پوچ کا گلستان سمجھنے لگ گیا۔ یونان کا خواب آور فلسفہ، حشیشیں مجوس کی غلامانہ نسل پرستی، یہود کی قشری شریعت رسومات، رہبانِ نصاریٰ کی مرگ آفریں خانقاہیت، ایک ایک کر کے اسلام کے لاینفک اجزا بن گئے۔ اور اس طرح یہ ملّت جو کبھی ذوقِ عمل سے شعلۂ جوّالہ تھی، کوتاہیِ عمل سے راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ اقبال کے پیغام کا ایک حصّہ اسی "غیر منزل من اللہ" اسلام کے لئے پیامِ مرگ، اور قرآنی اسلام کے احیا کے لئے نشیدِ حیات تھا۔

علامہ کے پیغام کا دوسرا حصّہ اس فتنہ کے خلاف احتجاجِ مسلسل تھا۔ جو تہذیبِ مغرب کے رنگ میں طوفان در طوفان امڈے چلا آ رہا تھا۔ اور جس کی تموّج انگیز طغیانیاں ملّتِ اسلامیہ کی شاخِ تر کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لے جا رہی تھیں۔ 'ضربِ کلیم' اس تہذیبِ عصرِ حاضر کے جنود و حشم کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔

سوال یہ ہے کہ تہذیبِ حاضر کہتے کسے ہیں اور اقبال نے اس کی اس قدر مخالفت کیوں کی؟

اس سوال کا جواب سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک پہلے یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ اسلامی تہذیب کیا ہے۔

جس شخص کے سامنے قرآن کے اوراق کھلے ہیں، اس پر یہ حقیقت روشن ہے کہ اسلام ایک ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی ہے جسے الدّین کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن نے انسانی زندگی کے لئے ایک نصب العین مقرر کر دیا ہے اور اس کے ساتھ وہ حدود متعین کر دی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے انسان اپنے اختیارات کا استعمال کر سکتا ہے۔ یہ نصب العین اور حدود دونوں غیر متبدل ہیں۔ انہی کو ابدی صداقتیں یا مستقل اقدارِ زندگی کہا جاتا ہے۔

قرآن کی رو سے اگرچہ حیات کی نمود مختلف پیکروں میں ہوتی ہے۔ حیات کا سرچشمہ ایک ہی اور یہی سرچشمہ ان ابدی صداقتوں کی اصل ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ سرچشمہ حیات اور ابدی صداقتوں کے سرچشمہ کی وحدت کے عقیدے سے فطری طور پر یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ:

(ا) ہر انسان من حیث الانسان زندگی کی ممکنات اپنی ذات میں مضمر رکھتا ہے جن کی نشوونما اور نمودِ زندگی کا مقصود ہے ان جواہرِ مضمر کی پختگی اور تابندگی سے انسان میں شانِ انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کا تحفظ، بقا اور تسلسل (بعد از ممات) انسانی جدّوجہد کا ماحصل ہے۔

(ب) تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں جو جغرافیائی، نسلی، لسانی اور قومی حدود سے متاثر نہیں ہوتی۔

(ج) تمام نوعِ انسانی کی فلاح کا راز ایک ہی ضابطے کے مطابق زندگی بسر کرنے میں ہے جو وحی کے ذریعے مل سکتا ہے اور جو آج اس آسمان کے نیچے قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔

ان محکم اصولوں کی بنیاد پر اسلام ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں نوعِ انسانی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی شرفِ انسانیت کے سدرۃ المنتہیٰ تک جا پہنچے۔ اس معاشرے کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

(۱) اس میں افرادِ معاشرہ اپنے اندر ان صفاتِ خداوندی کو منعکس کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ جنھیں قرآن اسماء الحسنیٰ سے تعبیر کرتا ہے اور جو کائنات میں مستقل اقدار کا سرچشمہ ہیں۔

(۲) ان افراد میں ایسا ضبط پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ ان صفات میں ٹھیک ٹھیک توازن قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اسماء کے لئے حسنیٰ کی شرط ضروری ہے، اور حسن نام ہے تناسب کے اعتدال کا۔

(۳) ان افراد کی نگاہوں میں ایسی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے وہ صحیح صحیح فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فلاں قسم کے خارجی حادثہ کی صورت میں فلاں قسم کی صفتِ خداوندی کا ظہور ہونا چاہیئے

(۴) ان افراد پر مشتمل جماعت میں اشیائے فطرت کی تسخیر کی قوت اور ان کے ماحصل کو فلاحِ انسانیت کے لئے صرف کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۵) وحدتِ خالق، وحدتِ انسانیت اور وحدت و استقلالِ ملّت کے محکم تصوّر سے انسان اور کائنات، انسان اور انسان، اور خود انسان کے اپنی ذات کے تضادات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے انسانی معاشرے کی ناہمواریاں مٹتی چلی جاتی ہیں۔

(۶) اس جماعت کا ہر فرد اپنے آپ کو خدا کی صفتِ ربّ العالمین کا مظہر سمجھتے ہوئے بلا مزد و معاوضہ انسانیت کی ربوبیت کا کفیل بن جاتا ہے۔ اس طرح تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بھی از خود پوری ہوتی جاتی ہیں۔ اور ان کی فطری صلاحیتوں کے کامل نشوونما کے وسائل و اسباب یکساں طور پر میسر ہوتے جاتے ہیں۔ اور اس طرح زندگی کی جوئے رواں ہنستی کھیلتی رقص کرتی شاداں و فرحاں اقطار السموٰت والارض سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

یہ ہے مختصر سے الفاظ میں قرآنی تہذیب کا ماحصل۔ اس کے برعکس تہذیبِ عصرِ حاضر اس تصویر کی یکسر نقیض ہے۔ اس تہذیب کی اساس یہ فلسفہ ہے کہ مادی عناصر کے محض اتفاقیہ طور پر یکجا ہو جانے سے حیات وجود میں آ گئی اور ان عناصر کے منتشر ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جائیگا۔ دنیا یہی مادی عناصر کی دنیا ہے جس میں ہر شے تغیر پذیر ہے۔ لہٰذا دنیا میں نہ کوئی مستقل اقدار ہیں نہ قانونِ مکافاتِ عمل۔ خیر وہ ہے جس سے کسی فرد یا افراد کے گروہ (قوم) کو ذاتی مفاد حاصل ہو جائے (خواہ اس سے دوسرے افراد یا دوسری اقوام کی رگِ حیات ہی کیوں نہ کٹ جائے) اور شر وہ ہے جس سے کسی فرد یا قوم کا ذاتی نقصان ہو۔ ہر فرد یا قوم کا نصب العینِ حیات منفعتِ خویش کا حصول ہے۔ اور علم و عقل کا کام یہ ہے کہ وہ اس منفعت کے حصول کے لئے اسباب و ذرائع اور حیل و مکائد فراہم کرے۔ اس فلسفۂ حیات (یا تہذیبِ عصرِ حاضر) کا نتیجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر خود اہلِ مغرب کی تحقیق کے مطابق وہاں کی آبادی کا ہر چھٹا فرد ایسا ہے جسے عمر کا کچھ حصّہ پاگل خانہ میں گزارنا ہوگا اور اجتماعی طور پر یہ عالم ہے کہ دنیا کی مختلف قومیں یا تو باہمی کشت و خون میں مصروفِ پیکار رہتی ہیں۔ یا اس کشت و خون کی تیاری میں مشغول۔

اقبال نے اقوامِ مغرب کے فلسفۂ حیات اور نظریۂ سیاست و عمرانیت کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا جس سے اس پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ یہ فلسفۂ حیات اور منہاجِ زندگی دنیا میں جہنم پیدا کر دینے کا موجب ہے۔ دوسری طرف قرآنی بصیرت نے اس پر حقائقِ زندگی کو اس طرح واشگاف کر دیا کہ وہ بادلوں میں چھپی ہوئی بجلیوں اور ہواؤں میں مستور طوفانوں کو بے حجاب اپنے سامنے دیکھ لیتا تھا۔ یہی تھی وہ قرآنی بصیرت جس کی بنا پر اس نے ۱۹۰۷ء میں اقوامِ مغرب کو للکار کر کہہ دیا تھا۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی — جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اس وقت سے لیکر اپنی زندگی کے آخری لمحات تک، اقبال اقوامِ مغرب کو بالعموم اور ملّتِ اسلامیہ کو بالخصوص اس اہرمنی تہذیب کے نتائج و عواقب سے آگاہ کرتا رہا۔ اس مجموعۂ انذار و تنذیر کا نام ہے 'ضربِ کلیم' جس سے اقبال بتکدۂ عصرِ حاضر کے تمام بتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے لیکن وہ اپنے عصائے کلیمی سے صرف فرعونیت ہامانیت اور قارونیت ہی کے نگاہ فریب سحر کو نہیں توڑتا۔ بلکہ وہ اس کے بعد اپنی قوم کو تنزیلِ قرآنی کی روشنی میں نخلستانِ دشت کی ان محفوظ اور بابرکت وادیوں میں لے جاتا ہے۔ جہاں زمین سے فوز و فلاح کے

چشمے اور آسمان سے رشد و سعادت کے منّ و سلوٰی اترتے ہیں۔

پیامِ اقبال کی خوش بختی ہے کہ وہ رفیقِ محترم صاحب السعادت عبدالوہاب عزام بےؒ کی مُخلصانہ کاوشوں سے شیریں کے تصدق میں گئے اُردو سے نکل کر بحیرۂ عرب میں بادبان کشاں ہوتا ہے اور اس طرح اپنی اس افادیت کو جو اس وقت شرمندۂ ساحل تھی بیکراں بنا رہا ہے، اور خوش بختی ہے خود عربی بولنے والی ملّتِ اسلامیہ کی جو اس پیامِ حیات بخش سے جو معنوی لحاظ سے ان سے اس قدر قریب ہونے کے باوجود لفظی حجاب سے اتنا دُور تھا، شرفِ تعارف حاصل کر رہی ہے۔

خدا کرے یہ پیامِ انقلاب سرزمینِ عرب کے لئے پھر تخمِ صالح بن جائے جس سے ایک مرتبہ پہلے وہ شجرِ بلند بالا پیدا ہو چکا ہے جس کی رفعتوں کے متعلق اصلہا ثابتۃ وفرعہا فی السّماء کہا گیا تھا۔ اور جس کی ہمہ گیر پہنائیوں کو لا شرقیۃ ولا غربیۃ سے تعبیر کیا گیا تھا۔

اس شجرِ طیب و مبارک کی روئیدگی و بارآوری صرف قرآنی ماحول میں ممکن ہے، اور یہی پیامِ اقبال کا مقصود و منطوق ہے ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

یہاں تک تو ضربِ کلیم کے متعلق ہوا۔ اقبال کے عمومی مطالعہ کے ضمن میں ایک چیز ایسی ہے جسے مدِّ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اقبال کی شاعری میں عربی اور فارسی لغت کے اکثر الفاظ ایسے ہیں جنہیں وہ ان کے لغوی معنوں میں استعمال نہیں کرتا۔ بلکہ وہ کلامِ اقبال کی خاص اصطلاحات ہیں۔ جب تک ان الفاظ کے اصطلاحی معنے سمجھ میں نہ آئیں اقبال کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آسکتا۔ مثلاً علم و عشق، عقل و دل، ذکر و فکر، خبر و نظر، سوز و ساز، یا درویش، قلندر، مردِ حر وغیرہ الفاظ اسی قبیل کے ہیں۔ یہ تمام اصطلاحات اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں لیکن وہ اصطلاح جو فکرِ اقبال میں محور کا حکم رکھتی ہے اور جس کے گرد اس کا سارا کلام گردش کرتا ہے 'خودی' ہے۔ اقبال سے پہلے یہ لفظ ہمارے ہاں غرور و تکبر کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ لیکن اقبال نے اسے بالکل جداگانہ معنے پہنا دیئے اور یہ مفہوم اب اس درجہ رائج ہو چکا ہے کہ اس لفظ کے قدیمی معنی بالکل نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔

"خودی سے اقبال کا مفہوم کیا ہے؟" اس سوال کا جواب مختصر الفاظ میں دینا آسان نہیں۔ اس لئے کہ اقبال کا فلسفہ درحقیقت فلسفۂ خودی ہے۔ اور جب تک اقبال کا پورا فلسفہ سامنے نہ آجائے اس اصطلاح کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس تفصیل و اطناب کا یہ موقع نہیں لیکن چونکہ 'ضربِ کلیم' میں بھی یہ لفظ بار بار سامنے آئیگا۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قلیل ترین الفاظ میں اس اصطلاح کا طائرانہ سا تعارف کرا دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ "کیا انسان کی انفرادیت، شخصیت، یا انا کوئی مستقل حقیقت ہے یا محض فریبِ تخیل؟" دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے مفکرین نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش نہ کی ہو۔ افلاطون اور اس کی اتباع میں حکمائے ایران اور ہند اس نتیجہ پر پہنچے کہ کائنات میں صرف حیاتِ کلی کا وجود ہے۔ اس لئے انسانی ذات (انا، یا شخصیت) محض فریب ہے۔ یہ فریب عمل کے زور پر قائم رہتا ہے اور عمل کی بنیاد آرزو ہے۔ لہٰذا اس فریب سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ انسان ترکِ آرزو سے ترکِ عمل کرے اور اس طرح انسانی ذات کا حباب ٹوٹ کر حیاتِ کلی کے بحر میں گم ہو جائے۔ اس (فنائے ذات) کا نام نجات ہے اور یہی زندگی کا مقصود ہے۔ یہی وہ فلسفۂ حیات تھا۔ جو ہمارے ہاں نظریۂ وحدت الوجود کے نام سے رائج ہوا اور جس نے مسلمانوں جیسی ہمہ تن عمل قوم کو خاک کے آغوش میں سلا دیا۔

اقبال نے اس فلسفۂ حیات کے خلاف مسلسل احتجاج کیا۔ اور اس کے برعکس فلسفۂ خودی پیش کیا۔ اس فلسفہ کا ملخص یہ ہے کہ حیات عالمگیر یا کلی نہیں بلکہ انفرادی ہے۔ حتیٰ کہ خدا بھی ایک فرد ہے' اگرچہ وہ اپنی انفرادیت میں یگانہ اور نادر ہے۔ اس انفرادی زندگی کی اعلیٰ ترین صورت کا نام خودی ہے جس سے انسانیت کی شخصیت یا انفرادیت متشکل ہوتی ہے۔ لہٰذا انسانی زندگی کا مقصود سلبِ ذات نہیں اثباتِ خودی ہے۔ اقبال کے نزدیک 'جوں جوں انسان' اس فردِ کامل و نادر کی مانند ہوتا جاتا ہے (جسے انائے مطلق یا خدا کہتے ہیں) وہ خود بھی منفرد و نادر ہو جاتا ہے۔ اس کا نام استحکامِ خودی ہے۔ "خدا کی مانند" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اندر صفاتِ خداوندی کو منعکس کرے، اور اس طرح اس انائے مطلق کو اپنے اندر جذب کرتا جائے۔ خودی کے ضعف اور استحکام کے پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ انسان اپنی راہ میں آنے والے موانعات پر کس حد تک غالب آتا ہے۔ زندگی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ مادہ شر ہے اور اس لئے قابلِ نفرت۔ مادہ شر نہیں بلکہ یہ زندگی کی خوابیدہ قوتوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہے۔ جب انسانی خودی 'موانعات' پر غلبہ حاصل کرنے سے پختہ ہو جاتی ہے تو پھر موت کا جھٹکا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس طرح انسانی زندگی دوام سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ بنا بریں ہر وہ عمل جس سے خودی میں استحکام پیدا ہو خیر ہے۔ اور ہر وہ کام جس سے خودی کمزور ہو جائے، شر ہے۔

اقبال کے نزدیک ارتقائے خودی کا پہلا مرحلہ تخلیقِ مقاصد یا تولیدِ آرزو ہے۔ آرزو عینِ حیات اور اصل قوت ہے۔ کیونکہ یہی عمل کی محرک ہوتی ہے۔

تخلیقِ مقاصد کے بعد ——— دوسرا مرحلہ حصولِ مقاصد کے لئے جہدِ مسلسل ہے۔ حصولِ مقصد کے لئے اسی تپش و خلش کا نام اقبال کی اصطلاح میں عشق ہے۔ اس جدوجہد کی کامیابی کے لئے تین شرائط ناگزیر ہیں۔ اول: اطاعت' اطاعت سے مراد ہے قوانینِ خداوندی (قرآن) کی کامل اتباع جس کے لئے قرآنی معاشرہ کی تشکیل ضروری ہے۔ اس اطاعت سے انسان کے اندر ضبطِ نفس پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ دوسری شرط ہے۔ ضبطِ نفس سے مراد خواہشات کا دبانا نہیں بلکہ امالہ یا کفایت' (زائد قوتوں کا رخ دوسری طرف بدل دینے) سے ان میں توازن پیدا کرنا ہے۔ اس توازن کی اکمل ترین شکل ذاتِ خداوندی ہے۔ جس میں متضاد صفات کا باہمی توازن اپنی انتہا تک پہنچا ہوا ہے۔

اس تطہیرِ فکر و عمل اور تہذیبِ نفس سے انسان اس مقام تک جا پہونچتا ہے جسے اقبال نیابتِ الٰہیہ سے تعبیر کرتا ہے اور یہ تیسری شرط ہے۔ نیابتِ خداوندی سے اقبال کا مفہوم وہ قوتِ مجریہ ہے جو دنیا میں قوانینِ خداوندی (ضابطۂ قرآنی) کی تنفیذ و ترویج کا موجب بنتی ہے۔ (نیابتِ الٰہیہ سے مراد نہیں کہ انسان خدا کا قائم مقام یا جانشین بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ جانشینی صرف اس کی ہوتی ہے جو خود موجود نہ ہو) یہ مقام مومن ہے اور یہی مقام اقبال کے نزدیک استحکامِ خودی کا آخری نقطہ ہے۔ اس مقام پر پہنچکر انسان ساری دنیا پر غالب آجاتا ہے۔ دنیا اس پر غالب نہیں ہوتی۔ اس کیفیت کا نام اقبال کی اصطلاح میں فقر، درویشی یا قلندری ہے یعنی سب کچھ مسخر کر لینے کے بعد وہ استغنا جو اللہ کی صفتِ صمدیت اور "غنی" عن العالمین کا مظہر ہو۔ ان افراد پر مشتمل جماعت کا نام امتِ مسلمہ ہے اور اسی جماعت کی نشاۃِ ثانیہ، پیامِ اقبال کا منتہیٰ و مقصود۔ وہ امت جسکے متعلق کہا گیا ہے کہ ؎

میانِ امتاں والا مقام است کہ آں امت دو گیتی را امام است
نیاساید زکارِ آفرینش کہ خواب و خستگی بروئے حرام است

اور

بیا قاں عندلیبے خوش صفیرے بما غاں جرّہ بازے زود گیرے
امیراو بسلطانی فقیرے فقیرے او بہ درویشی امیرے

لتکونوا شہداء علی النّاس، ویکون الرسول علیکم شہیدًا۔

(پرویز)

مجلسِ قلندراں (صفحہ ... سے آگے)

اتفاق سے اس دن 'پس چہ باید کرد' کا آخری باب زیرِ مطالعہ تھا، جس کا عنوان ہے " در حضور رسالت مآبؐ"۔ ایک طرف اقبال حضورِ رسالت مآبؐ میں۔ آپ اندازہ لگایئے کہ اس کی کیفیت کیا ہو سکتی ہے؟ دوسری طرف بشیخ قلندراں اور سفیرِ اقبال دونوں کی حالت یہ ہے کہ حضورؐ ختمی مرتبتؐ کی محبت میں ہمہ تن سوز۔ انہی کے سوز سے باقی قلندروں کے سینے بھی حرارتوں سے معمور۔ پوچھئے نہیں کہ مجلس پر کس قدر والہانہ کیفیت طاری تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ آسمان سے نور کی بارش ہو رہی ہے۔ اس کا اہتمام کر لیا گیا تھا کہ جہاں اس آخری محفلِ سوز و ساز کے نقشے کو کیمرے کی پلیٹ میں محفوظ کر لیا جائے، وہاں اس کے الفاظ کو بھی ریکارڈ میں ضبط کر لیا جائے۔ یہ تصویر آپ کو ٹائیٹل کے صفحہ پر نظر آئے گی۔ باقی رہا ریکارڈ، سو جس وقت اس محفل کی یاد سے قلندروں کے سینے میں ہوک سی اٹھتی ہے۔ وہ اسے اپنے لئے فردوسِ گوش بنا لیتے ہیں۔

یہ آخری محفل اس کیف بار و حیات آور وعدہ پر ختم ہوئی کہ اگلی کتاب (ارمغانِ حجاز) خود حریمِ کعبہ اور صحنِ مسجدِ نبویؐ میں بیٹھ کر پڑھی جائے گی۔ یہی وعدہ ہے جو اب ان قلندروں کی تمناؤں کا حسین مرکز بن رہا ہے۔ اور جس سے آنے والے دن ان کی نگاہوں میں اس قدر تابناک ہو رہے ہیں۔

تلمیحاتِ اقبال

مفکرینِ مغرب

(محترم ممتاز حسن صاحب)

اقبال اور مفکرینِ مغرب کا باہمی تعلق اس قدر گہرا ہے کہ کسی اور ایشیائی شاعر یا فلسفی کو نصیب نہیں ہوا اس تعلق کے دو پہلو ہیں۔ ایک طرف تو اقبال یورپ کے ادب، فلسفہ اور تہذیب و تمدن کے سب سے بڑے طالب علم ہیں۔ اور دوسری طرف اس فلسفے اور تہذیب کے سب سے بڑے ناقد بھی وہی ہیں۔ اور اقوامِ مشرق کو ان کا یہ مشورہ کہ:

بایداِیں اقوام را تنقیدِ غرب

ان کے پیغام کا نہایت اہم جزو ہے۔ تہذیبِ مغرب کے متعلق ان کے تاثرات ان کے سارے کلام میں پھیلے ہوئے ہیں ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی — یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے — جسے کھرا تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال — مرد بیکار، زن تہی آغوش

اقبال کی تصنیفات میں مفکرینِ مغرب کے افکار و اقوال عام طور پر محض تلمیحات یا اشارات کے طور پر وارد نہیں ہوتے بلکہ وہ اقبال کے ذہنی اور رُوحانی پس منظر کا ایک مستقل حصّہ ہیں، اور اقبال کے کلام کا بیشتر حصّہ انہی افکار سے دست و گریباں ہے۔ انھوں نے مفکرینِ مغرب سے بہت کچھ سیکھا ہے' اور جو سیکھا ہے اس کی خوب جانچ پرکھ کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں مغربی ادب اور فلسفے کا تذکرہ عموماً تلمیحاتی نہیں ہے' بلکہ ایک بنیادی عنصر ہے۔ اقبال کے ذہنی اور روحانی ارتقا میں مشرق اور مغرب کا جو حصّہ ہے اُسے خود اقبال نے واضح کیا ہے ؎

خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ — سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحبِ نظراں

چونکہ اقبال کے پیغام کا ماحصل عقل و خرد کی پرستش نہیں، بلکہ عشق و ایمان کی پیروی ہے' اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال پر مغرب کا بھی وہی احسان ہے جو مشرق کا ہے مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اگر اقبال کو مغربی مفکرین اور مغربی تہذیب و تمدن کے مطالعہ کا موقعہ نہ ملتا۔ تو ان کے فلسفے اور تعلیم کا رنگ وہ نہ ہوتا جو ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس صورت میں اقبال' اقبال ہی نہ ہوتے۔

اقبال کے ذہنی ارتقا پر سب سے پہلے جو یورپین اثر پڑا، وہ سر طامس آرنلڈ مرحوم کا تھا۔ آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر تھے۔ اور اگرچہ خود کسی خاص طرزِ فکر کے حامل نہیں تھے، مگر علم اور علمی تحقیق کے میدان میں بلند درجہ رکھتے تھے' ان کی صحبت میں اقبال کے علمی ذوق کی خوب پرورش ہوئی۔ اور مغربی مفکرین سے اقبال کے تعلق کی بنیاد یہی تھی۔ اقبال نے آرنلڈ کے ولایت واپس چلے جانے پر "نالۂ فراق" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے۔ اس سے استاد اور شاگرد کے باہمی تعلقات کے خلوص کا اندازہ ہو سکتا ہے ؎

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں — آہ مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمیں

ابرِ رحمت دامن از گلزارِ من برچید و رفت — اندکے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

اقبال ۱۹۰۵ء میں ولایت تشریف لے گئے۔ اور انگلستان اور جرمنی میں تین سال کے قیام کے بعد واپس آئے اس عرصہ میں انھوں نے یورپ کے ادب، فلسفے اور تہذیب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، اور اس مطالعے نے ان میں ایک انقلابی کیفیت پیدا کر دی۔ مغربی تہذیب و تمدن نے اپنے آپ کو ان کے سامنے بے نقاب کیا اور انھوں نے دیکھا کہ اس تہذیب کا ظاہری حسن و جمال مشرقی تہذیب سے زیادہ نہ تھا۔ اس انکشاف کے بعد ان کے دل میں اسلامی اقدار کے علاوہ کسی اور قدر کے لئے جگہ نہ رہی مگر وہ اہلِ یورپ کے علمی تجسس اور ذوقِ تحقیق کے ہمیشہ معترف رہے۔ اور یورپ کے ادب و فلسفے کا مطالعہ انہوں نے آخر وقت تک جاری رکھا۔

اقبال کے کلام میں پورے کے پورے مغربی فلسفے اور مختلف یورپین زبانوں کے بہترین ادب کے اثرات ملتے ہیں۔ مفکرین میں کانٹ، ہیگل، شوپن ہار، نیٹشے، کارل مارکس، برگساں، میک ٹیگرٹ، الگزینڈر، برکلے، آئن سٹائن، اور شعرا میں بائرن، گوئٹے، ٹینیسن، پیٹوفی، ہائینے وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اقبال کے تصورِ خودی کی تشکیل میں شاید میک ٹیگرٹ کا سب سے زیادہ حصّہ ہے۔ میک ٹیگرٹ کیمبرج یونیورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر اور اقبال کے استاد تھے۔ ان کے فلسفے میں 'انا' یا "EGO" کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہے اور انھوں نے اس بات پر خاص طور پر زور دیا ہے کہ ایک 'انا' دوسرے 'انا' سے قطعاً جدا اور متمیز ہے اور دو 'انا' کا ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا ناممکن ہے۔ یہی تخیل اقبال کی خودی میں بھی موجود ہے۔ اگرچہ اقبال نے اس بنیاد پر جو عمارت قائم کی ہے۔ اس کا میک ٹیگرٹ کے فلسفے سے تعلق نہیں۔

دوسرا یورپین مفکر جس نے اقبال کے فلسفے پر اثر اندازی کی ہے نیٹشے ہے۔ نیٹشے او اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اگرچہ ابھی تک اس مضمون کا پورے طور سے احاطہ نہیں کیا گیا۔ نیٹشے دراصل فلسفی کم ہے اور شاعر زیادہ۔ اس کے اقوال میں ایک حرارت اور ایک والہانہ پن جو محض فلسفے کی چیز نہیں۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے فلسفیانہ خیالات کو کہیں بھی ایک منظم صورت میں پیش نہیں کیا۔ اقبال نے اپنے چھ لیکچروں میں اپنے فلسفے کو جس باقاعدہ طور سے ترتیب دیا ہے' وہ نیٹشے کے ہاں نایاب ہے۔ اقبال نیٹشے کے Uebermensch یا مافوق الانسان کے تخیل سے متاثر ہوئے ہیں۔ مگر صرف ایک حد تک نیٹشے کا Uebermensch محض قوت کا مظاہرہ ہے۔ اقبال کا نصب العین اس سے بلند ہے۔ وہ زور اور قوت کو مستقل اقدار کے تابع رکھتے ہیں۔ ان کا انسانِ کامل ایک دردمند دل پہلو میں رکھتا ہے۔ اور اس کی زندگی ایسے اصولوں کے پابند ہے جو وقتی مصالح اور زمانے کی مقتضیات سے تغیر پذیر نہیں ہوتے اور چونکہ مستقل اقدار وہی ذات متعین کر سکتی ہے جو خود تغیرات و حوادث سے ماورا ہو، اس لئے اقبال کا انسان خدا کا بندہ ہے اور اس کا مقام عبودیت ہے۔ نیٹشے خدا کا منکر ہے اور اسی وجہ سے اس کے مافوق البشر کے سامنے اپنے اور اپنی بے راہ روی کے علاوہ کوئی نصب العین نہیں۔ اقبال نے نیٹشے کے متعلق کہا ہے ؎

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں — تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

اقبال نے اپنے انسانِ کامل کا تصور اگر کہیں سے اخذ کیا ہے تو وہ قرآن سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا ماخذ کوئی ہے تو رومی ہے یا ایک حد تک عبدالکریم الجیلی کی تصنیف 'الانسان الکامل'۔ مگر نیٹشے کے اثرات بھی ان کے کلام میں جا بجا ملتے ہیں۔ 'اسرارِ خودی' میں حکایت الماس و زغال' نیٹشے کے اقوال زندشت سے ماخوذ ہے۔ اور راہبِ دیرینہ افلاطونِ حکیم " از گروہ گوسفندانِ قدیم" والا سارا حصّہ بھی نیٹشے کے خیالات کا پرتو ہے۔ نیٹشے کا خیال تھا کہ دنیا کی غلام قومیں اپنے آقاؤں کو زیر کرنے کے لئے عام طور پر یہ حربہ استعمال کیا کرتی ہیں۔ کہ اپنی غلامانہ تہذیب کے اقدار کو ان پر مسلط کریں۔ اور انھیں ان اقدار کی فوقیت سے مرعوب کریں۔ یہ بعینہٖ ایسا ہے کہ بھیڑیں شیر سے کہیں کہ گھاس کھانا تہذیب کی بلندی ہے' اور گوشت کھانا تہذیب کی پستی۔ اور شیر بھیڑوں کی یہ بات مان لے۔ اقبال نے اسی خیال کو 'اسرارِ خودی' میں نقل کیا ہے۔

اسرار کے آخری حصّہ میں جہاں اقبال نے اپنے مردِ کامل سے خطاب کر کے کہا ہے کہ ؎

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا — اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا

تو اس خطاب میں بھی نیٹشیانہ رنگ ہے۔ پیامِ مشرق میں "پند باز بچۂ خویش" میں بھی یہی رنگ ہے۔ یا 'بالِ جبریل' میں جہاں عقاب کی زبان سے فرماتے ہیں ؎

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر! — وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

تو وہاں بھی یہی انداز جھلکتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مقامات ہیں جہاں نیٹشے کے مطالعہ کے اثرات نظر آتے ہیں۔

ایک اور یورپین مفکر جو ایک حد تک اقبال پر اثر انداز ہوا ہے' برگساں ہے۔ جزئیات کو چھوڑ کر کہا جاتا ہے کہ اقبال کے ہاں عقل و عشق کے متقابل تصورات برگساں کے Reason اور ---- Intuition کا عکس ہیں۔ میری رائے میں یہ صحیح نہیں ہے' اقبال کا عشق برگساں کی Intuition کی نسبت رومی کے تصورِ عشق سے زیادہ قریب ہے اور شاید رومی کا کلام ہی اس کی بنیاد بھی ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اقبال نے برگساں کا مطالعہ گہرے طور سے کیا ہے' اور اپنے چھ لیکچروں میں برگساں کے مختلف خیالات کی تنقید کی ہے۔ انہیں برگساں کے فلسفۂ وقت میں خاص طور سے دلچسپی ہے اور وہ اس کا مقابلہ مختلف صوفیا کے خیالات و تجربات سے کرتے ہیں۔

گوئٹے اور اقبال کا تعلق بھی ایک مستقل مضمون ہے جس کا ابھی پورے طور سے مطالعہ نہیں کیا گیا۔ اقبال کا 'پیامِ مشرق' تمام تر گوئٹے کے دیوانِ مغرب کا جواب ہے۔ اس کتاب میں جو شاید فنی اعتبار سے اقبال کا شاہکار ہے، اقبال کا مغرب سے تعلق پورے طور سے واضح ہوتا ہے بلکہ اقبال نے قریب قریب ہر اس مغربی مفکر اور شاعر کا الگ الگ ذکر کیا ہے جس سے وہ متاثر ہوئے ہیں۔ گوئٹے کی ایک نظم نغمۂ

کا ترجمہ 'پیامِ مشرق' میں شامل ہو۔ جو یقیناً فارسی زبان کی بہترین نعتوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے اس کے علاوہ کہیں کہیں اور بھی گوئٹے کی جھلک نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر 'نوائے وقت' کی نظم میں اقبال وقت کی زبان میں فرماتے ہیں ؎

من کسوتِ انسانم ۔۔۔۔ پیراہنِ یزدانم

اس کے مقابلے میں گوئٹے کے 'فاوسٹ' میں اس شعر کو دیکھئے :

Thus at times humming loom my hand prepares
The garment of life that the Deity wears.

یہ بیرڈ ٹیلر کا ترجمہ ہے۔

گوئٹے کے کلام میں خودگری اور خودنگری کا تخیل موجود ہے۔

Be Self-possessed
That is the only art of life.

یہی تخیل اقبال میں بھی جھلکتا ہے۔ اگرچہ اس کا ماخذ گوئٹے کے کلام کو نہیں کہا جا سکتا۔ یہی حال اقبال کے تصورِ شیطان کا ہے۔ یہاں بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے جو صفات مثلاً عقل اپنے شیطان کے لئے منتخب کی ہیں۔ وہ گوئٹے کے 'فاوسٹ' کے شیطان یعنی *Mephistopheles* کی صفات سے مشابہ ہیں۔ لیکن وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال کے تخیل کی بنیاد گوئٹے پر ہے۔ کیونکہ صوفیانہ افکار میں اس قسم کے خیالات عام ہیں۔ جن میں عقل کو شیطان سے منسوب کیا گیا ہے اور یہ افکار اقبال کیلئے گوئٹے کی تصنیف کی بہ نسبت زیادہ قریب تھے۔

اقبال کے جاوید نامہ کے متعلق اکثر اوقات کہا جاتا ہے کہ اس کا پلاٹ دانتے کی (*Divine Comedy*) سے ماخوذ ہے۔ شاید دانتے کی تصنیف کا اثر اقبال پر ایک حد تک ہوا ہو مگر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ خود دانتے کا یہ تصور رسولِ کریم کے معراج کے واقعے اور ابنِ عربی کی فتوحاتِ مکیہ پر مبنی ہے بہرحال دانتے کا مقصد جنت اور جہنم کے تفصیلی مناظر پیش کرنا تھا۔ اس کی تصنیف میں تاریک گہرائیاں ہیں۔ بپکتے ہوئے شعلے، جھلستی ہوئی روحیں اور تڑپتے ہوئے قلوب نظر آتے ہیں۔ اور اس کا تصور ان محسوس پیکروں سے آگے نہیں بڑھتا۔ اس کے برعکس اقبال کے جاوید نامہ میں اس قسم کی تفصیلی نشاندہی نا پید ہیں۔ انھیں مختلف روحوں اور ان کے مختلف مقامات سے واسطہ ہے اور وہ ان روحوں سے جو مکالمہ کرتے ہیں۔ اس سے مقصود ہمارے لئے ایک مستقل پیغام ہے۔ 'نالۂ ابلیس' کے عنوان سے جاوید نامہ میں جو نظم ہے وہ اس قدر بلند اور دورِ حاضر کے انسان پر اس قدر کڑی گہری اور لطیف تنقید ہے کہ اس کی مثال دنیا کے ادب میں کہیں مشکل ہی سے ملے گی۔ کم از کم دانتے، گوئٹے وغیرہ کے ہاں تو کوئی مثال نہیں ہے۔

اقبال کے تاثراتِ مغرب کے متعلق ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس عنوان کے ضمن میں اقبال کا سارے کا سارا کلام زیرِ بحث آجاتا ہے۔ میں صرف چند اشارات کر سکا ہوں۔ اور ابھی بہت سے مضامین ایسے ہیں جن کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا جا سکا۔ مثلاً آئن شٹائن کے نظریۂ اضافیت اور نظریۂ وسعت کے متعلق اقبال کے خیالات۔ آسوالڈ سپنگلر کی تصنیف انحطاطِ مغرب میں اسلام کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس پر اقبال کی تنقید یا مارکس اور لینن کی اشتراکیت کے متعلق اقبال کے تاثرات وغیرہ۔ اس کے علاوہ اقبال کی شاعری میں جا بجا مغربی شعراء کے کلام کے ترجمے ہیں اور کہیں کہیں خفیف اشارے۔ مثلاً اقبال کی ایک پرانی نظم میں جس کا عنوان ہے "فراق" دو شعر ہیں ؎

کیفیت ہے میری جانِ ناشکیبا کی ۔۔۔ میری مثال ہے طفلِ صغیر تنہا کی
اندھیری رات میں کرتا ہے وہ سرود آغاز ۔۔۔ صدا کو اپنی سمجھتا ہے غیر کی آواز

ان اشعار میں ٹینیسن کے *In memoriam* کے مشہور اشعار کی خفیف سی جھلک ہے۔

So runs my dream, but what am I
An infant crying in the night,
An infant crying for the light
With no language but a cry.

اقبال کے کلام کے مغربی عناصر کے متعلق بہت سی غلط رائیں قائم کی گئی ہیں۔ اقبال کی نا بجائے خود مستقل اقدار کے تابع تھی۔ اور انھوں نے مشرق و مغرب سے جو کچھ اخذ کیا ہے۔ ان اقدار کی وضاحت یا تائید کے لئے کیا ہے۔ کسی اور مقصد کے لئے نہیں ۔

مطبوعاتِ طلوعِ اسلام

معراجِ انسانیت از پرویز۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہبِ عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد مع گردپوش۔ قیمت بیس روپے

ابلیس و آدم از پرویز۔ سلسلۂ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظرِ ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق۔ قصۂ آدم۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستورِ پاکستان اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں کی تنقید کی گئی ہے۔ ۲۲۴ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۴۰ صفحات۔ قیمت دو روپے

سلیم کے نام از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوئے ہیں ان کا شگفتہ مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۲۲۵ صفحات۔ قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے روزمرہ کی زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے

اسبابِ زوالِ امت از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا۔ ۱۵۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر سات سالہ دورِ آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے ۸ آنے

مزاج شناسِ رسول یہ کون بتلائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناسِ رسول؛ مزاج شناس کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۴۴ صفحات۔ قیمت چار روپے

مقامِ حدیث حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے تقریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد چار روپے

فردوسِ گم گشتہ از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۱۶ صفحات۔ قیمت چھ روپے

نوادرات از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ چار سو صفحات قیمت چار روپے

تمام کتابیں مجلد ہیں۔ اور گردپوش سے آراستہ

اسلامی معاشرت

از پرویز۔ مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔ صفحات ۱۹۲۔ قیمت دو روپے

محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا

ملنے کا پتہ

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۳۱۲۔ کراچی

یوم اقبال پر تازہ پیشکش

☆ اقبال اور قران

علامہ اقبال کے قرانی پیغام کے متعلق

محترم پرویز صاحب

کے دلکش مضامین اور انقلاب آفریں تقاریر کا مجموعہ ۔

اقبال کے سمجھنے کے لئے

اس سے بہتر کتاب آپکو بمشکل مل سکیگی ۔

ضخامت اڑھائی سو صفحات سے زیادہ ۔

قیمت ڈسٹ کور کے ساتھ صرف دو روپے علاوہ محصول ڈاک ۔

جن حضرات کی پیشگی رقم جمع ہے انھیں کتاب از خود بھیجدی جائیگی ۔

اگر وہ کتاب نہ لینا چاھیں تو اسکی بابت جلد اطلاع دیں ۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ ـ کراچی ـ ۳

دور حاضرہ کی عظیم کتاب

✡ نظام ربوبیت (پرویز)

شائع ہوگئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ قران کی رو سے
اس زمین پر انسان کے سب سے اہم سوال۔ یعنی

معاشی مسئلہ

کا حل کیا ہے۔ انسانی عقل اس کے حل سے کس طرح قاصر رہی
ہے اور وحی خداوندی نے اسے کس خوبصورتی سے حل کردیا ہے۔
رزق کے سر چشموں پر

ذاتی ملکیت

کیا نتائج پیدا کرتی ہے اور قران اس باب میں کیا کہتا ہے۔
چونکہ اس کتاب کی عام اشاعت مقصود ہے اس لئے اسے
دو قسموں میں شائع کیا گیا ہے۔

قسم اول: کاغذ سفید کرنافلی جلد مضبوط معہ گردپوش۔ چھہ روپے
قسم دوم: کاغذ میکانیکل صرف ڈسٹ کور کے ساتھ۔ چار روپے
دونوں صورتوں میں محصول ڈاک الگ ہے۔

بہت جلد فرمائشیں بھیجیں۔ جن حضرات کی پیشگی رقم جمع ہے اُنھیں
قسم اول از خود بھیجدی جائیگی۔ اگر وہ کتاب نہ لینا چاھیں یا قسم
دوم لینا چاھیں تو بہت جلد اطلاع بھیجدیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۰۱۳ء - کراچی

Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound Bunder Road, Karachi. Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1, Fowler Lin Napier Barracks, Karachi. Editor: KHURSHID ALAM

جلد ۸ شمارہ ۱۳ | کراچی: ہفتہ ۔ ۳۰ ۔ اپریل ۱۹۵۵ء | قیمت چار آنے سالانہ دس رو

قرآن نے کیا کہا؟

آپ کسی مسلمان سے پوچھئے ۔ وہ کہدیگا کہ الحمد للہ ۔ وہ مسلمان ہے ۔ مومن ہے ۔ خدا کی توحید کا قائل ہے ۔ اس کے برعکس مشرک وہ ہیں جو بتوں کی پوجا کرتے ہیں ۔ جو ایک سے زیادہ خداؤں کے قائل ہیں ۔ جو اپنے نبیوں کو خدا کا اوتار سمجھتے ہیں ۔ لیکن خدا کا ارشاد ہے کہ وما یؤمن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون (۱۲/۱۰۶) اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ وہ اللہ پر ایمان نہیں لاتے مگر اس حالت میں کہ وہ اس کے ساتھ ہی مشرک بھی رہتے ہیں ۔

ذرا اپنے سینے کو ٹٹولئے اور سوچئے کہ کہیں (خدا نکردہ) آپ بھی اسی زمرہ میں تو شامل نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ بھی ایمان کے دعوے کے ساتھ ساتھ شرک کے مرتکب ہو رہے ہوں اور آپ کو اس کا شعور تک بھی نہ ہو کہ آپ شرک کر رہے ہیں؟ لیکن اس کا پتہ آپ کو صرف اسی صورت میں چل سکے گا جب آپ اپنے ایمان کو قرآن کی روشنی میں پرکھیں ۔

طلوع اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ....

۱ تنہا انسانی عقل زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں ۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ۔

۲ یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے ۔ اس لئے نوع انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی ۔

۳ حق اور باطل کا معیار قرآن ہے ۔ جو روایات قرآن کے مطابق ہوں صحیح ہیں جو اس کے خلاف ہیں غلط ہیں ۔

۴ حضور نبی اکرم انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن بعض سازشوں نے ہماری تاریخ میں ایسی چیزیں شامل کر رکھی ہیں جن سے حضور کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے ۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں ۔ حضور کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے ۔

۵ قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں ۔ اس برادری کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے ۔

۶ اس عالمگیر نظام زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں ۔ (انہیں قانون شریعت کہا جاتا ہے) یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے ۔

۷ اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا (اسے ربوبیت عالمین یعنی تمام نوع انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے)

۸ ربوبیت عالمین کے مقصد عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہو سکے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے ۔ اسے "قرآنی نظام ربوبیت" کہا جاتا ہے ۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ....

ابتداءً پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں قرآنی نظام ربوبیت نافذ ہو جائے جس سے صفات خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی ذاتی جوہری صلاحیتیں کامل نشوونما پا سکیں اور اس طرح "زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے" ۔

اگر آپ طلوع اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوع اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ اشتراکیت اور اسلام ★ صالحین کے انداز ★ ٹیونس کی آزادی ★ افغانستان
★ تمنائے رسول اور القائے شیطان ★ جاحظ ★ عورت کا قرآن ★ تاریخی شواہد
★ اسلام کی سرگزشت ★ نقد و نظر ★ بزم طلوع اسلام ★ ہندوؤں کا انخلاء

تازہ پیشکش

٭ اقبال اور قران

علامہ اقبال کے قرانی پیغام کے متعلق

محترم پرویز صاحب

کے دلکش مضامین اور انقلاب آفریں تقاریر کا مجموعہ۔

اقبال کے سمجھنے کے لئے

اس سے بہتر کتاب آپکو بمشکل مل سکیگی۔

ضخامت اڑھائی سو صفحات سے زیادہ۔

قیمت ڈسٹ کور کے ساتھ صرف دو روپے علاوہ محصول ڈاک۔

جن حضرات کی پیشگی رقم جمع ہے انہیں کتاب از خود بھیجدی جائیگی۔

اگر وہ کتاب نہ لینا چاہیں تو اسکی بابت جلد اطلاع دیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳۔ کراچی۔ ۳

ہفتہ وار
طلوعِ اسلام

جلد ۸ | ۳۰ر اپریل ۱۹۵۵ء | نمبر ۱۳

اشتراکیت اور اسلام

باطل کے مقابلہ میں حق کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ باطل اپنی کامیابی کے لئے ہمیشہ حق کا نقاب اوڑھ کر آتا ہے۔ اگر کوئی شخص آپ سے کسی بات کا وعدہ کرے اور ساتھ ہی یہ کہدے کہ وہ جھوٹا وعدہ کر رہا ہے تو آپ اس کے فریب میں کبھی نہیں آئیں گے۔ وہ اپنی فریب دہی میں اس وقت کامیاب ہو سکے گا جب وہ وعدہ کرنے کے ساتھ ہی یقین دلا دے کہ وہ بالکل سچا وعدہ کر رہا ہے اور قطعاً جھوٹ نہیں کہتا۔ یعنی جب تک وہ اپنے جھوٹ کو سچ کے نقاب میں پیش نہ کرے اس کا جھوٹ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ باطل کے مقابلہ میں بے شک یہ حق کی بڑی فتح ہے لیکن باطل کی یہی روش دنیا میں تباہیوں اور بربادیوں کا موجب بھی ہے۔ آپ دھوکا اس وقت کھاتے ہیں جب آپ کو یقین ہو کہ آپ کے ساتھ دھوکا نہیں کیا جا رہا۔ یعنی آپ باطل کے زہر کو اس وقت کھا سکتے ہیں جب وہ حق کی شکر میں لپٹا ہوا سامنے آئے۔ یوں تو باطل کا یہ حربہ کاروانِ انسانیت کے لئے قدم قدم پر رہزنی اور قزاقی کا موجب بنتا رہا ہے لیکن عصرِ حاضر میں اس کی غارت گری اور ہلاکت انگیزی نے جو شدت اور وسعت اختیار کی ہے اس کی مثال تاریخ کے اوراق میں کہیں نہیں ملتی۔

وحیِ خداوندی نے انسان کو یہ بتایا تھا کہ

(۱) انسان کے ہر ارادہ اور ہر عمل کا ایک خاص اثر اور نتیجہ ہوتا ہے، جو ہر حال میں مرتب ہو کر رہتا ہے اور اس سے اس کی ذات متاثر ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، ہر عمل ایک مستقل قدر (VALUE) رکھتا ہے جسے کوئی بدل نہیں سکتا۔

(۲) انسان کی زندگی اس دنیا تک محدود نہیں۔ اس کا سلسلہ اس سے بھی آگے جاری رہتا ہے۔ اس لئے اعمال کے نتائج و اثرات کا سلسلہ بھی حال اور مستقبل دونوں کو محیط ہوتا ہے۔ انسان ان اثرات سے کسی صورت میں بھی بچ نہیں سکتا

(۳) یہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے جس پر کوئی قوت غالب نہیں آ سکتی۔ اس تصورِ حیات کا نام وحی کی اصطلاح میں ایمان باللہ و ایمان بالآخرت ہے۔

اس کے برعکس انسانی ذہن نے ایک تصور پیدا کیا جس کی رو سے کہا گیا کہ اِنْ هِیَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ (۲۳/۳۷) زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ ہم روز دیکھتے ہیں کہ لوگ مرتے ہیں اور نئے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ سلسلۂ حیات و ممات بس اسی دائرے کے اندر ہے۔ اس کے بعد زندگی کا تصور غلط ہے۔ اسی بنیاد پر انہوں نے یہ عمارت استوار کر لی کہ جس کام میں انسان کا اپنا فائدہ ہو وہ اچھا ہے جس میں اس کا نقصان ہو وہ بُرا ہے۔ اس لئے خیر اور شر کا کوئی مستقل معیار نہیں، بالفاظِ دیگر کوئی عمل اپنی ذات میں کوئی مستقل اور غیر متبدل قدر نہیں رکھتا۔ سب اقدار اضافی ہیں۔ اپنے فائدہ یا نقصان کو اعمال کا نتیجہ کہا جاتا ہے۔ انسان جس قدر زیرک و چالاک، اور صاحبِ قوت و اقتدار ہو وہ اُسی قدر اپنے اعمال کو اپنے حق میں فائدہ مند بنا سکتا ہے۔ انسان پر گرفت صرف سوسائٹی کی ہے۔ اس سے آگے کوئی اور قوت نہیں جس پر انسان کی گرفت ہو۔ اس تصورِ حیات کو مادی تصور (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کہا جاتا ہے۔ گذشتہ ادوار میں یہ تصور افراد تک محدود رہتا تھا یا بعض مفکرین کے حلقۂ دماغ تک۔ لیکن ہمارے دور میں (جس کی ابتدا یوں سمجھئے کہ انیسویں صدی سے ہوتی ہے) اس تصور نے ایک اجتماعی شکل اختیار کی اور ایک پوری تہذیب کی عمارت انہی بنیادوں پر اٹھائی گئی۔ اس تہذیب کو تہذیبِ مغرب کہہ کر پکارا جاتا ہے، کیونکہ اس کی ابتدا یورپ کی سرزمین سے ہوئی تھی۔ چونکہ دنیا کے بیشتر حصہ پر مغربی اقوام کو سیاسی غلبہ حاصل تھا اس لئے اس تہذیب کا اثر عالمگیر ہوتا چلا گیا اور قریب قریب تمام اقوامِ عالم اس رنگ میں رنگی گئیں لیکن اس کا سحر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ اس لئے کہ دنیا نے جلد ہی دیکھ لیا کہ اس کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ

اُمتے بر اُمتے دیگر چرد
دانۂ ایں می کارد آں حاصل بُرد

زبردست قومیں، زیردست قوموں کو نگلے جا رہی ہیں۔ جھوٹ اور فریب کا چلن عام ہو رہا ہے۔ دولت سمٹ کر ایک خاص (بالائی) طبقہ کے ہاتھ میں آ رہی ہے۔ غریب بُری طرح سے کچلے جا رہے ہیں۔ کمزور اور ناتوان کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ اس لئے لوگ اس تہذیب (یا مادی تصورِ حیات) سے متنفر ہونے شروع ہو گئے اور اس پر سخت تنقیدی نگاہیں پڑنے لگیں۔ ان کڑی تنقیدوں سے باطل نے محسوس کیا کہ اس سے غلطی ہو گئی ہے۔ اُسے اس طرح بے نقاب سامنے نہیں آنا چاہیئے تھا۔ حق کے نقاب میں ظاہر ہونا چاہیئے تھا۔ چنانچہ اس نے اس قسم کا نقاب بننا شروع کر دیا۔

یہ نقاب اس قسم کے نعروں پر مشتمل تھا کہ دنیا میں تمام خرابیوں کی جڑ سرمایہ پرستی ہے۔ دولت کا چند افراد کے ہاتھوں میں محدود ہو جانا، نوعِ انسانی کے لئے موجبِ ہلاکت ہے۔ معاشرہ کا صحیح نقشہ یہ ہے کہ غریبوں اور کمزوروں، مزدوروں اور محنت کشوں کو خاک کی پستیوں سے اٹھا کر بلند ترین سطح پر بٹھایا جائے۔ اس نقاب پوش مادہ پرستی یا (SUGAR-COATED) تہذیبِ مغرب کا نام اشتراکیت یا کمیونزم ہے۔ اس میں تصورِ حیات حرفاً حرفاً وہی ہے جو مغرب کے نظامِ سرمایہ پرستی نے پیدا کیا تھا اور جس پر اس کی ساری عمارت استوار ہے۔ یعنی

(۱) زندگی بس اس دنیا کی زندگی کا نام ہے۔ اس سے آگے کوئی زندگی نہیں۔

(۲) اعمال فی ذاتہٖ کوئی مستقل اقدار نہیں رکھتے۔

(۳) انسان پر انسان سے اوپر کسی قوت کی گرفت نہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ جہاں تک فلسفۂ زندگی یا تصورِ حیات کا تعلق ہے (جسے وحی کی اصطلاح میں ایمانیات کہتے ہیں) مغرب کے نظامِ سرمایہ داری اور روس کی کمیونزم میں کوئی فرق نہیں۔ اس اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ فرق صرف ان کے معاشی نظام میں ہے۔ کمیونسٹوں کی تکنیک یہ ہے کہ وہ اس بنیادی تصورِ حیات یا فلسفۂ زندگی کا کبھی ذکر نہیں کرتے۔ صرف اپنے معاشی نظام کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں اور چونکہ یہ معاشی نظام ایسا ہے جو ہر اس شخص کے نزدیک باعثِ خیر و برکت ہے جس کے دل میں انسانیت کا ذرا سا بھی درد ہے (اور وحیِ خداوندی چونکہ انسانیت کا سب سے بڑا بہی خواہ ہے۔ اس لئے اس نے خود اس قسم کا معاشی نظام تجویز کیا ہے) اس لئے ہر شخص ان کے پراپیگنڈہ سے متاثر ہو جاتا ہے اور اس طرف اس کی نگاہ ہی نہیں جانے پاتی کہ یہی تصورِ حیات کا پرچار ہے جس سے متنفر ہو کر اس نے سلامتی کا کوئی اور راستہ تلاش

کرنا چاہا تھا۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھا ہوگا کہ اشتراکیت درحقیقت باطل کے اس دیرینہ حربہ کی ایک شکل ہے جس کی رو سے حق کے نقاب میں وہ سامنے آیا کرتا ہے۔ سطح بیں لوگ کمیونسٹوں سے ان کے معاشی نظام (یعنی نقاب) سے بحث کرتے ہیں اور شکست کھا جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا نقاب مبنی علی الحق ہے۔ درحقیقت زیر بحث لانے کی چیز وہ فلسفۂ زندگی یا تصور حیات ہے جس پر ان کی تحریک کی بنیاد ہے۔ یہ تصور حیات، اسلام کی یکسر نقیض ہے اور کوئی شخص بیک وقت اسلام کے تصور حیات (ایمان) کا معترف اور کمیونزم کے مسلک کا مؤید نہیں ہو سکتا۔ نہ صرف کمیونزم کا، بلکہ مغرب کے مادی تصور حیات کا مؤید، جس کے علمبردار، یورپ اور امریکہ سب ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی صاحب نظر انکار نہیں کر سکتا۔

کمیونسٹوں کی طرف سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کمیونزم کے فلسفۂ زندگی پر بحث کیوں کرتے ہیں؟ آپ اس کی طرف سے پیش کردہ نظام کو دیکھیں۔ اگر وہ نظام آپ کو صحیح نظر آتا ہے تو آپ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں۔ یہ بھی درحقیقت باطل کی نگاہ فریبی ہے۔ اسلام کی رو سے کسی معاشی، سیاسی یا عمرانی نظام کو فلسفۂ زندگی سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ "عمل بلا ایمان" کو کوئی وقعت نہیں دیتا اور ہمیشہ "ایمان اور عمل" کو یکجا رکھتا ہے۔ لہٰذا یہ غلط ہے کہ آپ کمیونزم کے فلسفۂ حیات کو تسلیم نہ کریں اور محض اس کے معاشی نظام کے لئے کمیونسٹ ہو جائیں۔ اسی سے اس بات کا جواب بھی مل جاتا ہے جو کمیونسٹوں کی طرف سے کہی جاتی ہے کہ بانیان اشتراکیت (مارکس، انجیلز وغیرہ) نے فریب دہی کی خاطر اس تحریک کو پیش نہیں کیا تھا۔ ان کے دل میں انسانیت کا درد اور غریبوں کی ہمدردی کا جذبہ موجزن تھا جس سے انہوں نے نظام سرمایہ داری کو توڑنا چاہا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کا جذبۂ محرکہ یہی ہو (اور جب تک اس کے خلاف بین شواہد نہ ہوں ہمیں اس کے اعتراف میں کوئی باک نہیں ہونا چاہیئے کہ ان کا جذبۂ محرکہ ایسا ہی تھا)۔ لیکن غلط فلسفۂ زندگی تو بہرحال غلط رہتا ہے خواہ اسے قبول اور پیش کرنے والوں کی نیت کتنی ہی نیک کیوں نہ ہو۔ دنیا میں کتنی ہی گمراہیاں ہیں جو نیک نیت انسانوں کی طرف سے پھیلائی ہوئی ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے مارکس کے متعلق کہا ہے کہ

زانکہ باطل در حق او مضمر است
قلب او مومن دماغش کافر است

علاوہ بریں قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ صحیح معاشی نظام، غلط تصور حیات کی بنیادوں پر کبھی قائم نہیں ہو سکتا۔ مارکس کی غلط فہمی یہ تھی کہ وہ ایک ایسے معاشی نظام کو جس میں نوع انسانی کی بھلائی ہو، اس مادی فلسفۂ زندگی کی بنیادوں پر قائم کرنا چاہتا تھا جس میں نوع انسانی کی بھلائی کی صلاحیت ہی نہیں۔ بہرحال ان حضرات کی نیت کچھ ہی کیوں نہ ہو، یہ حقیقت ہے کہ کمیونزم کا فلسفۂ زندگی (جسے اس کے نظام سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا) اسلام کے یکسر خلاف ہے بلکہ یوں کہئے کہ یہی وہ تحریک ہے جو اسلام کے مقابلہ میں ایک دین (نظام زندگی) کی حیثیت سے اٹھی ہے۔ اس لئے ہر اس شخص کے لئے جس کے دل میں اسلام کا احترام (اور لہٰذا نوع انسانی کی بہبود کا جذبہ) ہے ضروری ہے کہ وہ اس تحریک کا ہر طرح سے مقابلہ کرے۔ اگر خدانخواستہ یہ تحریک کامیاب ہو گئی تو (مسلمان تو ایک طرف) انسانیت کے لئے کوئی جائے پناہ باقی نہیں رہے گی اور دنیا پھر ازمنۂ مظلمہ (DARK AGES) کی انسانیت سوز غلامی کی طرف لوٹ جائے گی (یلیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیا منسیا)۔

اب سوال یہ ہے کہ جب کمیونزم اسلام کی یکسر نقیض ہے اور اس کے ساتھ ہی اسلام ایک ایسا نظام بھی قائم کرنا چاہتا ہے جس سے سرمایہ پرستی کی لعنت ختم ہو، تو اس کا طریقہ کیا ہے؟ اس کا طریقہ ہے قرآنی نظام ربوبیت کا قیام جس کی تفصیل آئندہ اشاعت میں پیش کی جائے گی۔

"صالحین" کے انداز

۲۰ر اپریل کے طلوع اسلام میں ہم نے "قرآن اور حدیث کی صحیح پوزیشن" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا تھا جس میں تصریح کر دی گئی تھی کہ مضمون، مودودی صاحب کی مختلف تحریروں سے مرتب کیا گیا ہے۔ ہر تحریر کے ساتھ حوالہ بھی دیدیا گیا تھا کہ اقتباس کہاں سے لیا گیا ہے۔ جماعت اسلامی پر یہ ضرب اتنی کاری پڑی کہ وہ بالکل سٹ پٹا گئے۔ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ اب وہ ہر جگہ کہتے پھرتے ہیں کہ یہ مضمون مختلف تحریروں سے مرتب کیا گیا ہے۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ کسی کی مختلف تحریروں سے مضمون مرتب کرنا کونسا جرم ہے جس کا ارتکاب طلوع اسلام سے ہوا ہے۔ جرم یہ ہوتا ہے کہ کسی کی تحریر سے کوئی ٹکڑا اس طرح سیاق و سباق سے الگ کر لیا جائے کہ اس سے اس کا مفہوم ہی بدل جائے۔ ہم جماعت اسلامی کو چیلنج دیتے ہیں کہ وہ مذکورہ صدر مضمون کے کسی مضمون کے متعلق یہ ثابت کریں کہ اگر اسے اصل تحریر کے اندر رکھ کر پڑھا جائے تو اس کا مطلب کچھ اور ہوگا۔ اگر وہ کسی ایک ٹکڑے کے متعلق بھی یہ ثابت کر دیں تو طلوع اسلام اپنی غلطی کا کھلے بندوں اعتراف کرے گا اور ان سے اور مودودی صاحب سے اپنے قصور کی معافی مانگ لے گا۔

اور اگر وہ ایسا نہ کر سکیں (اور وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکیں گے) تو ہم ان سے دریافت کرنا چاہیں گے کہ وہ سادہ لوح مسلمان کو بالآخر کب تک دھوکا دیتے چلے جائیں گے۔ مودودی صاحب کے متعلق اس سے پیشتر، مولانا ظفر احمد عثمانی، صدر جمعیت علمائے پاکستان، فتویٰ دے چکے ہیں کہ

یہ شخص منکر حدیث ہے۔ گمراہ اور مبتدع ہے۔ ایسے شخص سے مسلمانوں کو دور رہنا چاہیئے اور اس کی باتوں پر ہرگز اعتماد نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کو جاہل اجہل سمجھنا چاہیئے۔

آپ نے ان "صالحین" سے کبھی اس فتوے کے متعلق ایک حرف بھی سنا ہے؟ یہ ہے ان کی فریب دہی کا عالم!

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد

ٹیونس کی داخلی آزادی

کم و بیش ستر سال کے دور غلامی میں ٹیونس عظیم انسانی ابتلا سے دوچار رہا ہے۔ فرانس اس سارے دوران میں اس کا جذبۂ آزادی کچلنے میں دیوانہ وار مصروف رہا۔ لیکن اگر اس کا جور و استبداد وقت گزرنے سے بڑھتا گیا تو اہل ٹیونس کا جوش آزادی بھی اسی تناسب سے بے پناہ ہوتا گیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ دہشت اور تشدد کا شکار رہنے کے باوصف ٹیونس کے مطالبات میں انتہا پسندی نہیں آئی اور وہ بڑے ضبط و تحمل اور حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے داخلی آزادی کے لئے کوشاں رہا۔ اس کے آزادی پسندوں نے فرانس کو ہمیشہ یقین دلایا کہ وہ اس سے کٹ کر علیحدہ ہو جانے پر زور نہیں دے رہے بلکہ محض اندرون ملک خود مختاری کے طلبگار ہیں، نیز مطلوبہ اختیارات میسر آ جانے پر وہ فرانس کے حلیف رہیں گے اور فرانس کے خصوصی حقوق کا پورا پورا تحفظ کریں گے۔ لیکن فرانس کی حکومتیں یکے بعد دیگرے اس مخلصانہ پیشکش کو ٹھکراتی رہیں جس سے ملک میں دہشت انگیزی اور انتہا پسندی کو فروغ ہونا شروع ہو گیا۔

خدا خدا کر کے گذشتہ جولائی میں فرانس کے تیور بدلے اور اس نے ٹیونس کو داخلی آزادی کی پیشکش کی۔ یہ وہ وقت تھا کہ آٹھ سال کی ناکام جنگ کے بعد فرانس ہند چینی میں ہتھیار ڈال چکا تھا۔ اس وقت کے وزیر اعظم، مسٹر مینڈس فرانس، نے بڑی جرأت اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیتے ہوئے باغیوں سے مفاہمت کر کے فرانس کو تباہ ہونے سے بچا لیا تھا۔ ہند چینی میں امن کی فضا پیدا کرنے کے بعد مینڈس فرانس نے مغرب اقصیٰ کی طرف توجہ دی اور ٹیونس کے لئے داخلی آزادی کا اعلان کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ حکومت خالصتاً اہل ٹیونس کی مرتب کی جائے جسے داخلی امور پر اختیار حاصل ہو اور دفاع اور امور خارجہ فرانس کے قبضے میں رہیں۔ اس پیشکش کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ٹیونس میں ہر قسم کے مظاہرے روک دیئے گئے۔ ٹیونسی وزیر اعظم، ابن عمر، نے پیرس میں فرانسیسی حکومت سے مذاکرات کی طرح ڈالی۔ حکومت فرانس نے بڑی دانشمندی سے نو دستور قطرنید لیڈر، حبیب بورقیبہ، کو پیرس منتقل کر دیا اور ان سے بھی استصواب کیا۔ بورقیبہ نے اس تجویز کو بہ نظر استحسان دیکھا اور اس خیر سگالی کی فضا کو تقویت دی۔

لیکن مذاکرات شروع ہوئے تو بہت جلد یہ حقیقت سامنے آ گئی کہ ٹیونس میں آباد کار فرانسیسیوں کا با اثر طبقہ حکومت پر دباؤ ڈال ڈال کر مذاکرات کو ناکام بنا دینا چاہتا ہے۔ اسی دباؤ کا نتیجہ تھا کہ فرانسیسی نمائندوں نے ٹیونس کو پولیس پر اختیار دینے سے انکار کر دیا۔ حبیب بورقیبہ نے اسے داخلی آزادی کے منافی قرار دیا اور اس طرح مذاکرات میں تعطل پیدا ہو گیا۔ فرانسیسی آباد کاروں کا دباؤ اس قدر بڑھ گیا کہ اس مسئلہ پر

باقاعدہ مسٹر مینڈیس فرانس کی حکومت کو شکست ہوگئی۔ اس شکست سے ٹیونس میں بجا طور پر مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ ان مذاکرات سے اقل قلیل مطالبہ کی تکمیل کی جو امید پہلی بار پیدا ہوئی تھی وہ بھی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اس مایوسی کے عالم میں فرانس کی نئی حکومت مسٹر فارے کی قیادت میں معرض وجود میں آئی اور اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں مذاکرات کا سلسلہ از سر نو شروع کر دیا۔ اب تازہ ترین اطلاع سے پتہ چلتا ہے کہ مذاکرات کا یہ سلسلہ کامیاب ہو گیا ہے اور فرانس اور ٹیونس میں آخر الذکر کی داخلی آزادی سے متعلق تصفیہ ہو گیا ہے۔ اس تصفیہ کی تفاصیل ابھی شائع نہیں ہوئیں - ان کے مکمل تعین میں ہنوز وقت لگے گا۔ پوری تفاصیل رمضان کے بعد طے ہوں گی۔ پھر وہ دونوں حکومتوں کی تصدیق کے لئے پیش ہوں گی اور آخر کار فرانسیسی پارلیمان کی منظوری کے بعد نافذ العمل ہوں گی۔

تفاصیل کے بغیر معاہدہ کے حسن و قبح پر تبصرہ ممکن نہیں لیکن چونکہ ٹیونس کے قائد حریت، حبیب بورقیبہ، نے اسے سراہتے ہوئے فرانس اور ٹیونس کے مابین دوستی کے نئے دور کے آغاز سے یاد کیا ہے، اس لئے توقع کی جا سکتی ہے کہ معاہدہ بالعموم ٹیونس کے مطالبات کے مطابق ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ بورقیبہ جو گذشتہ دو سال سے نظر بند تھے، تمام قیود سے آزاد کر دیئے گئے ہیں - وہ اب چاہیں تو ٹیونس واپس بھی آ سکتے ہیں۔ بورقیبہ کی رہائی ٹیونس اور فرانس دونوں کے لئے عمدہ نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔ وہ اپنے بے پناہ اثر و رسوخ سے کام لے کر دوستانہ فضا کو مستحکم تر بنانے میں بڑی مدد دیں گے۔

اس معاہدے پر جس قدر بھی مسرت کا اظہار کیا جائے کم ہے ٹیونس نئے حقوق حاصل کر کے یکسوئی سے اپنے مستقبل کی فکر کر سکے گا اور اس کی قوت فرانس سے لڑنے کی بجائے اپنی تعمیر و ترقی پر صرف ہو سکے گی۔ لیکن ہنوز یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ معاہدہ بخیر و خوبی نافذ العمل ہو جائے گا۔ فرانسیسی آباد کار، جن کے اجاروں پر اس معاہدہ کی زد پڑتی ہے، اس کے شدید مخالف ہیں - وہی آج تک مذاکرات صلح کو ناکام بناتے چلے آئے ہیں۔ آخری مرتبہ وہ مینڈیس فرانس کی حکومت تک الٹنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ چونکہ ان کا پارلیمان میں بہت اثر ہے اس لئے کہا نہیں جا سکتا کہ پارلیمانی تصدیق بآسانی ہو جائے گی۔ اگر خدانخواستہ وہ ایک مرتبہ پھر کامیاب ہو گئے تو اس کی جو فضا گذشتہ آٹھ مہینے سے پیدا ہو چکی ہے وہ تباہ ہو جائے گی، اس کا نتیجہ خود فرانس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ فرانس اپنی داخلی کمزوری کی بدولت سمندر پار کے ممالک کو اپنے پنجۂ اقتدار میں رکھ نہیں سکتا۔ اس کے لئے بچاؤ کی یہی صورت ہے کہ وہ ممالک متعلقہ سے دوستانہ معاہدے کرے اور ان "غلاموں" کو دوست بنا لے۔ اس نے ایسا نہ کیا تو آج کے "غلام" کل کے دشمن بن جائیں گے۔ فرانس ہند چینی سے بے دخل ہو چکا ہے۔ شمالی افریقہ میں وہ تادیر نہیں رہ سکتا۔ البتہ اگر وہ ان علاقوں کو خود مختاری دینے پر رضامند ہو جائے تو یہ ممالک رضاکارانہ طور پر اس کی قیادت تسلیم کر لیں گے۔ فرانس کے لئے یہی مناسب نہیں کہ وہ ٹیونس کو داخلی آزادی دے، بلکہ انہی خطوط پر الجزائر اور مراکش سے بھی مذاکرات کی طرح ڈالے۔ ٹیونس میں جو کچھ ہوگا اس کا اثر لامحالہ ان ہمسایہ ممالک پر پڑے گا۔ اگر فرانس نے ان کے مطالبہ کو پورا کرنے کی کوشش نہ کی تو ٹیونس کا تعاون حاصل کر لینے کے باوجود فرانس کو شمالی افریقہ میں عافیت حاصل نہیں ہوگی۔ اگر فرانس چاہتا ہے کہ مغرب اقصیٰ دوسرا ہند چینی نہ بنے تو اسے ابھی سے حسن تدبیر سے کام لینا چاہیئے۔

یہ تاخیر کیوں؟

۳۰ مارچ کو کابل میں پاکستانی سفارت خانے پر افغانی حکومت نے جو بزدلانہ حملہ کرایا، اس سے پاکستان کے طول و عرض میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی اور ترکی بترکی جواب کا ہمہ گیر مطالبہ ہوا تھا۔ حکومت پاکستان نے عوام کو اپنے جذبات قابو میں رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ پاکستان کے پرچم کی جو توہین ہوئی ہے اس کا پورا بدلہ لیا جائے گا اور نقصان کی تلافی کرائی جائے گی۔ اس اپیل کا یہ اثر ہوا کہ ملک میں بڑے صبر و سکون کا مظاہرہ کیا گیا۔ لیکن ہماری حکومت نے اس پر کیا کارروائی کی؟ اس کی طرف سے حکومت افغانستان کو ایک یادداشت بھیج کر مطالبہ کیا گیا کہ

(۱) وہ ہنگامے کی صفائی پیش کرے اور ضمانت دے کہ آئندہ اس کا اعادہ نہیں ہوگا۔

(۲) وہ ضمانت دے کہ کابل، قندھار اور جلال آباد میں پاکستانی سفارت خانے بین الاقوامی قاعدے کے مطابق محفوظ رہیں گے۔

(۳) وہ غیر مشروط معافی مانگے۔

(۴) پاکستانی پرچم کی جو توہین ہوئی ہے اس کی آبرومندانہ تلافی کرے۔ اور

(۵) لوٹے ہوئے یا تباہ شدہ سامان کا ہرجانہ ادا کرے۔

اس کے جواب میں حکومت افغانستان نے قندھار اور جلال آباد کے سفارت خانوں پر بھی حملے کرا دیئے اور پاکستانی عملہ اور پاکستانی شہریوں کا مکمل مقاطعہ کرا دیا، یہاں تک کہ مجبور ہو کر تمام پاکستانی خاندانوں کو افغانستان کی حدود سے نکال لیا گیا ہے۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حکومت افغانستان اپنے کئے پر پشیمان ہونا تو ایک طرف وہ خلاف پاکستان کارروائی کو نتائج اور عواقب سے بے پروا ہو کر جاری رکھنے پر تلی ہوئی ہے۔ جہاں ہماری گمراہ ہمسایہ حکومت کا یہ حال ہے وہاں حکومت پاکستان کی یہ صورت ہے کہ محض باتوں باتوں میں کم و بیش ایک مہینہ ضائع کر دیا گیا ہے۔ اس سے حکومت افغانستان یہ نتیجہ نکالنے میں بالکل حق بجانب ہوگی کہ حکومت پاکستان کا غم و غصہ باتوں کی حد سے آگے نہیں بڑھتا لہٰذا بلا خوف و خطر اس کو گزند پہنچایا جا سکتا ہے۔ پاکستان کی پالیسی افغانستان کے بارے میں شروع سے ہی کمزور رہی ہے اور افغانستان اس کمزوری کا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ حکومت اس کمزور پالیسی کو کس مصلحت کی بنا پر جاری رکھ رہی ہے اور اسے اس سے کس فائدے کی توقع ہے۔ افغانستان نے پاکستان سے انتہائی ناقابل برداشت سلوک کیا ہے اور اس کا اسے پورا پورا جواب دینا چاہیئے۔ ہماری طرف سے جتنی تاخیر ہوگی افغانستان کا اسی قدر حوصلہ بڑھے گا۔ یکم اپریل کی نشری تقریر میں وزیر اعظم

... سے نوازا۔

اور ناموس

سے نہیں بیٹھیں گے ...

فارغ ہو چکے ہیں انہیں فی الفور ...

سوئی گیس

سوئی کے مقام پر گیس کی دریافت پاکستان کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ قدرت کے اس بے نظیر عطیے کی ممکنات بڑی انقلابی ثابت ہو سکتی ہیں۔ اس وقت تک یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ گیس کا متوقع ذخیرہ کم از کم ساٹھ سال تک کام دے سکے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اتنے عرصے کے لئے ہمارے کارخانے کوئلے سے بے نیاز رہ سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ پاکستان میں کوئلے کی کمی ہے اور ہمیں ہر سال گراں قدر رقم اس کے مہیا کرنے میں صرف کرنا پڑتی ہے۔ اس سے نہ محض قیمتی زرمبادلہ صرف ہوتا ہے بلکہ ہماری مصنوعات پر لاگت بھی زیادہ آتی ہے۔ گیس کے استعمال سے کم و بیش پچاس لاکھ پونڈ سالانہ کی بچت ہو سکے گی۔ اس طرح ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ یہ زرمبادلہ زیادہ ضروری مدات پر صرف کیا جا سکے گا، اور دوسرا فائدہ یہ کہ سستی گیس کی بدولت کارخانے سستی مصنوعات تیار کر سکیں گے۔ اور چونکہ گیس کپڑے اور سیمنٹ وغیرہ کے کارخانوں میں استعمال کی جائے گی اس لئے توقع کی جا سکتی ہے کہ عنقریب ان ضروری اشیائے صرف کی قیمتیں مناسب سطح پر آ جائیں گی۔

انتہائی مسرت کا مقام ہے کہ سوئی گیس کو کارخانوں تک پہنچانے کا کام بڑی مستعدی سے تکمیل پا رہا ہے۔ اب تک ایک پائپ لائن سوئی سے کراچی تک پہنچائی جا چکی ہے۔ اس کا آخری جوڑ گذشتہ ہفتے میں مکمل کیا گیا۔ یہ ۳۴۰ میل لمبی لائن ۱۰۰ دنوں میں مکمل ہو گئی ہے۔ محض محنت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ مرحلہ بڑا دشوار گزار تھا۔ لائن کو قریباً ہر قسم کی زمین سے گزرنا پڑا۔ مثلاً پہاڑی، جنگلی، دلدلی، صحرائی وغیرہ۔ اس اعتبار سے ۳ میل فی روز کی رفتار حیران کن ہے۔ دراصل یہ حیران کن ہماری سست روی کے مقابلے میں ہے، ورنہ آجکل کے دور برق رفتاری میں کیا کچھ ممکن نہیں۔ یہ غنیمت ہے کہ ہمارے ہاں رفتار اور ترقی کا چرچا ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اس پر جس قدر بھی اطمینان کا اظہار کیا جائے کم ہے۔ اس کے لئے مستحق مبارکباد ہے پی آئی ڈی سی جس کی نگرانی میں یہ کارنامہ سرانجام دیا جا رہا ہے۔ اب توقع کی جا سکتی ہے کہ سابقہ اعلان کے مطابق اگست میں کراچی کے کارخانے گیس کا استعمال کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ یہ گیس پنجاب کو بھی مہیا کی جائے گی۔ اس مطلب کے لئے کوٹ ادو میں بجلی کا کارخانہ قائم کیا جائے گا جو اس گیس سے چلے گا۔ اور سستی بجلی پنجاب کے کارخانوں تک پہنچائے گا۔ ضرورت اس کی ہے کہ پنجاب کو جلد از جلد گیس مہیا کی جائے۔ تاکہ کراچی اور پنجاب کے کارخانوں کی مصنوعات مساوی لاگت میں تیار ہو سکیں اور ملک میں جگہ جگہ ان کا فائدہ پہنچے۔ حکومت کو اس امر کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ گیس کے استعمال کے بعد ...

ملکی مصنوعات کی قیمتیں کم ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو قدرت کے اس بے مثل عطیے کا فائدہ تمام تر چند کارخانہ داروں تک محدود رہے گا اور عوام نئی معاشی مشکلات سے دوچار ہو جائیں گے۔

سکھستان

تقسیم سے پیشتر اور تقسیم کے بعد ماسٹر تارا سنگھ، پاکستان کے متعلق، جن بے خردانہ اور غیر ذمہ دارانہ خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں، ان کے پیش نظر ان کے فرمودات کو سنجیدگی سے دیکھنا خلاف دانشمندی ہے۔ لہٰذا اگر ہم ان کے تازہ بیان کا ذکر ان کالموں میں کر رہے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ماسٹر جی اس عزت افزائی کے قابل ہو گئے ہیں کہ ان کے اس بیان پر سنجیدگی سے غور کیا جائے بلکہ اس سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ مسلمانان پاکستان عبرت حاصل کریں اور حقیقت پسندی کا ثبوت دیں۔ ہماری حکومت نے حکومت ہند سے دوستی کی پینگیں بڑھانے کی ضرورت کیا سمجھی، ہمارے عوام بیا شارہ پاک بالکل آپے سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے جس انداز سے ہندوؤں بالخصوص سکھوں کی، خاطر مدارات کی، اس میں عالی ظرفی سے کہیں زیادہ خود فراموشی پائی جاتی تھی۔ لیکن اگر وہ وفور جذبات سے اندھے ہو رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے "مہمان" بھی اپنے مؤقف دہشت نہاد کو نظر انداز کر چکے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ایک پاکستانی صحافی ماسٹر تارا سنگھ سے ملے۔ اور دوران گفتگو میں ان سے پوچھا کہ سکھوں کا حکومت ہند سے کیا جھگڑا ہے تو انہوں نے سختی سے جواب دیا کہ وہ اس معاملہ کو چھوڑ دیں کیونکہ یہ ان کا گھریلو معاملہ ہے۔ اسی طرح جب اس پاکستانی اخبار نویس نے کشمیر سے متعلق بات کرتے ہوئے کہا کہ اہل کشمیر پاکستان سے الحاق چاہتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ کشمیری ہندوستان کے ساتھ ہیں۔ نیز انہوں نے اخبار نویس کو مشورہ دیا کہ وہ اس خیر سگالی کے زمانے میں ایسی باتیں کرنے سے اجتناب کریں۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ سکھ اس "خیر سگالی کے زمانے میں" بھی پاکستان کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، یہی نہیں، تازہ بیان میں تو ماسٹر صاحب نے کمال ہی کر دیا ہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا ہے کہ راوی کے اس پار کے تیس چالیس گاؤں سکھوں کے حوالے کر دیئے جائیں اور اس کے معاوضہ میں مغربی پاکستان کے گوردواروں سے ملحقہ زمین کو حکومت پاکستان اپنی تحویل میں لے لے۔ گویا بالفاظ دیگر ماسٹر جی پاکستان میں سکھستان بنانا چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے پاکستان سے مزید زمین حاصل کرنے کا مطالبہ ہندو مہاسبھا کی طرف سے ہوا کرتا تھا، اب سکھ بھی اس میدان میں اتر رہے ہیں۔ انہیں یہ جرأت یقیناً اس "عالی ظرفی" اور "فیاضی" سے ہوئی ہے جس کا مظاہرہ مسلمانوں نے اپنے آپ کو بھول کر کیا۔

"آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا"

٭ ٭ ٭ ٭

مشرقی پاکستان سے ہندوؤں کا انخلاء

(چشم دید حالات)

ہم ۱۶ر اپریل اور ۲۳ر اپریل کی اشاعتوں میں اس پروپیگنڈے پر تبصرہ کر چکے ہیں جو ہندوستان میں شد و مد سے کیا جا رہا ہے کہ مشرقی پاکستان کے ہندو بھاگ بھاگ کر ہندوستان آ رہے ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں حکومت پاکستان پر نکتہ چینی بھی کر چکے ہیں کہ اس نے ہندوستانی پروپیگنڈے سے مرعوب ہو کر اپنے اقلیتی وزیر کو ہندوستان کے نائب وزیر امور خارجہ کی معیت میں مشرقی پاکستان کے دورے پر روانہ کر دیا۔ لیکن ان مسلمان مہاجرین کا سوال نہ اٹھایا جو لاکھوں کی تعداد میں پاکستان آ چکے ہیں اور ہر روز کھوکھراپار سے آتے رہتے ہیں۔ ذیل میں ہم معاصر "ٹائمز آف کراچی" کی اس مفصل رپورٹ کا ملخص شائع کرتے ہیں جو اس کے وقائع نگار خصوصی نے مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال کا دورہ کرنے اور تارکین وطن سے ملنے اور تحقیق حال کرنے کے بعد مرتب کی۔ اس رپورٹ سے حقیقت حال بخوبی سامنے آ جاتی ہے۔

(طلوع اسلام)

"ہندوؤں کے ترک پاکستان کا مسئلہ پیچیدہ ہے جس کا حل دونوں ممالک کے وزیروں کے مشترکہ دورے میں نہیں۔ ایک لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ذمہ داری ہندوستان پر عائد ہوتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔ ہندوستان کے نزدیک یہ سیاسی مسئلہ ہے انسانی نہیں، وہاں کے متشدد طبقے اس سے خلاف پاکستان پروپیگنڈے کا جواز نکالتے ہیں۔ پاکستان سے آنے والے ہندو مختلف بلکہ متضاد بیانات دیتے ہیں۔ ڈھاکہ میں وہ کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوئی۔ وہ امن و امان سے رہ رہے تھے لیکن چونکہ اور لوگ جا رہے ہیں، اس لئے وہ بھی جا رہے ہیں۔ مجھے ایسے ہندو بھی ملے جن کے پاس ہندوستان سے یہ خطوط آتے رہتے تھے کہ وہ ہندوستان آ جائیں تو انہیں بحالی کے لئے گراں قدر رقمیں اور مراعات حاصل ہوں گی بلکہ بعض خطوط میں تو ذکر تھا کہ ان کے نام پر ایسی مراعات حاصل کر لی گئی ہیں۔

"کلکتے میں آ کر ان کی کہانی الٹی ہو جایا کرتی تھی۔ میں نے بیسیوں سے باتیں کیں۔ ان میں زیادہ تر یہی کہتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ پاتے تھے۔ بعض سے جب میں نے پوچھا کہ اگر حکومت پاکستان آپ کو پوری مراعات دے، تو کیا آپ واپس چلے جایئے گا تو مجھے جواب ملا۔ نہیں اب واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسے باتیں کرنے کی وجہ تھی۔ وہ لوگ کیمپ میں تھے اور وہاں بحالیات کے کارکن بھی تھے۔ ان کے سامنے وہ اپنے آپ کو مصیبت زدہ ظاہر نہ کریں تو بحالی کے مستحق کیسے ہوں۔ ہندوستانی عوام ان فرضی داستانوں کو صحیح تسلیم کر لیتے ہیں اور اس طرح ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں باہمی بد اعتمادی بڑھتی ہے۔ ہندوؤں کے لئے ایک اور مشکل بھی ہے۔ تقسیم سے پہلے وہ صوبے کی معیشت پر پوری طرح قابض تھے اب ان کا قبضہ ختم ہو رہا ہے اور پاکستان میں مسلمان اپنے آپ میں آ رہے ہیں۔ ہندو اس صورت حال کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا وہ ان اجاروں کی بازیافت کے خواب دیکھتا ہے، جو اسے پہلے حاصل تھے۔

"حکومت ہند کا رویہ بھی ایسا ہے جس سے ترک وطن کو فروغ ہوتا ہے۔ مثلاً ہر چند حکومت کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ تارکین وطن کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی، ترک وطن کا سرکاری سرٹیفکیٹ ہر اس ہندو کو مل جاتا ہے جو اس کی خواہش کرتا ہے۔ اس کے برعکس پاکستان نے ایسے سرٹیفکیٹوں کا سلسلہ ایک عرصہ سے بند کر رکھا ہے۔ حکومت ہند نے ترک وطن کو آسان ہی نہیں بنا دیا بلکہ اسے دلکش بھی بنا دیا ہے۔ پاکستان سے آنے والے ہندوؤں کو کیمپ میں دال بھات بھی ملتی ہے اور فی کس روزانہ پیسے بھی ملتے ہیں، اس طرح ایک متوسط خاندان کے لئے ساٹھ روپے کے لگ بھگ ماہانہ "آمدنی" ہو جاتی ہے۔ بحالی ہونے پر ان کو زمین ملتی ہے اور مکان اور زرعی اور غیر زرعی ضروریات کے لئے مناسب پیسہ بھی ملتا ہے۔

"ذرا غور سے دیکھا جائے تو حکومت تارکین وطن سے فیاضانہ سلوک کرنے پر مجبور ہے۔ یہ لوگ کمیونسٹوں اور دیگر پارٹیوں کے لئے باقاعدہ شکار ہیں۔ اب تک ایسا ہوتا رہا ہے کہ جب وہ کلکتے میں پہنچتے ہیں تو کمیونسٹ، جن سنگھ اور مہاسبھا کے کارکن انہیں باتوں باتوں میں ادھر لاتے ہیں کہ وہ اندرون ملک گاؤں میں آباد ہونے سے انکار کر دیں۔ اور ان کے ساتھ مل کر حکومت کے خلاف مظاہرے کریں اور مطالبہ پیش کریں کہ انہیں شہروں میں بسایا جائے۔ تارکین وطن اکثر اس دام میں پھنس چکے ہیں اور کئی افسوسناک ہنگامے ہو چکے ہیں۔ کمیونسٹ زیادہ گہری چالیں چلتے ہیں۔ ان کے بڑے بڑے لیڈر تو خود وہاں نہیں جاتے تاکہ کوئی شبہ نہ ہو سکے لیکن ان کے عام کارکن آنے والوں کے رشتہ دار بن کر ان سے ملتے اور انہیں ورغلاتے رہتے ہیں۔ حکومت ان فتنوں سے بچنے کے لئے ہر قسم کی قیمت دینے کے لئے تیار ہے۔ وہ وہاں خصوصی مراعات دیتی ہے۔ وہاں اپنے جاسوس بھیج کر آنے والے ہندوؤں کی نگرانی بھی کرتی رہتی ہے تاکہ وہ غلط ہاتھوں میں نہ پڑ جائیں۔

"ترک پاکستان کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ مشرقی پاکستان سے ہندو لیڈر ہندوستان آ گئے ہیں مگر وہ اپنا مقام پیدا نہیں کر سکے ان کی کوشش یہ رہتی ہے کہ ان کے متبع بھی ہندوستان آ جائیں اسی طرح کمیونسٹ بھی اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ ان کے ہم خیال زیادہ سے زیادہ آتے رہیں۔ تاکہ حکومت ہند کی مشکلات میں اضافہ

(باقی صفحہ ۔۔)

تاریخی شواہد

(۱۴)

(۲) کتابِ پیدائش کے مذکورہ صدر بیان، نیز اس کے دیگر بیانات سے ظاہر ہے کہ تورات کی رو سے طوفانِ نوح عالمگیر حیثیت رکھتا تھا کیونکہ خدا نے یہ کہا تھا کہ صفحۂ ارض پر جس قدر ذی روح موجود ہیں وہ ان سب کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ اس طوفان کی عالمگیریت کا نظریہ تاریخی تحقیقات کے سامنے نہیں ٹھہر سکا۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایتھکس کا مضمون نگار عنوان "طوفان" (Deluge) کے تحت لکھتا ہے کہ

> ایک عالمگیر طوفان کا عقیدہ اربابِ تحقیق و خبر کے نزدیک بالکل مرفوع القلم ہے۔

اس کے برعکس (جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں) قرآن کریم سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ طوفان صرف قومِ نوح کے علاقے میں آیا تھا نہ کہ ساری دنیا پر اور یہ وہ حقیقت ہے جس کی تائید تاریخی شواہد اور اثری انکشافات سے ہوتی جا رہی ہے

(۳) تیسرا اہم نقطہ پسرِ حضرت نوح کا واقعہ ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں بتایا گیا ہے کہ اس کے غیر صالح اعمال اسے کس طرح لے ڈوبے اور نبی کا نسبی تعلق بھی اسے مکافاتِ عمل سے نہ بچا سکا اور وہ "اپنا" ہوتے ہوئے کیسے غیر بن گیا۔ لیکن اب دیکھئے کہ بائبل میں پسرِ نوح کا واقعہ کن الفاظ میں مذکور ہے۔ کتابِ پیدائش کے نویں باب میں ہے۔

> اور نوح کھیتی باڑی کرنے لگا اور اس نے ایک انگور کا باغ لگایا۔ اور اس کی مے پی کر نشے میں آیا اور اپنے ڈیرے کے اندر آپ کو ننگا کیا۔ اور کنعان کے باپ حام نے اپنے باپ کو ننگا دیکھا اور اپنے دو بھائیوں کو جو باہر تھے خبر دی۔ تب سم اور یافث نے ایک کپڑا لیا اور اپنے دونوں کاندھوں پر دھرا اور پچھلے پاؤں جا کے اپنے باپ کی برہنگی کو چھپایا۔ پر ان کی پیٹھ اس کی طرف تھی کہ انہوں نے اپنے باپ کی برہنگی کو نہ دیکھا۔ جب نوح اپنے نشہ سے ہوش میں آیا تو جو اس کے چھوٹے بیٹے نے اس کے ساتھ کیا تھا معلوم کیا۔ تب وہ بولا کہ کنعان ملعون ہو۔ وہ اپنے بھائیوں کے غلاموں کا غلام ہوگا۔ پھر بولا کہ خداوند سم کا خدا مبارک اور کنعان اس کا غلام ہوگا۔ خدا یافث کو پھیلائے اور وہ سم کے ڈیروں میں رہے اور کنعان اس کا غلام ہو۔ (کتابِ پیدائش ۹ / ۲۰-۲۷)

یہاں تین چیزیں قابلِ غور ہیں۔ اول حام کا قصور یہ بتایا گیا ہے کہ اس نے اپنے باپ کا ستر دیکھ لیا۔ لیکن اس کی سزا کا کچھ ذکر نہیں دوسرے یہ کہ قصور حام کا ہے لیکن لعنت اور پھٹکار کا سزاوار اس کا بیٹا قرار دیا جاتا ہے۔ اور تیسری (اور سب سے اہم) شق یہ کہ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خدا کے ایک برگزیدہ رسول کو ایک ایسی ہیئت میں پیش کیا گیا ہے جس سے سعید فطرت کا تصور بھی کانپ اٹھے۔ اس کے برعکس قرآن کریم نے حضرت نوح کی جس مقدس سیرت کو پیش کیا ہے اس سے ان کی رفعتِ مرتبت اور علوِ درجت درخشندہ و تابناک صورت میں آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ حضرت نوح خدا کے برگزیدہ بندے تھے۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ
وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۳ / ۳۳)

بلاشبہ (یہ واقعہ ہے کہ) اللہ نے آدم اور نوح کو، اور ابراہیم اور عمران کے گھرانوں کو تمام دنیا میں برگزیدگی عطا فرمائی۔

وہ عبد شاکر تھے۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝ (۱۷ / ۳)

تم ان لوگوں کی نسل ہو جنہیں ہم نے (طوفان کی ہلاکت سے نجات دی تھی اور) نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کرایا تھا۔ اور وہ ہمارا ایسا بندہ تھا جس کی سعی و عمل حسن نتائج سے بھرپور ہوئے تھے۔

خدا کے مومنین کی جماعت میں سے تھے۔

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ۝ۡ وَنَجَّيْنٰهُ
وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۝ۡ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ
هُمُ الْبٰقِيْنَ ۝ۡ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ۡ
سَلٰمٌ عَلٰي نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنَّا كَذٰلِكَ
نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(۳۷ / ۷۵-۸۱)

اور یقیناً نوح نے ہمیں پکارا۔ سو ہم کیسے اچھے پکار کا جواب دینے والے ہیں۔ اور ہم نے اسے اور اس کے پیرووں کو کربِ عظیم سے نجات دی، اور اس کی نسل کو ہی باقی رہنے والوں میں رکھا۔ اور آنے والوں میں اس کا (نیک نام) باقی رکھا۔ نوح پر اقوامِ عالم میں سلام ہو۔ اس طرح ہم مخلص بندوں کو جزا دیا کرتے ہیں۔ وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔

وہ حضرت ابراہیم کی طرح خدا کے رسول تھے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ
ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ
وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ (۵۷ / ۲۶)

اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو رسول بنا کر بھیجا۔ اور ان کی نسل میں نبوت اور کتاب کو جاری رکھا۔ سو ان (کی ذریت) میں سے ہدایت پر بھی ہیں اور اکثر ان میں سے فاسق ہیں۔

خدا نے ان کی پکار کو سنا اور اسے شرفِ قبولیت سے نوازا۔

وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ
وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۝ۚ (۲۱ / ۷۶)

اور (اسی طرح) نوح کا معاملہ (بھی یاد کرو) جو ان (نبیوں) سے پیشتر کا ہے، جب اس نے ہمیں پکارا تھا (تو دیکھو) ہم نے اس کی پکار سن لی اور اسے اور اس کے گھرانے کو ایک بڑی ہی سختی سے نجات دیدی۔

اور یہ اس لئے کہ آپ احکاماتِ الٰہیہ کے سچے فرمانبردار، پیکرِ تسلیم و رضا اور مظہرِ اطاعت و انقیاد تھے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ
يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَي اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ
وَشُرَكَاۗءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ
غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ۝ فَاِنْ
تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ اَجْرِيَ
اِلَّا عَلَي اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝
فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ
وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰۗىِٕفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝

(۱۰ / ۷۱-۷۳)

اور (اے پیغمبر) انہیں نوح کا حال سناؤ۔ جب ایسا ہوا تھا کہ اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اے میری قوم! اگر تم پر یہ بات شاق گذرتی ہے کہ میں تم میں (دعوت و ہدایت کے لئے) کھڑا ہوں اور اللہ کی نشانیوں کے ساتھ پند و نصیحت کرتا ہوں، تو میرا بھروسہ صرف اللہ پر ہے۔ تم میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو اسے ٹھان لو۔ اور اپنے شریکوں کو بھی ساتھ لے لو۔ پھر جو کچھ تمہارا منصوبہ ہو اسے اچھی طرح سمجھ بوجھ لو کہ کوئی پہلو تمہاری نظر سے نہ رہ جائے۔ پھر میرے خلاف جو کچھ کرنا ہے کر گزرو اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو (اور دیکھو آخر کار کیا نتیجہ نکلتا ہے؟) پھر اگر اس پر بھی تم باز نہ آئے اور (مجھ سے روگردانی کی تو یاد رکھو) اپنا ہی (نقصان کروگے) میں جو کچھ کر رہا ہوں اس کے لئے تم سے کسی مزدوری کا طلبگار نہیں ہوں۔ میرا اجر تو اللہ کے سوا اور کسی کے پاس نہیں ہے مجھے (اسی کی طرف سے) حکم دیا گیا ہے کہ اس کے فرمانبردار بندوں کے گروہ میں شامل رہوں!"

اس پر بھی لوگوں نے اسے جھٹلایا۔ پس ہم نے اسے اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ کشتی میں سوار تھے (طوفان سے) بچا لیا اور (غرق شدہ قوم کا) جانشین بنایا۔ اور جن لوگوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائی تھیں ان سب کو غرق کر دیا۔ تو دیکھو ان لوگوں کا حشر کیسا ہوا جو (انکار و سرکشی کے نتائج سے) خبردار کر دیئے گئے تھے۔

اسلامی معاشرت
قیمت دو روپے

عورت کا قرآن

(۱۱)

(۱) وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓی
اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا
عَمِلُوْا (سبا ۵ع)

اور تمہارے اموال و اولاد ایسی چیز نہیں کہ تم کو درجہ میں ہمارے نزدیک مقرب بنا دیں۔ ہاں مگر جو ایمان لائے اور اچھے کام کرے سو ایسے لوگوں کے لئے اُن کے عمل کا دوگنا صلہ ہے۔

(۲) اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ
مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓئِكَ یَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ۝
وَلَیْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓی اِذَا حَضَرَ
اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ
وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝ (نساء ۳ع)

اللہ تعالیٰ نے انہی لوگوں کی توبہ قبول کر لینے کا ذمہ لیا ہے۔ جو نادانی اور بے خبری میں کوئی برائی کی بات کر بیٹھتے ہیں۔ اور پھر فوراً اس پر پشیمان ہو کر توبہ کر لیتے ہیں۔ سو ایسے لوگوں پر تو اللہ ضرور توجہ کرتا ہے اور اللہ بڑا علیم و حکیم ہے۔ لیکن ان لوگوں کی توبہ توبہ نہیں ہے جو ساری عمر تو برائیاں کرتے رہے لیکن جب اُن کے سامنے موت آ کھڑی ہوئی تو کہنے لگے کہ "اب میں توبہ کرتا ہوں"۔ اسی طرح ان لوگوں کی بھی توبہ، توبہ نہیں ہے جو کفر کی حالت میں مر جاتے ہیں۔ ایسے تمام لوگوں کے لئے ہم نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

(۳) وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ
وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۗ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ
مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ
صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝
(بقرہ رکوع ۱۹)

اور یاد رکھو یہ ضرور ہوتا ہے کہ ہم تمہیں مختلف حالات میں اُلٹ پلٹ کر پختگی تک پہنچائیں۔ خطرات کا خوف، بھوک پیاس کی تکلیف، جان اور مال کا نقصان، پیداوار کی تباہی، وہ مختلف حالات ہیں جو تمہیں پیش آئیں گے۔ پھر جو لوگ ان مصیبتوں پر صبر کرنے والے ہیں، انہیں فتح و کامرانی کی بشارت دیدو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان پر کوئی مصیبت آ پڑتی ہے تو اُن کی زبان سے صرف یہی نکلتا ہے کہ "ہماری زندگی خدا کے قانون ہی کی سرفرازی کے لئے ہے اور ہمارا ہر قدم اسی قانون کے مطابق اُٹھتا ہے۔ سو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کے الطاف و کرم ہیں اور جن پر اس کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ اور یہی ہیں جو اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔

(۴) اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (نساء ۱۵ع)

بلاشبہ نظام صلوٰۃ، مسلمانوں کے ذمے ایک مقررہ قانون کی پابندی کا نام ہے۔

(۵) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا
وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ
وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ۭ وَاِنْ
كُنْتُمْ مَّرْضٰٓی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ
اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا
فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَیْدِیْكُمْ مِّنْهُ ۭ مَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیَجْعَلَ
عَلَیْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَهِّرَكُمْ وَلِیُتِمَّ نِعْمَتَهٗ
عَلَیْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (مائدہ ۲ع)

اے مسلمانو! جب تم صلوٰۃ کے وقتی اجتماعات کے لئے کھڑے ہو تو چاہیئے کہ اپنا منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھو لیا کرو اور سر کا مسح کر لو۔ اور اپنے دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔

اور اگر حاجت غسل ہے تو پھر نہا کے پاک صاف ہو جاؤ۔

اور اگر بیمار ہو (پانی کا استعمال مضر ہو) یا سفر کر رہے ہو (کہ پانی کی تلاش دشوار ہو) یا ایسا ہو کہ تم میں سے کوئی جائے ضرورت سے ہو کر آیا ہو، یا تم عورت سے ملے ہو، اور پھر تم کو پانی میسر نہ آئے، تو اس حالت میں تم کو چاہیئے کہ پاک مٹی سے تیمم کر لیا کرو اس طرح کہ اپنے منہ اور ہاتھوں پر مسح کر لو۔ اللہ یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ تمہیں کسی طرح کی مشقت میں ڈالے بلکہ اللہ کو صرف یہ منظور ہے کہ تمہیں پاک صاف رکھے اور تم کو شائستہ بنا کر تم پر اپنی نعمت پوری کر دے تاکہ "تمہیں تمہاری مساعی کے بھرپور نتائج حاصل ہو سکیں۔

(۶) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا
اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ ۝
(حجرات ۱ع)

اے مسلمانو! اگر کوئی شریر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو پہلے خوب اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو۔ تاکہ کبھی کسی کو ناواقفی سے کوئی نقصان ایسا نہ پہنچا دو کہ بعد میں تمہیں اپنے کئے پر پچھتانا پڑے۔

(۷) وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِیْنٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِیْمٍ ۝ مَّنَّاعٍ
لِّلْخَیْرِ مُعْتَدٍ اَثِیْمٍ ۝ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِیْمٍ ۝ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ
وَّبَنِیْنَ ۝ (قلم رکوع ۱)

اور کسی ایسے شخص کا کہنا نہ مانا کرو جو بہت قسمیں کھانے والا ہو۔ بے وقعت ہو۔ دوسروں کو طعنے دینے والا ہو۔ چغلیاں کھاتا پھرتا ہو۔ نیک کاموں میں کھنڈت ڈالنے والا ہو۔ حد سے گزر جانے والا ہو۔ یا تھک کر پیچھے رہ جانے والا ہو۔ سخت مزاج ہو۔ اور ان سب سے علاوہ یہ کہ بدنسب بھی ہو، محض اس سبب سے کہ وہ بہت مال اور اولاد والا ہے۔

(۸) وَیْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۙ ۝ الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ یَحْسَبُ
اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝ كَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ
مَا الْحُطَمَةُ ۝ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى
الْاَفْئِدَةِ ۝ (الھمزہ ۱ع)

پھٹکار ہے اس پر جو پیٹھ پیچھے عیب نکالنے والا ہو یا دو دو طعنے دینے والا ہو۔ جو مال کو جمع کر کے رکھتا ہو اور اسے گنتا رہتا ہو۔ (اور مفاد عامہ کے لئے اسے کھلا نہ چھوڑ دیتا ہو) کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا یہ مال اسے حیات جاودانی بخش دے گا۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ واللہ وہ شخص حُطمہ میں ڈالا جائے گا اور جانتے ہو "حُطمہ" کیا ہے؟ وہ ایسی خوفناک آگ ہے جو جھکتی ہوئی دلوں تک پہنچ جانے والی ہے۔

نوٹ۔ طلوع اسلام مورخہ ۲۶ مارچ ۱۹۵۵ء تک کتاب "عورت کا قرآن" کا پیش لفظ شائع ہوا تھا۔ اور ۲ اپریل ۱۹۵۵ء سے اصل کتاب شروع ہو گئی ہے۔ ناظرین نوٹ فرمالیں۔

اسلام کی سرگزشت

گذشتہ اشاعتوں میں جزیرہ عرب اور عربوں کے دیگر ممالک و اقوام کے ساتھ دینی، تجارتی اور ثقافتی تعلقات کا تذکرہ آچکا ہے۔ زیر نظر صحبت میں گذشتہ اشاعت کے تسلسل میں عربوں کے اندر نصرانیت کے فروغ سے بحث کی گئی ہے۔

حتیٰ کہ ایرانیوں نے یمن کے شہروں پر حملہ کرکے انھیں فتح کرلیا اور حبشیوں کو وہاں سے نکال بھگایا۔ نجران میں نصرانیت کا چراغ حضرت عمرؓ کے عہد تک جلتا رہا۔ تاآنکہ حضرت عمرؓ نے ان کو جلاوطن کردیا، اور ان کی اکثریت عراق کی طرف چلی گئی۔

مسیحیت نے بھی اپنی تعلیمات عربوں میں پھیلائیں انھوں نے عربوں میں ایسے لوگ پیدا کردیئے، جن کا میلان رہبانیت کی طرف تھا، اور وہ خانقاہیں بناکر تارک الدنیا ہوجاتے تھے، مورخین کا بیان ہے کہ حنظلہ طائی اپنی قوم سے الگ ہوکر زاہد بن گیا تھا۔ اس نے فرات کے کنارے قریب ایک خانقاہ بنائی تھی جو اکبر حنظلہ کے نام سے مشہور تھی۔ وہ مرتے دم تک اس میں راہب بن کر رہا۔

مورخین ہی یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ قس بن ساعدہ کھلے میدانوں میں زندگی بسر کرتا تھا۔ کوئی مکان اس کے سر پر سایہ انداز نہیں تھا، کچھ غذا کے طور پر پی لیا کرتا تھا۔ وحشی جانوروں اور حشرات الارض سے اس کو انس تھا۔ وہی لوگ کہتے ہیں کہ امیہ ابن ابی الصلت نے بہت سی کتابیں دیکھی اور پڑھی تھیں۔ اس نے زہد میں ٹاٹ پہننا شروع کردیا تھا۔ انہی لوگوں کا یہ بھی بیان ہے کہ عدی بن زید نعمان شاہ حیرہ کو نصیحت کرتا رہا۔ تاآنکہ نصرانیت کو وہ پسند کرنے لگا۔ اور اپنا تاج سر سے اتار دیا اور شاہی پوشاک اتار کر عدی بن زید کی طرح ٹاٹ کے کپڑے پہن لئے اور دونوں پہاڑوں میں خدا کی عبادت کرتے رہے۔ حتیٰ کہ اسی حالت میں نعمان کا انتقال ہوگیا ——— ۲ اغانی نے بیان کیا ہے کہ یحییٰ بن متیٰ یعنی اعشیٰ کے راوی نے جو نصرانی عبادی تھا کہا ہے کہ اعشیٰ قدری تھا۔ اور لبید اس کے برعکس مثبت تھا۔ چنانچہ لبید نے یہ مشہور کیا تھا کہ خدا جسے بھلائی کے راستوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ وہ مطمئن قلب کے ساتھ راہ پالیتا ہے۔ اور جب خدا چاہتا ہے گمراہ کردیتا ہے۔ تو اعشیٰ نے اس کے جواب میں یہ شعر کہا تھا: خدا نے تو وفا اور عدل کو اختیار کرلیا ہے اور ملامت خود آدمی کے حوالے کردی ہے۔ میں نے پوچھا کہ اعشیٰ نے اپنا یہ مذہب کہاں سے لیا تھا؟ تو اس نے بتایا کہ فرقہ عبادیین یعنی حیرہ کے نصاریٰ کی طرف سے لیا تھا۔ وہ ان کے پاس شراب خریدنے جایا کرتا تھا اور انھوں نے اس کو یہ تعلیم دی تھی۔ صفحہ ۷۹ نمبر ۱۲۳ ———

عیسائی اور راہب عرب کے میلوں میں آتے، لوگوں کو نصیحت کرتے اور بشارتیں دیا کرتے تھے، حشر و نشر، حساب و کتاب، جنت اور دوزخ کے تذکرے کرتے تھے۔ قرآن کریم میں بہت سی ایسی آیات ہیں جن میں ان کے اقوال کو نقل کرکے ان کے مذاہب کا ابطال کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعلیمات ان کے درمیان اچھی طرح پھیل چکی تھیں۔

ان نصاریٰ کے شعراء بھی تھے۔ مثلاً قس بن ساعدہ، امیہ بن ابی الصلت اور عدی بن زید وغیرہ۔ اپنے اشعار میں ان کا ایک خاص انداز ہوتا تھا جس پر ان کے دین کی مہر ہوتی تھی، ان کے اشعار ان کی دینی تعلیمات سے متاثر ہوتے تھے۔ یہ لوگ دنیا اور دنیوی حالات سے بے رغبتی کا سبق دیتے تھے۔ کون و فساد پر غور و فکر کی دعوت دیتے اور حوادث ارضی و سماوی سے عبرت حاصل کرنے کا درس دیتے تھے، عربی زندگی میں اکثر ان کے اشعار کی پیروی کی گئی اور محکم پیروی کی گئی۔ حتے کہ ان اشعار کی یہ پیروی ان کے بنیادی منہاج کی طرف ہماری راہنمائی کردیتی ہے

ان عرب نصاریٰ نے عربی زبان میں بہت سے ایسے الفاظ اور تراکیب داخل کردیں۔ جنھیں عرب اس سے پہلے نہیں جانتے تھے چنانچہ اہل لغت بیان کرتے ہیں کہ امیہ بن ابی الصلت ہی نے عربوں کو "باسمک اللّٰھم" کہنا سکھایا تھا۔ اور قس بن ساعدہ ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے "اما بعد" پہلے پہل بولا تھا۔ امیہ اپنے اشعار میں ایسے مجہول الفاظ بکثرت استعمال کرتا تھا۔ جنھیں اہل عرب نہیں سمجھتے تھے۔ یہ الفاظ وہ پرانی کتابوں سے لیتا تھا۔ چنانچہ اس کا ایک مصرعہ ہے۔

قَمَرٌ وَسَاھُوْرٌ یُسَلُّ وَ یُغْمَدُ

(چاند اور سورج برہنہ کردیئے جاتے ہیں اور نیام میں کردیئے جاتے ہیں)

وہ اللہ کا نام "سلطیط" اور ایک دوسرے مقام پر تغرور رکھتا ہے۔

مزید برآں نصرانیت بھی جزیرہ عرب میں داخل ہونے سے پیشتر اپنی آغوش میں یونانی ثقافت کو اس طرح لئے ہوئے تھی جیسا کہ یہودیت لئے ہوئے تھی۔ نصرانیت ان ادیان میں سے ایک تھی جو مشرق میں پیدا ہوئے اور رومانی سلطنت میں جو یونانی ثقافت کا گہوارہ تھی ——— پروان چڑھے تھے۔ اسکندریہ جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں دین کے فلسفہ کے ساتھ امتزاج کا جغرافیائی مرکز تھا۔ مسیحی ابتدائی عہد میں آباء کنیسہ میں سے بیشتر مذہبی مقتدا بننے سے پہلے خود فلسفی ہوتے تھے۔ کیونکہ ان کے لئے ضروری ہوتا تھا کہ وہ اپنی اور اپنے عقائد کی تائید برتری کے مقابلہ میں ثابت کریں اس لئے وہ فلسفہ کی پناہ لیتے تھے، تاکہ تعلیل و برہان میں اس سے مدد حاصل کرسکیں۔ اس طرح نصرانیت میں ارسطو اور افلاطون کا فلسفہ آہستہ آہستہ سرایت کرتا چلا گیا۔ یونانی اکیڈیمیوں کے نمونہ پر لاہوتی مدارس کے قائم کرنے میں جو یونانی فلسفہ سے متاثر ہوتے تھے، مشرق ممتاز رہا ہے۔ ان میں سے مشہور ترین مدرسہ اسکندریہ کا تھا جو تیسری صدی کے شروع میں تھا۔ ملکیون نے ۳۲۰ء میں ایک دوسرا مدرسہ انطاکیہ میں قائم کیا۔ اور ۲۹۰ء میں ایک تیسرا مدرسہ نصیبین قائم کیا جاچکا تھا۔ ان مدرسوں میں سریانی اور یونانی دونوں زبانوں کی ایک ساتھ تعلیم دی جاتی تھی۔

نسطوری فرقہ کے لوگ خصوصیت سے یونانی علم سے زیادہ لگاؤ رکھتے تھے۔ انھوں نے بکثرت لاہوتی اور فلسفی کتابوں کا یونانی زبان میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ یہ لوگ طب اور علوم طبیعیہ میں بھی ایسے ہی مشہور ہوتے تھے۔ نسطوری فرقہ کے مذہبی پیشوا ایران میں طبیب بھی ہوا کرتے تھے۔ ان میں سے بہت سے لوگ حیرہ میں بھی پھیلے ہوئے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ حیرہ کے ضعف و اضمحلال اور ان اطراف میں اسلام پھیل جانے کے بعد اسلام میں جن شہروں نے علم کے جھنڈے بلند کئے ہیں۔ ان میں "بصرہ اور کوفہ" کا نام سر فہرست ہے۔ کیونکہ یہی دونوں شہر حیرہ کے پڑوسی تھے۔ وہ ابتدائی کتابیں جن سے یونانی ثقافت کو پھیلانے میں مدد لی گئی تھی وہ سریانی زبان میں لکھی ہوئی تھیں۔ اور انہی نسطوری مدارس کا ترکہ تھیں۔ عموماً یہی نسطوری علماء یونان اور عربوں کے درمیان باہمی نقطۂ اتصال تھے۔

یہی تینوں چیزیں۔ یعنی تجارت۔ سرحدات پر قائم شدہ مدنیتیں اور سلطنتیں۔ اور یہودیت و نصرانیت، عربوں میں آس پاس کی دیگر مدنیتوں اور تہذیبوں کے پھیلنے اور اثر و نفوذ حاصل کرنے کا ذریعہ تھیں۔ ہمدانی نے اپنی کتاب "الوشی المرقوم" میں لکھا ہے کہ رومیوں اور عجمیوں کے واقعات جہاں بھی پہنچے، عربوں ہی کے ذریعہ سے پہنچے، کیونکہ جو لوگ مکہ میں بود و باش رکھتے تھے۔ وہ قدیم عربوں اور اہل کتاب کے واقعات سے بخوبی واقف تھے۔ یہ لوگ مختلف ممالک میں تجارت کے لئے جاتے تھے اور لوگوں کی خبریں دریافت کرتے تھے ایسے ہی جو لوگ حیرہ میں سکونت رکھتے اور عجمیوں کے ساتھ اختلاط رکھتے تھے۔ انھیں ان کے واقعات اور حیرہ کے تاریخی حوادث اور دیگر ممالک سے ان کا سلوک معلوم ہوتا تھا۔ پھر جو عرب شام میں آباد تھے۔ وہ روم۔ بنی اسرائیل اور یونان کے وقائع سے کما حقہٗ واقفیت رکھتے تھے، پھر جو عرب بحرین اور عمان میں آباد تھے ان کے ذریعہ سے سندھ اور ایران کی خبریں ہم تک پہنچیں، ایسے ہی جو لوگ یمن کے باشندے بنے ہوئے تھے وہ تقریباً تمام قوموں کے واقعات کا علم رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ لوگ آتے جاتے بادشاہوں کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے آئے تھے۔" مگر ان عربوں کی یہ واقفیت پوری پوری واقفیت نہیں تھی۔ یہ مدنیتیں بڑے ہی تنگ راستے سے ان کی طرف سرایت کرتی تھیں جو چیزیں وہ دوسرے لوگوں سے نقل کرتے تھے ان میں اکثر تحریف بھی واقع ہوجاتی تھی۔

نقد و نظر

سنت خیرالانام

آپ نے کسی میلے یا جلسے میں کبھی بھگدڑ مچتے دیکھی ہے؟

آپ کو معلوم ہے کہ بھگدڑ مچا کیسے کرتی ہے؟ نہایت آسان طریقے سے۔ ایک شخص کے دل میں شرارت اٹھتی ہے یا وہ اپنے کسی مقصد کی خاطر جلسے میں انتشار پیدا کرنا چاہتا ہے۔ تو وہ یک دم پکار اٹھتا ہے۔ سانپ! اور اس کے ساتھ ہی بھاگ اٹھتا ہے۔ بس اس کے بعد، چاروں طرف سے سانپ، سانپ کی آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں اور لوگ دیوانہ وار بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس بھگدڑ میں کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہوتا۔ بس سانپ سانپ کا شور ہوتا ہے اور بھاگا بھاگی۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ سانپ کہاں ہے؟ کس نے دیکھا ہے؟ وہ کدھر گیا ہے؟ منتظمین جلسہ ہزار چلائیں کہ ٹھہرو! سانپ کہیں نہیں۔ لیکن ان کی کوئی نہیں سنتا۔ ہمارے ہاں کچھ عرصہ سے بدقسمتی سے اسی قسم کی بھگدڑ سارے ملک میں مچ رہی ہے۔ ہر شخص سانپ، سانپ پکارے اور انتشار میں اضافہ کئے جا رہا ہے۔ بھگدڑ مچانے والے خوش ہیں کہ ان کا تیر خوب نشانے پر جا کر لگا۔

جیسا کہ سب کو معلوم ہے، جماعت اسلامی تحریک پاکستان کے سخت ترین مخالفین میں تھی۔ تشکیل پاکستان کے بعد وہ اپنی مشئوم عزائم کو اپنے سینوں میں لئے یہاں آپہنچی اور مذہب کی آڑ میں ملک میں انتشار پیدا کرنا شروع کر دیا۔ طلوع اسلام ان کے ان عزائم سے تقسیم ہند سے پہلے سے واقف تھا۔ اس نے اس دشمن دین و مملکت جماعت کے عزائم سے لوگوں کو آگاہ کرنا شروع کیا۔ ان کے پاس طلوع اسلام کے پیش کردہ حقائق کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے سوچا کہ ملک میں بھگدڑ مچاؤ۔ اس کے لئے انہوں نے شور مچایا کہ اسلام خطرے میں ہے۔ سنت رسول اللہ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) مٹائی جا رہی ہے۔ ذات رسالتمآب کی (رخاکم بدہن) توہین ہو رہی ہے۔ اور یہ سب کچھ کس طرف سے ہو رہا ہے؟ طلوع اسلام کی طرف سے! اس کے بعد پھر کیا تھا؟ چاروں طرف سے شور اٹھنا شروع ہو گیا اور لوگ بے تحاشا بھاگنے لگ گئے۔ چنانچہ اب حالت یہ ہے کہ جلسوں پر جلسے ہو رہے ہیں۔ ریزولیوشن پاس ہو رہے ہیں۔ ایجی ٹیشنز اٹھائی جا رہی ہیں۔ مضامین لکھے جا رہے ہیں پمفلٹ بانٹے جا رہے ہیں۔ کتابوں پر کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ جن میں گالیوں کی بھرمار ہے۔ بد زبانیوں کا طوفان ہے بہتان تراشیوں اور تہمت طرازیوں کا سیلاب ہے۔ لیکن کوئی ٹھہرا ہو کر اتنا نہیں پوچھتا کہ طلوع اسلام نے کونسی بات ایسی کی ہے جس سے (معاذ اللہ) سنت رسول اللہ مٹ رہی ہے اور اس میں کونسا فقرہ ایسا شائع ہوا ہے جس سے (پناہ بخدا) ذات رسالتمآب کی توہین ہوتی ہے۔ نہ کوئی اتنا سوچتا ہے۔ نہ طلوع اسلام سے پوچھنے کی زحمت گوارا کرتا ہے۔۔ لیکن بھگدڑ ہے کہ بدستور مچے چلی جا رہی ہے۔ اور جماعت اسلامی والے خوش ہیں کہ لوگوں کی توجہ دوسری طرف ہٹ گئی اور انہیں اپنی تخریبی کارروائیوں کے لئے کھلا میدان مل گیا۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے یہ کتاب جو اس وقت ہمارے زیر نظر ہے۔ اس کے مؤلف ہیں صاحبزادہ کرم شاہ بی۔ اے فاضل جامعہ ازہر۔ قاہرہ۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ آپ آستانۂ عالیہ، سیال شریف (پنجاب) کے متوسلین میں سے ہیں۔ کتاب کے مقدمہ میں اگرچہ اس قسم کے الفاظ ملتے ہیں کہ۔ منکرین سنت کے اس گروہ کو مکروفریب کی بے پناہ قوتوں کے باوجود عنقریب ہی پتہ چل جائے گا کہ ...... " لیکن اصل کتاب میں بالعموم سلامت روی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا گیا۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ مؤلف نے اسے جذبۂ صادقہ کے ساتھ لکھا ہے۔ کتاب کا انداز یہ ہے کہ شروع میں اطاعت رسول کی اہمیت اور وجوب کو ثابت کیا گیا ہے۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ یہ اطاعت، سنت رسول اللہ کے اتباع سے ہو گی۔ اور سنت رسول اللہ، احادیث کے اندر ملے گی۔ جامعین احادیث نے جمع و تدوین حدیث میں بڑی محنت و کاوش سے کام لیا ہے۔ پھر کتب احادیث کا اجمالی سا تذکرہ ہے۔ آخر میں ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو بعض احادیث پر عائد ہوتے ہیں۔ کتاب ۸۰ ، ۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت، طباعت اچھی ہے۔ اور قیمت بلا جلد دو روپے آٹھ آنے ہے۔ ملنے کا پتہ۔ صوفی خدا بخش صاحب۔ سیکرٹری مرکزی حیذ اللہ۔ بھیرہ۔ (پنجاب)

ہم اس جواں بخت و جواں سال مؤلف کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر وہ کتاب کی تالیف سے پہلے اصل مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو جو کام ان کی یہ تین سو صفحات کی کتاب نہیں کر سکی وہ شاید ان کا تین صفحے کا مضمون کر دیتا۔ جہاں تک سنت رسول اللہ کا تعلق ہے۔ طلوع اسلام کے ٹائیٹل کے صفحے پر "مسلک اور مقصد" کا جو بلاک چھپتا ہے، اس میں چوتھی شق یہ ہے:

> حضور نبی اکرم انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے۔ لیکن عجمی سازشوں نے ہماری تاریخ میں ایسی چیزیں شامل کر رکھی ہیں جن سے حضور کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں۔
>
> حضور کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس بات سے محترم مؤلف کو بھی انکار نہیں ہوگا۔ اب رہی اس اجمال کی تفصیل۔ سو اس کے لئے پرویز صاحب کی ضخیم کتاب "معراج انسانیت" دیکھی جا سکتی ہے۔ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ سیرت نبی اکرم پر اس سے بہتر کتاب شاید ہی لکھی گئی ہو۔ جہاں تک عبادات اور ارکان اسلام کا تعلق ہے۔ طلوع اسلام کی تلقین یہ ہے کہ بجائے موجودہ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے طریقے کے مطابق نماز پڑھ لینی چاہیئے اور کسی نئے طریقہ کو وضع کرکے ملت میں مزید انتشار کا موجب نہیں بننا چاہیئے۔ یہی صورت دین کے دیگر ارکان کی ہے" (طلوع اسلام بابت ۵ جولائی صفحہ ۱۰) یہ ہے وہ طلوع اسلام جس کے متعلق شور مچایا جا رہا ہے کہ یہ سنت رسول اللہ کو (معاذ اللہ) مٹا رہا ہے اور (رخاکم بدہن) رسول اللہ کی توہین کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اگر محترم مؤلف ذرا اتنا ہی دیکھ لیتے تو ان کے لئے بات سمجھنے میں آسانی ہو جاتی۔

اب دیکھئے کہ وہ بات کیا ہے جسے طلوع اسلام نے پیش کیا ہے۔ طلوع اسلام نے سوال یہ اٹھایا تھا کہ

> اگر کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ دونوں خدا کی وحی تھیں۔ دونوں کی اطاعت تمام مسلمانوں کے لئے ابدالآباد تک کیلئے فرض تھی۔ اگر دین ان دونوں کے مجموعہ سے مکمل ہوتا تھا۔ تو جہاں رسول اللہ نے قرآن ایک جامع شکل میں محفوظ کر کے امت کو دیا، وہاں حضور نے اپنی احادیث مقدسہ کا ایک مستند مجموعہ امت کو کیوں نہ دیا تاکہ اس میں کسی کو شک و شبہ ہی نہ رہتا کہ رسول اللہ کی سنت کیا ہے اور ہمیں کس چیز کی اطاعت کرنی ہے۔

یہ ایک خالص علمی اور دینی سوال تھا جسے طلوع اسلام نے قوم کے تمام علماء کی خدمت میں پیش کیا۔ اس کا جواب تو آج تک کسی نے دیا نہیں لیکن طلوع اسلام پر گالیوں کی بوچھاڑ چاروں طرف سے شروع ہو گئی۔

دوسرا سوال طلوع اسلام نے یہ پیش کیا تھا کہ

> اگر رسول اللہ کے ارشادات وحی خداوندی تھے اور قیامت تک کے لئے غیر متبدل رہنے تھے تو خلفائے راشدین (بالخصوص حضرت عمرؓ) نے ان میں سے بعض میں تبدیلیاں کیوں کیں اور اضافے کیوں فرمائے؟

اس کا اعتراف تو ہر ایک نے کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایسا کیا تھا لیکن اس سوال کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ پھر طلوع اسلام نے یہ سوال پیش کیا تھا کہ

> آج جبکہ حالت یہ ہے کہ حدیث کی صحیح ترین کتابوں کے متعلق، خود حدیث کو ماننے والے ذمہ دار حضرات تک کو بھی اعتراف ہے کہ ان میں صحیح اور غلط دونوں قسم کی احادیث ہیں۔ اور
>
> صحیح حدیثوں میں بھی یہ فرق کرنا ہوگا کہ حضور نے فلاں کام اپنی بشری حیثیت سے کیا اور فلاں ارشاد دینی حیثیت سے فرمایا۔
>
> تو اس بات کو کس طرح متعین کیا جائیگا کہ وہ صحیح سنت رسول اللہ جس کی اطاعت فرض ہے، کونسی ہے اور کس کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اسے متعین کرے اور اس کا فیصلہ ساری امت کے لئے واجب التعمیل ہو جائے۔

اس سوال کو طلوع اسلام نے اپنی ۲ر اپریل ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں (لمعات میں) پیش کیا تھا اور اس سلسلہ میں اپنے خیال کا بھی اظہار کیا تھا۔ اس کے بعد ہم نے اُمت کے تمام ارباب فکر و نظر سے درخواست کی تھی کہ وہ اس سوال پر غور کرکے ہمیں بتائیں

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

جاحظ

(تلخیص و ترجمہ۔ ضحی الاسلام۔ از علامہ امین احمد مصری)

نام و نسب، خاندان

جاحظ کا پورا نام ابو عثمان عمرو بن بحر بن محبوب الکنانی ہے یہ حبشی النسل تھا، اس کا دادا عمر بن قلع کنانی کے اونٹوں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ کنانی کا لقب اس کے دادا کو وہیں سے ملا۔ جو بعد میں جاحظ کے خاندان کے نام کا جزو بن گیا۔ جاحظ کی پیدائش کی صحیح تاریخ کا اب تک تعین نہیں ہو سکا۔ لیکن مؤرخین اس کی تاریخ وفات پر متفق ہیں جو ۲۵۵ھ ہے اس نے ۹۶ برس کی عمر پائی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا سن پیدائش ۱۵۹ھ کے لگ بھگ ہے۔ اس کی پیدائش بصرہ میں ہوئی لیکن اس کی زندگی کا اکثر حصہ بغداد میں بسر ہوا اس کی پیدائش کے وقت بغداد علم و فن کا مرکز بنا ہوا تھا۔ جہاں سے ان کی شعاعیں دور دور پہونچ رہی تھیں جاحظ نے جب ہوش سنبھالا تو اس نے اپنے اردگرد ہر فن کے ماہر علما اور فضلا کو موجود پایا جن سے وہ بڑے ذوق شوق سے استفادہ کرنے لگا۔

اساتذہ

اس کے اساتذہ میں ابو عبیدہ، اصمعی، اخفش اور نظام جیسے کاملین فن کے نام ملتے ہیں یوں تو اس نے اپنے زمانہ کے ہر مشہور عالم سے کچھ نہ کچھ حاصل کیا مگر اس کے ذہن پر اس کے استاد نظام کا بہت اثر پڑا۔ نظام نے بھی بڑی محنت اور جانفشانی سے جاحظ کو تعلیم دی اور اس کی ذہنی اور دماغی تربیت کی طرف خاص توجہ دی جس کی وجہ سے جاحظ بالکل نظام کے رنگ میں رنگ گیا۔ نظام اپنے زمانہ کا نہ صرف مانا ہوا معتزلی تھا بلکہ اس کا شمار معتزلہ کے اماموں میں ہوتا تھا۔ جاحظ نظام سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ اس لئے اس پر بھی اعتزال کا گہرا رنگ چڑھ گیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں شاگرد استاد سے بہت بڑھ گیا۔ جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

تحصیل علم کا شوق

جاحظ کو بچپن ہی سے گوناگوں علوم و فنون حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ کتابوں کے مطالعہ کا تو اسے جنون سا تھا، اسے جو کتاب مل جاتی وہ اسے شروع سے آخر تک پڑھ کر ہی دم لیتا تھا۔ وہ اکثر بغداد کے کتب فروشوں سے کرایہ پر کتابیں لے آیا کرتا تھا، اور ساری ساری رات مطالعہ میں مشغول رہتا تھا، اس کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے تھوڑے ہی دنوں میں اسے مختلف قسم کے علوم و فنون پر عبور ہو گیا۔ تحصیل علم کے ساتھ ساتھ اس نے دنیا بھر کے تمدن اور ثقافت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش شروع کی۔ جس میں اسے خاص کامیابی ہوئی۔ مختلف ملکوں کے رسم و رواج، رہن سہن اور معلومات ثقافت کا حال معلوم کرنے کے شوق میں یہ اکثر تجارتی مرکزوں اور منڈیوں کے چکر لگایا کرتا تھا۔ کیونکہ ان مقامات پر مختلف ممالک کے تاجر خرید و فروخت کے لیے آیا کرتے تھے۔ عربوں کی ثقافت اور ان کے تہذیب و تمدن کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے وہ اونٹوں کی منڈیوں میں چلا جاتا تھا۔ جہاں عرب تاجر اونٹوں کی خرید فروخت کے لئے اکثر آیا کرتے تھے، اونٹوں کی منڈی میں اسے عرب خانہ بدوشوں اور عرب تاجروں سے ملنے جلانے کا کافی موقعہ ملا۔ وہ غیر ملکوں سے آنے والے فلاسفہ، حکماء اور مختلف علوم و فنون کے ماہروں سے بھی ملاقاتیں کیا کرتا تھا۔ اور ان سے طرح طرح کے سوالات کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کیا کرتا تھا۔ اسی زمانہ میں اس کی ملاقات نامور عرب علماء اصمعی اور ابو زید اور شہور یونانی فلاسفہ سلمویہ اور بختیشوع وغیرہ سے ہوئی۔ ان علماء سے جاحظ نے کافی استفادہ کیا ہے۔ جس کا ثبوت اس کی تصانیف سے ملتا ہے ایرانی ثقافت کے بارے میں اس نے بغداد آنے والے ایرانیوں سے کافی معلومات حاصل کیں اور اس کے علاوہ ابن مقفع اور ابو عبیدہ جیسے علماء کی تصانیف کے مطالعہ سے بھی ایرانی ثقافت کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوئی۔

تاریخی دور

جاحظ جس زمانہ میں پیدا ہوا وہ تاریخ کا اہم ترین دور تھا بغداد عروس البلاد بنا ہوا تھا۔ اور وہاں ہر طرف علم و فن کا چرچا تھا جب وہ بچہ تھا تو عباسی خلیفہ ہادی بغداد کا حکمراں تھا۔ جب وہ جوان ہوا تو ہارون الرشید بغداد کا حاکم تھا، اس کے بعد اس نے مامون کو بھی تخت نشین ہوتا دیکھا پھر امین اور مامون کی جنگ اس کے سامنے ہوئی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے معتزلہ نے ترقی کے ایسے اعلیٰ منازل طے کر لئے کہ کوئی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اس نے نہ صرف اس زمانہ کی فکری اور علمی تحریکات کے اتار چڑھاؤ کا مشاہدہ کیا بلکہ وہ خود ان فکری اور علمی تحریکات میں کسی نہ کسی حیثیت سے شریک رہا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے ہارون، امین، مامون معتصم، واثق، منتصر، مستعین، معتز اور مہدی کو بغداد کے تخت پر بیٹھتے دیکھا۔ اور ان کے عروج و زوال کا مشاہدہ کیا، اس نے مامون کے زمانہ میں معتزلہ کا اثر و رسوخ بھی دیکھا اور متوکل کے زمانہ میں ان کی تباہی و بربادی بھی، مستعین اور منتصر کی ذلت و خواری کا سماں بھی اس کی نظروں کے سامنے گزرا، غرض کہ اس نے اپنی ۹۶ سالہ زندگی میں جس قدر پیچ و خم اور اتار چڑھاؤ اور جو واقعات اس کی نظروں کے سامنے گذرے، ویسے واقعات عام طور سے کسی ایک شخص کی زندگی میں مشکل سے پیش آتے ہیں۔ جاحظ نے جتنے آدمیوں کو بنتے بگڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کی مثال تاریخ میں کم ملتی ہے۔ اس کی ۹۶ سالہ زندگی در اصل دوسری صدی کے آخر اور تیسری صدی کے اوائل کی تاریخ کا عکس ہے اگرچہ اس زمانہ میں ملوکیت کی مفاد پرستیاں ہر وقت فضا میں ارتعاش پیدا کرتی رہتی تھیں! بایں ہمہ اس دور میں جو علمی اور فکری ترقیاں ہوئی ہیں۔ تاریخ میں اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ یہ تھا وہ ماحول جس میں جاحظ گھرا ہوا تھا، اور اس کے اندر وہ تحصیل علم میں ہمہ تن مصروف تھا۔

غربت

چونکہ یہ نہایت غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، اس لئے اسے حصول علم کے راستے میں بڑی دشواریاں پیش آتی تھیں لیکن چونکہ اس کی طلب صادق تھی۔ اس لئے اس نے کسی قسم کی رکاوٹ کی کوئی پرواہ نہ کی اور مردانہ وار ہر قسم کی مشکلات کا مقابلہ کرتا رہا اس پر اکثر فقر و فاقہ کا دور بھی گزرا ہے لیکن اس نے ہنسی خوشی یہ سخت زمانہ بھی گذار دیا۔

حصول رزق کے لئے

بارہا اسے حصول معاش کی خاطر بازاروں میں پھیری کر کے مچھلیاں اور روٹیاں فروخت کرنی پڑیں۔ لیکن اس زمانہ میں بھی وہ حصول علم کے لئے غافل نہ ہوتا تھا۔ وہ مچھلیاں اور روٹیاں ایسے علاقوں میں فروخت کرتا تھا۔ جہاں علماء اور فضلاء رہا کرتے تھے۔ وہ چلتے پھرتے ان علماء و فضلا سے باتوں ہی باتوں میں کچھ نہ کچھ سیکھ لیتا اور صدہا علمی مسائل حل کر لیا کرتا تھا، اس کوچہ گردی سے جاحظ کو ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہ آزادی سے ہر مکتب خیال اور ہر مدرسہ فکر کے علماء سے کچھ نہ کچھ حاصل کر سکا۔ ورنہ بغداد کا یہ عام دستور تھا کہ کسی ایک عالم کے حلقے کا کوئی شخص کسی دوسرے عالم کے پاس استفادے کے لئے نہیں جا سکتا تھا کیونکہ ہر عالم نے بغداد میں اپنی پارٹی بنا رکھی تھی۔ اور کوئی شخص ایک ہی وقت میں دو پارٹیوں سے متعلق نہیں رہ سکتا تھا۔

پارٹی بازی

چنانچہ اس وقت کے علماء دربار میں اثر و رسوخ حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف رہا کرتے تھے، اس لئے ان میں آپس میں ہمیشہ چلتی رہتی تھی۔ علماء کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کی تکفیر کر کے اسے عوام اور خلیفۂ وقت کی نظروں میں ذلیل کرنے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ جاحظ چونکہ مچھلیاں اور روٹیاں بیچا کرتا تھا اور اس کا تعلق کسی اونچے گھرانے سے نہیں تھا اس لئے بغداد کا کوئی عالم اسے اپنی پارٹی میں شامل کرنے کا خیال تک بھی دل میں نہیں لاتا تھا۔ اس سے جاحظ کو بڑا فائدہ پہنچا اور وہ روٹیاں بیچتے ہوئے ایسے ایسے علماء کے پاس پہونچ جاتا تھا۔ جن کے پاس عام حالات میں پہونچنا ناممکن تھا۔ اگر جاحظ کسی ایک گروہ یا دھڑے بندی میں شریک ہو جاتا تو وہ بہت سے ایسے علوم و فنون سے محروم رہ جاتا، جو دوسرے گروہ کے علماء کے پاس اٹھنے بیٹھنے سے اس نے حاصل کئے۔

حصول علم کا نیا طریقہ

روٹیاں بیچتے بیچتے اس نے حصول علم کا ایک نیا طریقہ دریافت کیا۔ وہ یہ کہ اس نے بغداد کے خوش نویسوں اور خطاطوں سے خوش نویسی سیکھنی شروع کی، تھوڑے ہی دنوں میں اس نے خوش نویسی میں مہارت حاصل کر لی اور پھر روٹیوں اور مچھلیوں کی فروختگی چھوڑ کر کتابت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اس سے اسے یہ فائدہ ہوا کہ

اس زمانے کے بڑے بڑے مصنفین اور مایۂ ناز علماء کی تصانیف اس کی نظر سے گذرنے لگیں۔ اس طرح وہ اپنی روزی بھی کماتا تھا۔ اور ہر روز اس کے علم میں اضافہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ کتابت سے اس کے ذہن کو جلا ہوئی۔ اور کتابت کرتے کرتے خود اسی کے ذہن میں تصنیف و تالیف کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اس نے شروع شروع میں چھوٹے چھوٹے ادبی مضامین لکھنے شروع کئے۔ اور پھر تھوڑے ہی دنوں میں کتابت کا پیشہ چھوڑ کر اپنی پوری توجہ تصنیف و تالیف کی طرف مبذول کر دی اور متنوع علوم و فنون کی کتابیں اہل بغداد کے سامنے پیش کرنی شروع کر دیں۔ اس کا طرز تحریر اس قدر دلنشین اور پیارا تھا کہ اس کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ بک گئیں اور بہت تھوڑے عرصہ میں اس نے بڑی عزت اور شہرت حاصل کر لی

دینی تعصب

چونکہ جاحظ اپنے استاد نظام سے بہت متاثر تھا۔ اور وہ فکری اور ذہنی طور پر بالکل نظام کا پیرو تھا۔ اس لئے کچھ دنوں بعد اس نے اپنی ادبی روش سے ہٹ کر معتزلہ کی تعلیمات اور افکار کو پیش کرنا شروع کیا۔ چونکہ یہ زمانہ معتزلہ کے عروج کا تھا۔ اس لئے اس کی کتابیں پہلے سے بھی زیادہ مقبول ہوئیں۔ ایک تو جاحظ کا طرز تحریر اور پھر اس کے معتزلانہ خیالات، اس دو آتشہ نے عوام کے اور خواص دونوں کو جاحظ کا بے حد گرویدہ بنا دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں جاحظ نے وہ عزت و شہرت حاصل کر لی جو اس سے پہلے کسی کے حصہ میں نہیں آئی تھی۔ مالی اعتبار سے بھی اس نے بڑی ترقی کی۔ یا تو اس پر وہ زمانہ گزرا تھا کہ وہ سر پر روٹیاں اور مچھلیاں رکھ کر بیچا کرتا تھا۔ یا اس کا وہ زمانہ بھی آیا جب اس کے پاس اس قدر دولت تھی کہ وہ اس کا خود بھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ اس کے پاس بے شمار باغات، محلات اور کھیت تھے۔ بغداد میں پیلو کی لکڑی بہت قیمتی سمجھی جاتی تھی۔ جاحظ نے لوگوں پر اپنی امارت کا سکہ بٹھانے کے لئے اپنی رہائش گاہ کے دروازے اور کواڑیں پیلو کے درخت سے بنوائی تھیں باہر سے ماہر معمار برابر اس کے مکانوں کی دیکھ بھال اور درستگی میں لگے رہتے تھے۔ وہ ایسے نوکر چاکر ملازم رکھتا تھا اور ایسے غلام اور لونڈیاں خریدتا تھا جو بادشاہوں کی خدمت میں رہ چکے ہوتے تھے۔

وزراء اور سلاطین سے میل جول

اس کے ملنے والوں میں امراء، سلاطین، وزراء، اور شرفاء کی بہت بڑی تعداد تھی۔ متوکل کے ترکی نژاد وزیر فتح بن خاقان سے اس کی بہت دوستی تھی، اس دوستی کی بناء پر اس نے ترکوں کی بہادری اور شجاعت کے بارے میں ایک دلچسپ رسالہ لکھا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس زمانہ کی حکمران قوم کا یہ قاعدہ تھا کہ اس کے دربار اور فوج میں ادباء، علماء، متکلمین فلاسفہ، شعراء، اور مورخین وغیرہ کی ایک جماعت ہوا کرتی تھی جو حکمران طبقہ کے افراد اور ان کے فرقہ اور قبیلہ کے لوگوں کی عظمت اور برتری کی داستانیں مرتب اور مدون کیا کرتے تھے۔

ترک اور جاحظ

ترکوں میں علماء کی بڑی کمی تھی۔ چنانچہ ان کی بہادری اور شجاعت کی داستانیں لکھنے والا کوئی نہ تھا۔ فتح بن خاقان نے جاحظ سے ایک ایسا رسالہ لکھنے کی فرمائش کی جس میں ترکوں کی بہادری، شجاعت اور جوانمردی کی داستانیں تفصیل سے بیان کی جائیں۔ جاحظ نے اس کی بات مان لی اور بڑے ہی دلچسپ اور دلنشین انداز میں ترکوں کی بہادری کے متعلق ایک رسالہ ترتیب دیا۔ اس رسالہ میں جاحظ نے اپنی عقل و فہم اور اپنے فلسفے کا پورا زور صرف کر دیا۔ اور اپنے زور قلم سے یہ ثابت کر دیا کہ دنیا میں ترکوں سے زیادہ شجیع اور بہادر قوم کوئی ہو نہیں سکتی۔ اس رسالہ میں جاحظ نے جو کچھ لکھا تھا۔ اگرچہ وہ اس کے مندرجات سے خود متفق نہیں تھا لیکن اس نے فتح بن خاقان کی دوستی کا حق ادا کر دیا۔ اس رسالہ میں جاحظ نے ترکوں کی طرف سے ان سارے اعتراضات کا بڑی خوش اسلوبی سے جواب دیا۔ جو عربوں اور ایرانیوں کی طرف سے ترکوں پر کئے جاتے رہے تھے۔ جاحظ نے مبالغے سے کام لیتے ہوئے ترکوں کو خارجیوں سے بھی زیادہ بہادر و شجیع ثابت کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ تاریخ آج تک خارجیوں سے زیادہ بہادر انسان نہیں پیش کر سکی۔ وہ رسالہ کو معتصم کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کی رائے ترکوں کے بارے میں اچھی نہیں تھی۔ مگر یہ رسالہ معتصم تک نہیں پہنچ سکا کیونکہ دربار کے عرب اور ایرانی نہیں چاہتے تھے کہ معتصم اسے دیکھ پائے۔ اس لئے کہ انہیں ڈر تھا کہ انھوں نے معتصم کے کانوں میں ترکوں کی جو برائیاں ڈالی ہیں اور اس کو ترکوں کا دشمن بنا دیا ہے۔ اس سے ان کا اثر کم ہو جائے گا۔ عرب اور ایرانی درباریوں کو اس میں ضرور کامیابی ہوئی کہ انھوں نے جاحظ کا رسالہ معتصم تک نہ پہنچنے دیا۔ مگر ترکوں کو اس سے ایک بہت بڑا فائدہ ضرور پہنچ گیا کیونکہ ان کی شجاعت اور بہادری کی ایک عمدہ تاریخ مرتب ہو گئی۔ جاحظ نے اس رسالہ میں عصبیت کی خرابیاں تفصیل سے بیان کی ہیں، اور عربوں، ایرانیوں اور ترکوں کو ایک قوم ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اس نے جابجا عصبیت کو ہلاکت کا راستہ بتایا۔ اس کی یہ دلی خواہش تھی کہ عرب ایران اور ترک آپس میں لڑنا بھڑنا چھوڑ کر متفقہ طور سے ملک کو ترقی دینے اور مضبوط بنانے کی کوشش کریں۔ متوکل کے ترکی وزیر خاقان اور جاحظ نے اس عقیدے کو پھیلانے کی بڑی کوشش کی کہ سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ مگر اس زمانہ کی سیاست کچھ اس قسم کی تھی کہ جاحظ اور ابن خاقان کی یہ آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ جس کے نتیجہ میں عربوں، اور ایرانیوں کو جس تباہی و بربادی کا سامنا کرنا پڑا اس سے تاریخ کے صفحات خون آلودہ ہیں۔

سیر و سیاحت

چونکہ جاحظ کا ملنا جلنا، امراء، سلاطین اور وزراء وغیرہ سے تھا۔ اس لئے اسے اکثر سفر درپیش ہوا کرتا تھا۔ یوں وہ خود بھی طبعی طور پر سیر و سیاحت کا شائق تھا۔ اس لئے وہ سفر کے بہانے تلاش کیا کرتا تھا۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ وہ جم کر کسی ایک جگہ بیٹھا ہو۔ وہ اکثر سفر میں ہی رہا کرتا تھا۔ اس سیر و سیاحت سے جاحظ کا مقصد جہاں تفریح ہوتا تھا۔ وہاں اس کے پیش نظر حصول علم اور معلومات میں اضافہ بھی ہوا کرتا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتا کچھ نہ کچھ نئی معلومات اور نئے علوم و فنون سے واقفیت حاصل کرتا۔ وہ وہاں کی تہذیب و ثقافت، رسم و رواج، اخلاق و عادات، بول چال اور رہن سہن وغیرہ کا حال تفصیل سے معلوم کرتا اور خود ان چیزوں کا ذاتی مشاہدہ کرتا۔ یہ معلومات اور مشاہدات اس کے ذاتی تجربات پر مبنی ہوتے تھے جو کتابوں کے مطالعے سے معلوم نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ اس قسم کے مشاہدات تجربات اور معلومات کو بڑے اچھے انداز میں قلم بند کیا کرتا تھا۔ اور اس طرح ایک اچھی خاصی تصنیف وجود میں آ جاتی تھی جاحظ کا ہر سفر ایک نئی کتاب کی تمہید ہوا کرتا تھا۔

دائرۃ المعارف

جاحظ نے جس قدر مختلف النوع عنوانات پر کتابیں لکھی ہیں، اس کی مثال کم از کم خود جاحظ کے زمانہ میں ناپید تھی۔ اس نے اپنے زمانہ کے ہر قسم کے مروجہ علوم و فنون پر ہزاروں صفحات لکھنے کے علاوہ خود اپنے طور سے نئے نئے عنوانوں اور نئے نئے موضوع تلاش کر کے ان پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کی تمام تصنیفات کو اگر جمع کیا جائے تو وہ ایک ایسی انسائیکلوپیڈیا (دائرۃ المعارف) بن جاتی ہے۔ جو اگرچہ حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب نہیں کی گئی۔ مگر وہ اپنی جگہ پر مکمل انسائیکلوپیڈیا ہے۔ جس میں سب کچھ موجود ہے۔

اسلوب نگارش

اس کا اپنا ایک خاص طرز نگارش اور اسٹائل تھا، جو اسے اس کے معاصر مصنفین اور مؤلفین سے ممتاز کرتا ہے۔ اس کے طرز نگارش میں اس کی شخصیت پوری طرح جھلکتی ہے۔ اس کا اسلوب تحریر اس قدر اچھوتا اور نادر ہے کہ کوئی شخص جسے عربی ادب سے لگاؤ ہے۔ وہ آسانی سے اس کے مضامین کی نشان دہی کر سکتا ہے۔ جاحظ ایک ایسا صاحب طرز انشاپرداز ہے۔ جس کے اسلوب اور طرز نگارش کی نقل کرنے کی کوششیں اب تک جاری ہیں مگر کوئی شخص اس میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا۔

نئی راہ

یہ بات جاحظ کی فطرت میں داخل تھی کہ وہ کسی کی تقلید کسی حال میں بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے لئے خود نئی نئی راہیں نکالتا تھا۔ اپنے عقل و دماغ سے کام لے کر اپنے لئے نئے راستے تلاش کر لیتا تھا۔ احادیث و تفاسیر کے علاوہ ادب و لغت میں بھی اپنے معاصر علماء کے بنائے ہوئے قواعد و قوانین کی پابندی کو اپنی کسر شان سمجھتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ اپنی تحریروں کو اس قدر شگفتہ، واضح، صاف، شستہ اور آسان ترین بنائے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ اس سے مستفید ہو سکیں۔ مغلق عبارتوں، دور از کار تشبیہوں اور ثقیل الفاظ کے استعمال سے وہ ہمیشہ گریز کرتا تھا۔ اپنی تحریروں کو شگفتہ بنانے کے لئے وہ اکثر مزاحیہ واقعات اور چٹکلے استعمال کرتا تھا۔ اس کی یہ پوری کوشش ہوتی کہ خشک سے خشک موضوع کو بھی ایسے دلنشین انداز میں پیش کیا جائے کہ لوگ بغیر اکتاہٹ اور بددلی کے اس کا پورا مضمون پڑھ لیں وہ تلخ سے تلخ بات کو اس قدر شیریں انداز سے کہہ جاتا ہے کہ بے اختیار عش عش کرنے کو جی چاہتا ہے، وہ کونین کو شکر کی گولی میں لپیٹ کر پیش کرنے کا قائل تھا۔

خاص خوبی

اس کے طرزِ تحریر کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس کی کوئی ایسی کتاب پڑھ رہا ہے، جس میں اس نے بہت سے عبرت انگیز واقعات جمع کر دیئے ہیں۔ قریب ہو کہ قاری ان واقعات سے متاثر ہو کر رونا شروع کر دے تو عین اس مقام پر جاحظ ایک نیا رخ اختیار کرتا ہے۔ وہ کوئی ایسی دلچسپ بات کہہ دیتا ہے، جس سے روتا ہوا شخص بے اختیار ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ ایک مشفق استاد کی طرح اپنے قاری کی انگلی پکڑ کر آہستہ آہستہ سہارا دیتا ہوا لے چلتا ہے۔ جہاں اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ قاری کے ذہن پر بوجھ پڑنے لگا ہے یا وہ کچھ بے کیفی محسوس کرنے لگا ہے۔ وہ فوراً ایسی بات کہہ جاتا ہے جس سے اس بے دلی اور بے کیفی کا خود بخود خاتمہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے قاری پر جو اثر قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس میں وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ جاحظ کے متعلق مشہور مورخ مسعودی کا یہ قول اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ "جاحظ سے بڑے عالم اور مصنف کا مجھے پتہ نہیں۔ اس کے اپنے خاص خیالات و مسلک اعتزال کے باوجود اس کی باتیں کانوں کے پردے تک پہنچا دیتے ہیں کیونکہ اس کی عبارت نہایت منظم مرتب ہوتی ہے۔ اس کا زورِ بیان قابلِ داد اور دلنشین ہوتا ہے۔ اس کے الفاظ کے انتخاب کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ جب اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں پر قاری کا ذہن الجھنے لگا ہے اس مقام پر خشکی محسوس ہوگی۔ تو وہ فوراً سنجیدگی اور متانت کو بالائے طاق رکھ کر مزاح اور ظرافت پر اتر آتا ہے:

طریقہ تصنیف و تالیف

اس تصنیف و تالیف کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی کسی بات یا کسی نظریہ کے پیش کرتے وقت سب سے پہلے قرآن کی آیتوں سے استدلال کرتا تھا۔ پھر وہ تورات و انجیل وغیرہ کے حوالے دیا کرتا تھا۔ اس کے بعد حدیث اور خبر کو بطور دلیل پیش کیا کرتا تھا اور سب سے آخر میں شعرائے عرب کے اشعار اور ضرب الامثال کے حوالے دیا کرتا تھا۔

عقل کی کسوٹی

شروع ہی سے اس کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ کسی ایسی بات کو کبھی نہیں مانتا تھا۔ جو عقل کی کسوٹی پر پوری نہ اترتی ہو۔ وہ اپنی ہر ہر سطر کو عقلی طور پر جانچ لیتا تھا۔ تب لوگوں کے سامنے پیش کیا کرتا تھا۔ چونکہ اس نے دور دراز کے بری اور بحری سفر کئے تھے حکماء عقلاء، اور علماء سے ملاقاتیں کی تھیں، جنگلوں، صحراؤں اور بیابانوں کو دیکھا تھا۔ وادیوں اور گھاٹیوں کی سیر کی تھی اس لئے اس کی نظر بہت دور رس اور اس کا تجربہ نہایت وسیع تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی واقعہ کو کبھی بغیر غور و فکر کئے اور بغیر جانچے پرکھے قبول نہیں کرتا تھا۔ اس کا قاعدہ تھا کہ وہ ہر نئی چیز کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار کرتا۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح شک و شبہ کے اظہار سے شے کی اصل حقیقت واضح ہو کر سامنے آ جائے گی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ ہر چیز کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھو تاکہ اصل حقیقت واضح ہو کر تمہارے سامنے آ جائے۔

حقیقت کی چھان بین

اسے تحقیقِ حق اور اصل حقیقت کے دریافت کرنے اور شے کی حقیقت تک پہنچنے کا اسی قدر شوق تھا کہ وہ معمولی سے معمولی چیزوں کی تحقیق و تفتیش میں کئی کئی راتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دیتا تھا۔ جب وہ اپنی کتاب "الحیوان" مرتب کر رہا تھا تو اس کو تمام جانوروں کی نفسیات اور میلانات کے معلوم کرنے کا شوق ہوا۔ چنانچہ اس نے محض اس لئے کہ اس کی کتاب میں کوئی نقص باقی نہ رہ جائے ہر قسم کے چرندوں اور پرندوں کو تلاش کر کے ان کا تفصیلی حال معلوم کیا۔ اور ان کے عادات و اطوار کا پتہ چلایا۔ اس کے لئے اس نے جنگلوں اور صحراؤں اور نخلستانوں کے بیسیوں چکر لگائے، ارسطو نے بھی جانوروں کے متعلق ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کی یہ کتاب بالعموم جاحظ کے سامنے رہتی تھی۔ اس نے جب اپنی کتاب "الحیوان" مرتب کرلی۔ تو اس میں اس نے ارسطو کے بہت سے نظریات کو غلط ثابت کر دیا اور یہ لکھا کہ "ارسطو نے بغیر چھان بین کئے اور بغیر اپنی عقل سے کام لئے سنی سنائی اور عام لوگوں کی بیان کی ہوئی باتیں بیان کر دی ہیں"۔

جاحظ اور اعتزال

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ جاحظ نے اپنے زمانے کے نامور علماء و فضلاء سے ادب، انشا، بلاغت، صرف و نحو اور دوسرے علوم و فنون حاصل کئے تھے۔ فلسفہ اور علم کلام کا درس اس نے مشہور معتزلی علاف کے شاگرد رشید ابو الحسن نظام سے لیا۔ جس طرح نظام اپنے استاد علاف سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہ مسلک اعتزال میں علاف کی زبان بن گیا تھا۔ اسی طرح جاحظ نے نظام کا اتنا اثر لیا کہ وہ نظام کے نقشِ قدم پر چلنے ہی میں فخر و مباہات محسوس کرنے لگا۔ نظام نے بھی پوری توجہ اور محنت سے جاحظ کی ذہنی اور دماغی تربیت کی جس کی وجہ سے جاحظ نہ صرف نظام کا مثنیٰ بن گیا بلکہ وہ کئی چیزوں میں اپنے استاد سے بھی بازی لے گیا۔ نظام کا انتقال جوانی میں ہی ہو گیا تھا اس لئے اسے اپنے مسلک کی تبلیغ و اشاعت کا موقعہ نہیں مل سکا۔ لیکن اس کے لائق اور ہونہار شاگرد جاحظ نے اس کمی کو پوری طرح دور کر دیا۔ اس نے مسلک اعتزال پر اس کثرت سے کتابیں لکھیں اور سلسلہ مضامین شروع کیا کہ وہ اپنے زمانہ میں معتزلہ کا دل و دماغ اور ان کی زبان سمجھا جانے لگا۔ اس نے معتزلیوں کی بڑائی اور برتری ثابت کرنے کے لئے اپنے زمانہ کے علماء و فضلاء سے بحث و مباحثے بھی شروع کر دیئے اور ان اعتراضات کے جواب بھی دیئے جو معتزلہ پر ہوا کرتے تھے

تعصب کی قربان گاہ پر

اس کی ساری عمر بحث و مناظرہ میں گذری ہے۔ اس نے مسلک اعتزال پر بے شمار کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن برا ہو تعصب اور تنگ نظری کا کہ اس کے مخالف علماء نے سیدھے سادے عوام کو بہکا کر اس کی تصانیف اور اس کے مضامین ضائع کرا دیئے صاحب الفہرست ابن ندیم اور صاحب کشف الظنون خلیفہ چلپی وغیرہ بڑی تحقیق و تفتیش کے بعد مسلک اعتزال سے متعلق اس کی بہت سی کتابوں کے ناموں کا پتہ چلا سکے، چنانچہ اعتزال سے متعلق جاحظ کی کتابوں کے صرف نام "تذکرہ تاریخ" کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ البتہ اس کے ہم عصر علماء نے اپنی کتابوں میں اس کی تردید کرتے ہوئے اس کے جو اقوال نقل کئے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ان کتابوں میں کیا کچھ ہوگا۔ مسلک اعتزال سے متعلق اس کی کتابیں۔ "الاعتزال وفضلہ علی الفضیلہ" "الاستطاعۃ وخلق الافعال" "خلق القرآن" اور "فضیلۃ المعتزلہ" وغیرہ کے اب صرف نام ہی نام باقی رہ گئے ہیں یہ سب کی سب اس کے ہمعصر علماء کے مذہبی تعصب کی قربان گاہ پر چڑھ گئی ہیں۔

جاحظ کی خصوصیتیں

اس زمانہ کا یہ دستور تھا کہ ہر شخص کسی ایک فن کی تکمیل کرتا تھا۔ اور اسی میں دادِ تحقیق دیتا تھا، منطقی فلسفے سے واقف نہیں ہوتا تھا، فلسفی کو ادب سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا تھا، محدث کو مفسر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ غرض کہ ایک شخص کسی ایک ہی فن میں کمال حاصل کرتا تھا۔ لیکن جاحظ اور اس کا استاد ابو الحسن نظام ایسے شخص گذرے ہیں۔ جو ایک ہی وقت میں محدث بھی تھے اور مفسر بھی، ادیب بھی تھے اور فلسفی بھی منطقی بھی تھے اور متکلم بھی، لیکن جاحظ بعض چیزوں میں اپنے استاد سے بھی بڑھ گیا تھا، اس کا دلچسپ طرزِ تحریر اور دلنشین اسلوب بیان اسے اپنے استاد نظام اور دوسرے تمام معاصرین سے ممتاز کرتا ہے۔ فلسفہ میں بھی وہ اپنے استاد سے بہت بڑھ گیا تھا۔ جاحظ نے فلسفہ میں ادب کو شامل کر کے ایک ایسی دلچسپ راہ نکالی کہ جس سے فلسفہ کی خشکی اور عبوسیت کا خاتمہ ہو گیا۔

جاحظ اور احادیث

اس کا یہ عام اصول تھا کہ جو چیز عقل کے مطابق ہوتی تھی۔ اسے قبول کرتا تھا اور جو چیز خلافِ عقل ہوتی تھی اسے رد کر دیتا تھا احادیث کے معاملہ میں بھی وہ اپنے اس اصول پر سختی سے کاربند تھا۔ وہ ہر حدیث کے بارے میں کافی چھان بین کرتا تھا۔ اور اسے عقل کی کسوٹی پر کستا تھا۔ اگر وہ حدیث عقل کے مطابق ہوتی تھی۔ تو اسے قبول کر لیتا تھا۔ ورنہ اس کی صحت سے انکار کر دیتا تھا۔ وہ غول بیابانی، بھوت پریت اور جن و پری کے واقعات بیان کرنے والوں کو عقل و خرد سے عاری سمجھتا تھا۔ اور انھیں احمق کہا کرتا تھا۔

جاحظ اور فقہائے مدینہ

ابھی حال ہی میں اس کے ایک رسالہ کا پتہ چلا ہے، جو شراب کے اقسام کے بارے میں ہے۔ اس رسالہ میں جاحظ نے اپنے زمانہ کی شرابوں کے اقسام اور ان کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے ضمناً نبیذ کے حلال اور حرام ہونے کے متعلق دلچسپ بحث کی ہے، اس نے اپنے زورِ بیان اور منطقی دلائل سے نبیذ کی حلت ثابت کر دی ہے۔ اس نے نبیذ کی تعریف و توصیف میں اس قدر مبالغے سے کام لیا ہے کہ خمریات کے سب سے بڑے شاعر ابو نواس کو بھی پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ اس نے بڑے سخت الفاظ میں فقہائے مدینہ کی تردید کی ہے، جو نبیذ کی حرمت کے قائل ہیں اور عراقی فقہا کی حمایت کی ہے جو نبیذ کو حلال کہتے تھے، عراقی

فقہاء کی حمایت کرتے ہوئے جاحظ نے یہ لکھا ہے کہ شاید کوئی یہ کہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دار ہجرت مدینہ منورہ کے فقہاء کو اس کا زیادہ حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی شے کے حلال یا حرام ہونے یا کسی شے کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ کریں۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ کسی متبرک شہر کے رہنے والوں کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی چیز کو حلال یا حرام کریں۔ کسی شے کا حلال یا حرام ہونا قرآن پاک، سنت، عقل صحیح یا قیاس معینہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں جاحظ نے فقہائے مدینہ پر طنز کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ وہ لوگ ہیں جو شراب کے خالی برتنوں کو اٹھانے والوں پر حد جاری کرتے ہیں، اور اس کے جواز میں یہ کہتے ہیں کہ شراب کے خالی برتن "آلۂ خمر" ہیں"۔ فقہائے مدینہ کی اس دلیل کی روشنی میں یہ اصول مرتب کیا جا سکتا ہے کہ اگر کسی شخص پر اس لئے حد جاری ہو سکتی ہے کہ اس کے ہاتھ میں شراب کا خالی برتن ہے۔ تو پھر وہ لوگ بھی مجرم قرار پائیں گے جن کے ہاتھ میں تلوار، چھری، زہر یا اسی قسم کی کوئی چیز موجود ہو کیونکہ یہ سب کی سب "آلۂ قتل" میں داخل ہیں۔

اس مضمون کے خاتمہ پر جاحظ نے لکھا ہے کہ اہل مدینہ بہر حال انسان ہیں وہ اگر مدینۃ الرسول میں پیدا ہو گئے۔ تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ حدود بشریت سے نکل کر ملاء اعلیٰ میں پہنچ گئے یا ان کا شمار فرشتوں میں ہونے لگے گا۔ وہ بھی ہمارے اور آپ کی طرح عام انسان ہیں، اس لئے ان سے بھی غلطیوں کا امکان ہے۔"

جاحظ اور عمل بالحدیث

اس رسالہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ کہ جاحظ مختلف فیہ احادیث پر عمل نہیں کرتا تھا۔ اگر کسی حدیث کے متعلق محدثین کی رائیں الگ الگ ہوتی تھیں اور محدثین کی ایک جماعت کسی حدیث کو غلط اور دوسری جماعت صحیح کہتی تھی یا کسی حدیث کے بارے میں کوئی اور اختلاف ہو جاتا۔ تو ایسے موقعہ پر وہ اپنی عقل سے کام لیتا تھا۔ اگر وہ حدیث عقل کے مطابق ہوتی تھی تو وہ اسے قبول کر لیتا۔ ورنہ رد کر دیتا تھا۔ اس نے نبیذ کی حرمت والی حدیث کو اسی لئے رد کر دیا تھا۔ اور عراقی فقہاء کی حمایت کی تھی کہ اس حدیث کے بارے میں فقہاء اور محدثین میں آپس میں سخت اختلاف تھا، چنانچہ اس نے اپنی عقل سے کام لے کر حدیث کی صحت سے انکار کر دیا۔

شرعی قوانین کی بنیاد

جاحظ کہا کرتا تھا کہ شرعی قوانین کے سلسلہ میں عقل سلیم ہی سب سے بڑی اساس ہے۔ قیاس کے بارے میں اس کا یہ قول بہت دلچسپ ہے کہ "قیاس وہ عقل ہے جسے فقہاء نے اپنی کتابوں میں قید کر رکھا ہے۔"

جاحظ اور محدثین

اس رسالہ میں جاحظ نے محدثین کے گروہ پر سخت سے سخت تنقید کی ہے اور ان کی غلطیاں نکالی ہیں چونکہ محدثین نے ہمیشہ معتزلہ کو ہدف ملامت بنایا اور وہ برابر ان کے پیچھے پڑے رہتے تھے، اس لئے معتزلہ نے بھی ان کی سخت مخالفت کی ہے۔ جاحظ کے قلم سے اس سلسلہ میں بہت سے مضامین نکلے ہیں جسے معتزلہ کے مخالفین نے نذر آتش کر دیا۔ تاریخ کے صفحات معتزلہ اور محدثین کے اختلافات اور ان کی لڑائیوں کے داستانوں سے بھرے پڑے ہیں۔ فتنہ خلق قرآن کے موقعہ پر یہ اختلافات اپنی انتہا کو پہونچ گئے تھے۔

محدثین کے متعلق ریمارک

جاحظ محدثین کے متعلق کہا کرتا تھا کہ "یہ صرف حدیثوں کے جامع ہیں یہ جو کچھ روایت کرتے ہیں، اس کو خود بھی نہیں سمجھتے اپنی عقل سے تو یہ کام ہی نہیں لیتے مگر یہ احادیث بیان کرتے وقت اپنی عقل وخرد کو بھی کام میں لاتے اور دلائل وبراہین سے زیر بحث مسائل کو سمجھانے کی کوشش کرتے۔ تو مسلمانوں کے اندر وہ اختلال وانتشار اور وہ اختلافات پیدا نہ ہوتے جن کی وجہ سے بہت سے فتنوں کے دروازے کھل گئے ہیں۔ محدثین نے صرف ظاہری الفاظ نقل کر دینے پر ہی اکتفا کی ہے۔ انھوں نے احادیث کے معانی پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ جس کی وجہ سے امت میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں اور اختلافات کے دروازے کھل گئے۔" آگے چل کر جاحظ نے لکھا ہے کہ "چونکہ عوام کو عجیب غریب باتیں سننے میں بڑا مزا آتا ہے اس لئے محدثین کی عجیب غریب باتیں تیزی سے پھیل گئیں۔ اگر محدثین ذرا بھی عقل کا سہارا لیتے تو اس سے بڑے فائدے ہوتے۔"

نوٹ

معتزلہ کون تھے، ان کا مسلک کیا تھا۔ ان میں اور محدثین میں جو آویزش تھی، اس کی بنیاد کیا تھی اور تفصیل کیا؟ یہ وہ امور ہیں جن کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے جسے کسی دوسری صحبت میں پیش کیا جائے گا۔ (طلوع اسلام)

بزم طلوع اسلام

بزموں کی اطلاعات اور روئداد کو اہتمام سے شائع کرنے کے لئے بزم طلوع اسلام کا جداگانہ عنوان قائم کیا گیا تھا۔ لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک تو بزموں کی تشکیل کے معاملے میں تساہل سے کام لیا جا رہا ہے۔ دوسرے جو بزمیں معرض وجود میں آ چکی ہیں۔ وہ باقاعدگی اور تفصیل سے اپنی روئداد ارسال نہیں کرتیں۔ اس سلسلہ میں پہلے بھی یاددہانی کرائی جا چکی ہے۔ امید ہے کہ اب مزید یاددہانی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ تمام بزموں کو چاہیئے کہ وہ ایک معین عرصے کے بعد ایک رپورٹ بھیجدیا کریں۔ جہاں بزمیں نہیں بنیں، اور کئی بڑے بڑے شہر ایسے ہیں جہاں ابھی تک بزمیں نہیں بنیں وہاں کے قارئین کو چاہیئے کہ وہ ایک دوسرے سے رابطہ پیدا کر کے کم سے کم وقت میں بزم منتشکل کریں۔ تشکیل بزم کے لئے بڑی تعداد ارکان کی ضرورت نہیں۔ دو چار قارئین بھی مل کر ایسا کر سکتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ طلوع اسلام کا ہر پڑھنے والا اپنی جگہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا مرکز ہے لیکن جو کام متحد و مجتمع ہو کر کیا جا سکتا ہے۔ وہ متفرق طور پر نہیں کیا جا سکتا۔

مردان بزم طلوع اسلام مردان کا ذکر ان کالموں میں آ چکا ہے یہ سب سے پرانی، منظم اور فعال جماعت ہے۔ یہ بزم کوئی دو سال سے قائم ہے اور بڑی سرگرمی اور مستعدی سے قرآنی فکر کی ترویج میں مشغول ہے۔ اس کی طرف سے ہر روز ۸ بجے سے ۹ بجے شام تک درس قرآن دیا جاتا ہے، درس کا یہ سلسلہ تین سال سے جاری ہے اس وقت چوبیسواں پارہ زیر مطالعہ ہے۔ یہ درس ڈاکٹر نواب علی اور علی دوا سازان کے احاطہ میں ہوتا ہے۔ بزم کو دارالمطالعہ کے لئے مناسب جگہ نہیں مل سکی، چنانچہ اب فیصلہ کیا گیا ہے کہ فی الحال اسی احاطہ میں دارالمطالعہ شروع کر دیا جائے۔ جب موزوں جگہ مل جائے گی تو اسے تبدیل کر لیا جائے گا۔

بزم متعدد پرچے طلوع اسلام کے خرید کر مفت تقسیم کرتی ہے۔ یہ پرچے لائبریریوں۔ اسکولوں یا ایسے افراد کے ہاتھوں تک پہنچائے جاتے ہیں جنھیں قرآنی فکر سے متعارف کرانا مقصود ہوتا ہے یا جو اس سے متعارف تو ہوتے ہیں لیکن پرچہ خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے اسی طرح مطبوعات طلوع اسلام بھی مستحق لوگوں تک پہنچائی جاتی ہیں۔ بزم نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ مقامی کالج کے اسلامیات میں اول آنے والے طلباء کو مطبوعات طلوع اسلام انعام کے طور پر بھیجی گیا بزم طلوع اسلام مردان کی سرگرمیاں دیگر بزموں کے لئے قابل تقلید ہیں۔

ہری پور طاہر انصاری صاحب ترجمان بزم طلوع اسلام ہری پور (مکان ۱۰۷، محلہ موتیاں) اطلاع دیتے ہیں کہ مقامی بزم کا اجلاس ۱۰ اپریل کو منعقد ہوا اور اس میں بعض علمی مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ اس تبادلۂ خیالات کے سلسلہ کو ارکان بزم بڑا مفید سمجھتے ہیں، اور معلومات میں اضافہ کے لئے شوق سے اس میں شرکت کرتے ہیں۔

ڈیرہ غازی خاں دیر میں آئی ہی، ڈیرہ غازی خاں میں بالآخر بزم کا قیام عمل میں لایا جا چکا ہے۔ بزم کے ترجمان شیخ محمد اشرف صاحب پلیڈر بلاک ۲۲ ہیں، جو مقامی قارئین بزم کے رکن نہ بن سکے ہوں وہ ان سے رابطہ پیدا کریں۔ بزم کو چاہیئے کہ اولین فرصت میں لائبریری قائم کریں جو قرآنی فکر کی ترویج کا مرکز ہو۔ نیز ارکان وقتاً فوقتاً جمع ہوں اور مقامی حالات کے مطابق طلوع اسلام کی دعوت کو عام کرنے کے ذرائع سوچیں اور ان پر عمل کریں۔

جھنگ مگھیانہ ظفر عباس قریشی صاحب ۱۰ اپریل کے اجلاس کی تفصیل کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ بزم نے متفقہ طور پر میر تجمل حسین صاحب کو ترجمان منتخب کیا ہے (بزم کا پتہ یہ ہے لال دھرم شالہ، جھنگ بازار، محلہ بھیرانہ، جھنگ مگھیانہ) جلسہ میں ترجمان صاحب، ظفر عباس صاحب قریشی اور مشتاق احمد صاحب نے مختلف موضوعات پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور تحریک طلوع اسلام کو فروغ دینے کے مسئلہ پر غور کیا۔

شیر شاہ کالونی (کراچی) نواب دین بھٹہ صاحب امرتسری ترجمان اطلاع دیتے ہیں کہ شیر شاہ کالونی میں بزم کا قیام عمل میں لایا جا چکا ہے اور ارکان بڑی سرگرمی سے مصروف عمل ہیں۔ بزم نے لائبریری بھی قائم کر لی ہے۔ جس میں ضرورت مند حضرات کے فائدہ کے لئے طلوع اسلام کی مطبوعات جمع کی گئی ہیں۔ بزم کی طرف سے وقتاً فوقتاً اجتماعات بھی ہوتے ہیں (بزم کا پتہ یہ ہے۔ نواب دین بھٹہ صاحب امرتسری ترجمان بزم طلوع اسلام شیر شاہ کالونی کراچی) کراچی کے دیگر علاقوں کو اس بزم کے تتبع میں علاقہ واری بزمیں قائم کرنی چاہئیں۔

"نقد و نظر" (صفہ ۱۰ سے آگے)

کہ جو خیال ہم نے پیش کیا ہے اس میں کوئی غلطی ہے۔ اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟

اس کا جواب بھی اس وقت تک کہیں سے موصول نہیں ہوا (حالانکہ جماعت اسلامی کے ارباب حل و عقد کو اس بارے میں ذاتی خطوط بھی لکھے گئے تھے۔)

ہم "سنت خیر الانام" کے فاضل مؤلف سے درخواست کریں گے کہ وہ مندرجہ صدر ہر سہ سوالات پر غور فرمائیں۔ اور اگر ان کے پاس ان کا جواب ہو تو وہ (خالص علمی انداز سے) آپ جواب سے ہمیں سرفراز فرمائیں۔ اس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہوں گے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ہم سے متفق ہوں گے کہ اس قسم کے سوالات کا اٹھانا اور دینی اور علمی طریق سے ان کا حل طلب کرنا، یا حل سوچنا، کوئی ایسا جرم نہیں جس کی پاداش میں کسی کو ہدف سب و شتم بنا دیا جائے۔ جماعت اسلامی والے یہ کچھ اپنی مصلحتوں کے ماتحت کر رہے ہیں۔ انہیں یہ کچھ کرنے دیجئے۔ لیکن آپ تو ان کی "سبھگدڑ" کا شکار نہ ہو جائیے۔ ہماری یہ درخواست صرف "سنت خیر الانام" کے مؤلف ہی سے نہیں ملک کے تمام سنجیدہ طبقہ سے ہے۔

آپ طلوع اسلام کی مدد کیسے کر سکتے ہیں

اپنے احباب کو طلوع اسلام کا خریدار بنائیے۔
اپنے شہر میں طلوع اسلام کی ایجنسی قائم کیجئے۔
کسی مقامی ایجنٹ کو تیار کیجئے کہ وہ طلوع اسلام کا لٹریچر منگائے۔
ممکن ہو تو اپنے علاقے سے

طلوع اسلام کیلئے اشتہار مہیا کیجئے

طلوع اسلام کا دفتر

۲۲/۳۴ ناؤ لوگ روڈ نائن نیپیر بارکس میں واقع ہے

صدر کی طرف سے آنے والے حضرات نیپیر بارکس میں داخل ہو کر بجائے سیدھے جناح ہسپتال کی طرف جانے کے بائیں ہاتھ ڈرگ روڈ کی طرف مڑ جائیں تو تھوڑے فاصلہ پر بائیں ہاتھ کو پی۔ ڈبلیو ڈی کے انکوائری آفس کے عقب میں طلوع اسلام کا دفتر ہے۔

اسی دفتر میں ہر اتوار کو صبح ۹ بجے

محترم پرویز صاحب

قرآن پر لیکچر دیتے ہیں

مطبوعات طلوع اسلام

معراج انسانیت (از پرویز) سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی ادبی کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرور کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد بمعہ گردپوش۔
قیمت بیس روپے

ابلیس و آدم از پرویز۔ سلسلۂ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق۔ قصۂ آدم۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۴۷۷ صفحات۔
قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستور پاکستان اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت۔ علماء۔ اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ ۲۴۴ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

اسلامی نظام اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراج پوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔
۱۴۸ صفحات۔ قیمت دو روپے

سلیم کے نام از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوئے ہیں ان کا شگفتہ مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۲۲۵ صفحات
قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے روزمرہ کی زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ چار سو آٹھ صفحات
قیمت چار روپے

اسباب زوال امت از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ۱۵۰ صفحات
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دور آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ۔
۵۷ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

مزاج شناس رسول یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول مزاج شناس کون ہیں۔ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔
۴۴۴ صفحات اور قیمت فی جلد چار روپے

مقام حدیث حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ ایک جا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات
اور قیمت فی جلد چار روپے

فردوس گم گشتہ از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف ۴۱۶ صفحات۔ قیمت چھ روپے

نوادرات از علامہ اسلم جیراجپوری علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ چار سو صفحات
قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت (از پرویز) مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر گوشہ قرآنی آئینے میں۔ صفحات ۱۹۲
قیمت دو روپے

نوٹ

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گردپوش سے آراستہ۔ محصولڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۔ کراچی

تمنّائے رسول اور القائے شیطان

(ابن آدم)

دابتہ الارض کی طرح یہ مضمون "تمنائے رسول اور القائے شیطان" بھی صدیوں سے ہمارے ہاں ایک دلچسپ چیستان بنا ہوا ہے۔ سورۂ حج کی آیت ۵۲ رکوع ۷ میں اس مضمون کا ذکر یوں ہے۔

وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنیٰ القی الشیطن فی امنیتہ فینسخ اللہ ما یلقی الشیطن ثم یحکم اللہ ایتہ واللہ علیم حکیم

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کے قبل کوئی رسول اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کو یہ قصہ پیش نہ آیا ہو کہ جب اس نے (اللہ تعالیٰ کے احکام میں سے) کچھ پڑھا۔ تب ہی شیطان نے اس کے پڑھنے میں (کفار کے قلوب میں) شبہ ڈالا۔ پھر اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو (جوابات قاطعہ سے) نیست و نابود کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ خوب علم والا اور خوب حکمت والا ہے۔

(ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی)

عام طور پر ہمارے مترجمین نے اسی قسم کے ترجمے کئے ہیں ان ترجموں میں جو خاص رجحان موجود ہے وہ ان مترجمین کا قصور نہیں، بہت پہلے سے تفسیروں اور شان نزول کی روایتوں نے اس قسم کا میلان و رجحان پیدا کر رکھا ہے کہ اس سے ہٹ کر غور و فکر اور تدبر کی جرات ہی نہیں کی جا سکتی۔ ابن ابی حاتم، ابن جریر، بزار، بیہقی، ابن اسحاق، لبغوی اور قاضی عیاض وغیرہم نے آٹھ دس طریقوں سے قدرے لفظی اختلاف کے ساتھ اس کی شان نزول بیان کی ہے۔ ان سب کو بالفاظہ نقل کرنا باعث طوالت ہوگا۔ اس لئے ہم خلاصہ درج کرتے ہیں

حضورؐ سورہ نجم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ جب اس آیت (افرأیتم اللات والعزیٰ ۵ و مناۃ الثالثۃ الاخریٰ) پر پہنچے۔ تو شیطان نے سکتے یا وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بیچ میں یہ جملہ ملا دیا کہ تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجیٰ (یعنی: یہ وہ جوان و جمیل بلند و بالا معبود اور بلاشبہ ان کی شفاعت کی توقع ہے۔ یہ سن کر تمام کفار قریش خوش ہو گئے کہ لو آج تو محمدؐ نے ہمارے معبودوں کی بھی تعریف کر دی۔ چنانچہ جب ختم سورہ کے بعد حضورؐ نے سجدہ کیا تو مسلمانوں کے ساتھ مشرکوں نے بھی سجدہ کیا۔ اس کے بعد عام طور پر مشہور ہو گیا کہ حضورؐ (نعوذ باللہ) اسلامی توحید کو چھوڑ کر سابق دین پر آ گئے۔ یہ خبر رفتہ رفتہ حبشہ کے مہاجرین کو بھی پہنچی اور کچھ لوگ گھر واپس آ گئے۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ خبر غلط تھی۔ یعنی واقعہ یہ تھا کہ شیطان نے بیچ میں یہ فقرہ ملا دیا تھا جس کی اللہ تعالیٰ نے تردید فرما دی۔

اس روایت کو ہم نے دل پر بہت جبر کر کے نقل کیا ہے اور اس وقت اس پر کوئی تبصرہ کرنا بھی مقصود نہیں ہے۔ روایت کرنے والے اگر صرف یہ آیت

ان عبادی لیس لک علیھم سلطان

اے شیطان میرے نیک بندوں پر تیرا کوئی قابو نہیں چل سکے گا

دیکھ لیتے۔ یا خود شیطان کا یہ اعتراف

الا عبادک منھم المخلصین

تیرے مخلص بندوں پر میرا کوئی اثر نہ ہوگا

ملاحظ فرما لیتے یا کچھ نہیں تو یہ حدیث

ما منکم من احد الا وقد وکل بہ قرینہ من الجن قالوا وایاک یا رسول اللہ قال وایای الا ان اللہ اعاننی علیہ فاسلم فلا یأمرنی الا بخیر (رواہ مسلم عن ابن مسعود)

حضورؐ نے فرمایا کہ تم میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں جس کے ساتھ اس کا ایک شیطان رفیق نہ لگا دیا گیا ہو۔ لوگوں نے عرض کیا کہ کیا حضورؐ کے ساتھ بھی کوئی شیطان لگا ہوا ہے؟ فرمایا ہاں میرے ساتھ بھی لگا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر قابو بخشا ہے۔ اور وہ مسلم (مطیع) ہو گیا ہے اور مجھے خیر کے سوا اور کسی بات پر نہیں اکساتا۔

اپنے سامنے رکھ لیتے۔ تو بات صاف ہو جاتی۔ خیر یہ غنیمت ہے کہ حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں یہ بات بہ تکرار لکھ دی کہ

ھذہ کلھا مرسلات منقطعات غیر مسندۃ

یہ تمام روایتیں مرسل، منقطع اور بے سند ہیں

روایات کا احترام ہمارے نزدیک بھی کچھ کم ضروری نہیں لیکن جن روایات سے حضورؐ کی اصلی پوزیشن اور دین کی سپرٹ مجروح ہو رہی ہو۔ وہاں امام فخرالدین رازی کا اصول زیادہ قابل ترجیح ہے کہ

حضرت ابراہیمؑ کو دروغ گو مان لینے کی نسبت راوی کو جھوٹا مان لینا ہمارے لئے زیادہ آسان ہے۔

یہ بھی سن لیجئے یہ روایت "مضطرب" بھی ہے کسی میں ہے کہ حضورؐ کو اونگھ آ گئی اور شیطان نے زبان پر یہ کلمات (تلک الغرانیق العلیٰ الخ) جاری کرا دیئے۔ کسی میں ہے کہ شیطان نے (حضورؐ کی آواز بنا کر) یہ کلمات کہہ دیئے۔ کسی میں ہے کہ شیطان نے اس ساحرانہ طریق سے یہ کلمات کہے کہ صرف کافروں نے ہی اسے سنا اور مسلمان نہ سن پائے۔ غرض کہ الفاظ روایت میں خاصا اضطراب ہے۔ لہٰذا یہ صرف مرسل، منقطع اور غیر مسند ہی نہیں (بقول ابن کثیر) بلکہ مضطرب بھی ہے۔

ان تمام وجوہ رد کے باوجود احترام روایات کا جو جذبہ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ اس نے اتنی جرات ہی نہ پیدا ہونے دی۔ کہ اس روایت کو صاف صاف لفظوں میں مردود اور ناقابل قبول قرار دے کر الگ کر دیا جائے۔ آخر اس کے دو نتیجے ہمارے سامنے آ گئے۔

ایک یہ کہ بہت سے لوگوں نے اس کی تطبیق اور توجیہہ کی کوششیں شروع کر دیں ان میں قاضی عیاض اور لبغوی قابل ذکر ہیں۔ ابن عباس تمنیٰ کے معنی حدث (گفتگو کی) بتلاتے ہیں ضحاک اور مجاہد اس کا مطلب قال (بات کی) بتلاتے ہیں یہ دونوں تفسیریں بھی درست ہو سکتی ہیں۔ اور وضعی حدیثوں پر اسے چسپاں کیا جا سکتا ہے جو القائے شیطانی ہے۔

دوسری چیز یہ سامنے آئی کہ اس زد سے بچتے ہوئے بھی آیت کے جو ترجمے یا تفسیریں کی گئیں وہ اس انداز کی ہیں کہ ذہن خواہ مخواہ اسی جعلی شان نزول کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور ایک ذہنی تشویش میں انسان مبتلا ہو جاتا ہے۔

اس سلسلہ کی پہلی کڑی لفظ تمنیٰ اور لفظ امنیتہ ہے جس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ

جب رسول یا نبی نے تلاوت کی تو شیطان نے اس قرأت میں کچھ ڈال دیا

سوال یہ ہے کہ آخر کیا مصیبت پڑی ہے جو تمنیٰ یا امنیتہ کے معنی تلاوت و قرأت کے لئے جائیں! تمنا کے معنی تمنا کے ہیں اور یہی معنی امنیتہ کے بھی ہیں۔ جو یہاں گویا فعل تمنیٰ کا مفعول مطلق ہے ہمارے عربی لغت میں بھی ایک عجیب مصیبت یہ ہے کہ اس میں بعض لفظ کے معانی وہ لکھ دیئے گئے ہیں۔ جو بعض روایات کے پیدا کردہ ہیں۔ اور اصل عربی زبان سے ماخوذ نہیں۔ دابتہ الارض ہی کے لفظ کو لے لیجئے۔ لغات میں اس کے معنی یہ لکھے ہیں۔

حیوان قیل ظھورہ من اشراط الساعۃ

(اقرب الموارد)

ایک جانور ہے جس کے ظہور کے متعلق کہا جاتا ہے کہ قیامت کی ایک علامت ہے۔

یہ معنی کہاں سے پیدا ہوئے؟ اس کا سرچشمہ ہی روایات ہیں جن کا ذکر آپ ۲۶ مارچ کے طلوع اسلام میں پڑھ چکے ہیں یہی صورت حال بے چارے لفظ تمنیٰ کے ساتھ بھی ہوئی اگر ان روایات سے پہلے بلکہ خود اسلام سے پہلے کے جاہلی کلام عرب میں یہ لفظ "تمنا" بمعنی تلاوت آیا ہو تو اس پر غور کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ بھی ایک شرط ہے یعنی اس کا انتساب صحیح ہو

کیونکہ بیسیوں اشعار محض استناد یا کے لئے بعد میں بنا لئے گئے جن کا انتساب کسی جاہلی شاعر کی طرف کر دیا گیا ہے۔ جب حضور کی طرف جھوٹی حدیثیں منسوب کرنے میں تامل نہ ہوا تو برجستہ ایک شعر بنا دینے میں کیا دشواری ہو سکتی تھی اسے بھی جانے دیجئے، فرض کیجئے کہ اگر واقعی تمنا بمعنی تلاوت و قرأت بھی ہو تو آخر تمنا بمعنی تمنا لینے میں کون سی چیز مانع ہے کہ خواہ مخواہ ایک بعید معنی کی طرف رجوع کیا جائے

ایک ضروری نکتہ پر اور بھی غور فرمایئے۔ اگر ہمارے کانوں میں ان آیات کی آواز آئے کہ

(i) وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن الله (۴، ۶۴)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے۔ وہ اسی لئے کہ بحکم الٰہی اس کی اطاعت کی جائے

(ii) وما ارسلنا فی قریۃ من نبی الا اخذنا اھلھا بالبأساء والضراء لعلھم یضرعون (۷، ۹۴)

ہم نے جس بستی میں کوئی نبی بھیجا۔ وہاں کے بسنے والوں کی بأساء وضراء کے ذریعہ پکڑ کی تاکہ وہ تضرع اختیار کریں۔

(iii) وما ارسلنا من قبلک الا رجالا نوحی الیھم من اھل القریٰ (۱۲، ۱۰۹)

ہم نے آپ سے پہلے جسے بھی رسول بنایا وہ آدمی ہی تھے۔ جو ان بستی والوں میں سے ہوتے تھے۔ اور ہم ان کی طرف وحی کرتے تھے۔

(iv) وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الٰہ الا انا فاعبدون (۲۱، ۲۵)

ہم نے آپ سے پہلے جو رسول بھی بھیجا اس پر اسی حقیقت کی وحی کی کہ میرے (اللہ کے) سوا کوئی بھی نصب العین نہیں لہٰذا میری ہی غلامی کرو

(v) وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ (۱۴، ۴)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا وہ اس کی قوم ہی کی زبان میں بھیجا۔

جب ہم یہ آیات سنتے ہیں تو ہمیں ان کے فہم میں کوئی تشویش پیدا کیوں نہیں ہوتی؟ اس لئے کتب سابقہ سے تاریخ سے اور خود قرآن سے اس کی حرفاً حرفاً تائید ہوتی ہے۔ کہ

ہر رسول نے کہا

فاتقوا اللہ واطیعون

(اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو)

ہر رسول کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ اس کی قوم کو بأساء وضراء کے جھٹکے دیئے گئے۔

ہر رسول کے متعلق علم ہے کہ وہ اپنی بستی ہی کی خاک سے پیدا ہوا اور وہ انسان ہی ہوتا تھا۔

ہر پیغمبر کے متعلق یقین ہے کہ اس کا پیغام توحید الٰہی ہی تھا۔

ہر رسول کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ وہ اسی قوم کی زبان میں پیغام خداوندی لایا جس کی طرف وہ بھیجا گیا۔

ان تمام حقائق کی تائید قرآن کے اوراق سے کتب سماویہ اور تاریخ کے اسباق سے اتنی واضح، روشن اور مفصل نمایاں ہیں کہ اسے سمجھنے میں کسی کو کوئی دشواری نہیں پیش آتی۔ کیونکہ یہ سارے حقائق تمام پیغمبروں میں مشترک ہیں۔ ان آیات کا انداز بیان یعنی وما ارسلنا ...... الا ...... ہی ایسا ہے کہ تمام انبیاء و مرسلین کا یہ وضعی اشتراک، مفہوم کو خود بخود واضح کر دیتا ہے۔ لیکن بالکل یہی انداز بیان جب زیر بحث آیت میں آتا ہے کہ

وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنیٰ القی الشیطن فی امنیتہ ... الخ

تو ایسی مضحکہ خیز تفسیریں ہوتی ہیں کہ ناطقہ سر بگریبان ہو جاتا ہے۔ صورت حال وہ سامنے لائی جاتی ہے جو حضور اکرم کے سوا کسی رسول اور کسی نبی کے ساتھ نہیں ہوتی اور سارے قرآن میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ تاریخ اور کتب سماویہ بھی اغلباً اس سے خالی ہیں۔ فرمایئے کس پیغمبر کے ساتھ یہ واقعہ ہوا ہے کہ وہ اپنا پیغام خداوندی سنا رہا ہو۔ اور عین اسی وقت شیطان نے اس کی آواز بنا کر یا اس پر غنودگی طاری کر کے اسی کی زبان پر اس پیغام خداوندی کی نقیض جاری کرادی ہو۔ جس پر مومن و کافر سب نے "سجدۂ شکر" بھی ادا کر لیا ہو، اس لئے کہ ایک ہی مجمع میں اہل ایمان نے تو صرف پیغام خداوندی سنا اور پیغام شیطانی کو صرف اہل کفر سن سکے؟ ذرا تفصیل سے ایک ایک پیغمبر کا نام لے کر بتایئے کہ اور کس کس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا؟ آخر یہ کیا تفسیر ہوئی کہ اللہ تعالیٰ تو فرمائے فلاں واقعہ ہر نبی اور ہر رسول کے ساتھ پیش آیا اور تفسیر یہ ہو کہ بجز حضورؐ کے اور کسی کے ساتھ یہ واقعہ پیش ہی نہیں آیا!

یہ پہلا نتیجہ تو وہ تھا۔ جو لفظ تمنی اور امنیۃ کے غلط سے پیدا ہوا، دوسرا لفظ جس سے یہ نتیجہ نکالا گیا لفظ "القا" ہے (القی الشیطن فی امنیتہ) غالباً اس کا مفہوم وحی کی طرح غیر مرئی القا یا الہام سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ اس کا مطلب صرف "ڈالنا" ہے اگر اس کا مفعول مذکور ہو تو وہی ڈالی جانے والی چیز ہوگی۔ مثلاً ملقون اقلامھم (اپنے قرعے ڈال رہے تھے) یا القینا بینھم العداوۃ (ہم ان کے درمیان عداوت ڈال دی) اگر مفعول مذکور نہ ہو تو قرینے سے سمجھ لیا جائے گا۔ مثلاً قال بل القوا (موسیٰ نے کہا نہیں بلکہ تم پہلے ڈالو یعنی اپنے شعبدے

اب القی الشیطن فی امنیتہ میں دیکھئے کہ یہاں کیا چیز مقدر ہے جو القی کا مفعول بن سکتی ہے؟ تمنی کا مفہوم واضح ہونے کے بعد یہ چیز بھی خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔

ایک پیغمبر کی سب سے بڑی آرزو کیا ہو سکتی ہے؟ وہ کس چیز کی سب سے زیادہ تمنا کر سکتا ہے! صرف اس بات کی کہ وہ جو مشن لایا ہے۔ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے کامیاب ہو، یہی ہے وہ تمنا جو ایک نبی یا رسول کو بے چین کئے رہتی ہے اور کوئی ساعت ایسی نہیں ہوتی جس میں اس کا دل اس تمنا سے خالی ہو شیطان اس میں کیا ڈالتا ہے؟ رکاوٹیں۔

مطلب یہ ہے کہ یہ مصیبت ہر رسول اور ہر نبی کے ساتھ رہتی ہے۔ کہ جب بھی اس نے اپنے مشن کی تکمیل کی آرزو کی ہے تو شیطانی قوتوں نے اس میں ہزاروں رکاوٹیں پیدا کی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ شیطان کی ڈالی ہوئی رکاوٹوں کو دور کر دیتا ہے۔ فینسخ اللہ ما یلقی الشیطن۔ "نسخ" کے معنی ہیں۔ ازالۃ والرفع (مفردات) یعنی دور کر دینا۔

اور پھر؟ ثم یحکم اللہ آیتہ اپنی آیات کو خدا اور زیادہ مستحکم کر دیتا ہے۔ صحیح اقدار قائم ہو جاتی ہیں۔ اہل کفر ہلاک ہوتے اور اہل ایمان نجات یافتہ ہوتے ہیں۔

یہ ہے وہ حقیقت جو ہر رسول و نبی کے ساتھ پیش آتی رہی اور سارا قرآن اس کی تفصیلات سے بھرا پڑا ہے۔ کتب سماویہ میں بھی ہر جگہ اس کا ذکر ہے اور تاریخ کے اوراق بھی اس کے گواہ ہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ ہماری ہی تفسیر سو فیصدی درست ہے، یہ صرف ایک کوشش ہے۔ اپنی اس کوشش کو ہم آخری کوشش کیونکر کہہ سکتے ہیں، جبکہ مفسرین کی کوششوں کو ہم حرف آخر نہیں کہتے آپ بھی کوشش کیجئے شاید اس سے بہتر معانی بھی مل سکیں۔ ہمارا معروضہ اثباتی نہیں بلکہ منفیانہ ہے۔ یعنی ہم یہ نہیں کہتے کہ ہماری ہی تفسیر صحیح ہے ہم اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ "تلک الغرانیق العلیٰ" والی تفسیر غلط ہے، صحیح کی تلاش میں آپ بھی اپنا ارتقاء جاری رکھئے

ہاں ایک شبہ ہماری تفسیر پر ضرور ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن میں جہاں بھی "تمنا" مذکور ہے وہ غیر محمود چیزوں کی آرزو کے لئے ہے اور کسی نبی یا رسول سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ غیر محمود چیزوں کی آرزو کرے۔ اس کا جواب آپ بھی سوچئے، اور ہم بھی سوچتے ہیں و سر دست تو ہم صرف اسی قدر عرض کریں گے کہ سارے قرآن میں "تمنا" تمنا ہی کے معنی میں آیا ہے۔ لیکن آپ آیت زیر بحث میں اس کے معنی بے تکلف تلاوت و قرأت کے لے لیتے ہیں۔ اسی طرح قرآن میں ایک جگہ تمنا کو محمود آرزو کے معنی میں بھی لے لیجئے۔ عربی ادب میں ہم نے بہت جگہ یہ دعا دیکھی ہے کہ اوصلہ الیٰ ما یتمناہ (اللہ اس کی تمنا پوری کرے) ظاہر ہے کہ یہ دعا بری آرزوؤں کے لئے نہیں ہو سکتی۔

کیا علامہ تمنا عمادی پھلواروی مدظلہ بھی اس پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔ اب آیت کا تفسیری ترجمہ ہم یوں کر سکتے ہیں کہ

اے رسول ہم نے آپ سے پہلے جو رسول یا نبی بھیجا ہے تو اس کے ساتھ یہ واقعہ ضرور پیش آیا ہے کہ جب اس نے (اپنے مشن کی تکمیل کی) آرزو (اور اس کے لئے جد و جہد) کی تو شیطان (شیطانی قوتوں) نے اس کی اس آرزو میں (رکاوٹیں) ڈالیں لیکن شیطان جو (رکاوٹیں) ڈالتا رہا اللہ اس کا ازالہ فرماتا رہا پھر وہ اپنی آیات کو اور زیادہ مستحکم کرتا رہا اور اللہ تو علیم و حکیم ہے (شیطانی تدبیروں کو وہ خوب جانتا ہے اور حکمت سے ان کا ازالہ فرماتا ہے)

آیت میں رسول اور نبی دونوں کا ذکر ہے۔ جیسا کہ بعض دوسری آیتوں میں بھی ہے۔ یہاں "رسول و نبی" کا فرق ہمارے پیش نظر نہیں لیکن ضمنی افادے کے لئے اس کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔ اس فرق کو ہم

یوں واضح کر سکتے ہیں کہ اگر کوئی زید سے کہے کہ تم کو کمانڈر انچیف بنایا جاتا ہے تم فلاں ملک کو جا کر فتح کرو، تو یہاں ایک تو عہدہ و منصب ہوا۔ اور دوسرا اس کا فرض یا ڈیوٹی۔ بالکل اسی طرح نبوت ایک منصب ہے۔ جو صرف حاملِ وحی کے لئے مخصوص ہوتا ہے اور رسالت اس کی ڈیوٹی ہے۔ ختم صرف نبوت ہوئی ہے رسالت جاری ہے۔ حضورؐ جن لوگوں کو باہر تبلیغ یا تحصیل کے لئے بھیجتے وہ رسول الرسول کہے جاتے تھے یعنی رسول اللہ کے پیغامبر۔ لیکن ان کو نبی الرسول یا نبی الیتی کبھی نہیں کہا گیا، کیونکہ ان سے پیغامبری کا تو کام لیا جاتا تھا لیکن انھیں نبوت کا منصب نہیں سونپا جاتا تھا۔ نبی کریمؐ کے بعد نبوت ختم ہو گئی لیکن رسالت جاری ہے یعنی اللہ کا جو پیغام حضورؐ لائے تھے اس پیغام کی پیغامبری اب امت کے ذمے ہے۔ حضورؐ رسول اللہ (براہ راست) تھے اور امت رسول اللہ کبھی نہیں ہو گی، صرف رسول رسول اللہ ہو گی۔ طلوع اسلام اپنے آپ کو نظام ربوبیت کا پیغامبر کہتا ہے۔ لیکن اگر وہ نظام ربوبیت کا "نبی" بھی کہنا شروع کر دے تو پھر دیکھئے اس کا کیا حشر ہوتا ہے، بیچارے مرزا غلام احمد صاحب کو یہ فرق معلوم نہ تھا۔

ہاں تو عرض یہ کرنا ہے کہ نبوت کے علاوہ، رسالت کے کام میں بھی ہمیشہ شیطانی رکاوٹیں پیدا ہوتی رہیں اور آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔ آیت زیر بحث میں یہی حقیقت حضورؐ کو بحیثیت نبی و رسول کے اور امت کو صرف بحیثیت رسولِ رسول (پیغامبر دائمی) کے بتا کر ڈھارس دی گئی ہے اور حوصلے کو مضبوط کیا گیا ہے۔

طلوع اسلام جیسا کہ ابن آدم نے لکھا ہے، غرانیق والے قصے کی لغویت خود بتا رہی ہے کہ یہ روایات وضعی ہیں اور حضور نبی اکرمؐ کی ذات اقدس کے خلاف بہت بڑا بہتان۔ لیکن وجۂ حیرت یہ بات نہیں کہ دشمنانِ اسلام نے کس طرح ان خرافات کو وضع کر کے ہماری کتابوں میں داخل کر دیا، وجہ حیرت یہ ہے کہ ان چیزوں کو دیکھ کر آج جس کا دل دکھے اور وہ کہے کہ اس قسم کی باتیں کبھی رسول اللہ کی طرف منسوب نہیں کی جا سکتیں، اسے منکر حدیث قرار دے کر دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا جاتا ہے اور متبع سنت اسے قرار دیا جاتا ہے جو اس قسم کی باتوں کا بیان جھوم جھوم کر

(۲) ابن آدم نے اس آیت کی جو تفسیر لکھی ہے۔ وہ بھی قرآن کی تعلیم کے مطابق ہے۔ لیکن اگر تمنّٰی اور اُمنیۃ کے معنی قرأت کے بھی لیں (جس کی تائید قرآن سے ملتی ہے) تو بھی اس کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے (بشرطیکہ اس "شان نزول" والے قصے کو در انداز نہ ہونے دیا جائے) اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ وحی کے متعلق یہ بتایا ہے کہ ایک رسول آتا، وہ خدا کی وحی لوگوں تک پہنچاتا رہا (اس کی تلاوت و قرأت بھی) اس کے بعد وحی کے دشمن اس کی وحی (آسمانی کتاب) میں انسانی آمیزشیں کر دیتے، اور وحی اپنی اصل شکل میں باقی نہ رہتی۔ پھر ایک رسول بھیجا جاتا جو وحی خداوندی کو انسانی آمیزشوں سے پاک اور صاف کر دیتا۔ نیز اس میں حالات کے تقاضوں کے مطابق مناسب رد و بدل اور حک و اضافہ بھی کر دیا جاتا۔ ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نأت بخیر منہا او مثلہا (۲/۱۰۶) کے یہی معنی ہیں، سورۃ انعام میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ وحی کے دشمنوں کی طرف سے یہ تحریف، روایت سازی کے ذریعے کی جاتی تھی

چنانچہ فرمایا۔ وکذالک جعلنا لکل نبی عدوا شیطین الانس والجن یوحی بعضہم الیٰ بعض زخرف القول غرورا (۶/۱۱۲) اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے جن و انس کے سرغنوں کو دشمن ٹھہرایا۔ جو آپس میں ایک دوسرے کو نہایت خوشنما باتیں سکھاتے تاکہ ان کے ذریعے لوگوں کو دھوکا دیں۔ اگر سورہ حج کی تمنّٰی والی آیت (۲۲/۵۲) اور اس سے ملحقہ آیات کو سورۃ انعام کی مذکورہ صدر آیت اور اس کی متصل آیات سے ملا کر دیکھیں، تو یہ بات صاف ہو جاتی کہ دونوں جگہ ان شیاطین کی اس کارروائی کا ذکر ہے۔ ان دونوں مقامات کی آیات میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وحی کے دشمنوں کی اس سازش سے ان کا مقصد کیا ہوتا تھا اور یہ بھی کہ اللہ کس طرح ان وضع کردہ روایات کی تنسیخ سے اپنی آیات کو محکم بنا دیتا تھا۔ سورہ حج میں اسے ثم یحکم اللہ آیتہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور سورہ انعام میں افغیر اللہ ابتغی حکما" اور وتمت کلمت ربک صدقا وعدلا لا مبدل لکلمتہ سے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ کتب سماوی میں یہ تحریف الحاقی اس انداز سے ہوئی جب قرآن کی باری آئی۔ تو اس میں اور سابقہ کتب سماوی میں ایک بین فرق واضح ہو گیا۔ اور وہ فرق ہے ختم نبوت کا یعنی سابقہ کتب سے انسانی تحریفات کو الگ کرنے کے لئے ایک اور نبی آتا تھا لیکن نبی اکرمؐ کے بعد چونکہ کوئی نبی نہیں آ سکتا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ اور اس طرح قرآن کے اندر کسی قسم کی لفظی تحریف کی گنجائش نہ رہی۔ اس تحریف کے لئے وحی کے دشمنوں نے مثلہ معہ کا دروازہ کھولا، اور اس کے راستے سے لاکھوں روایات وضع کر کے دین کا جزو بنا ڈالیں۔ اگر یہ روایات قرآن کے اندر شامل ہو جاتیں۔ تو انہیں الگ کرنے کے لئے یقیناً ایک نبی کی ضرورت پڑتی۔ لیکن چونکہ قرآن اپنی اصل شکل میں موجود ہے، اس لئے ان تحریفات کو غلط بتانے اور انہیں دین سے الگ کرنے کے لئے کسی نبی کی ضرورت نہیں۔ ابن آدم کے الفاظ میں یہ کام "رسل رسول اللہ" کے ذریعے ہو گا، یعنی ان کے ذریعے جو سنت رسول اللہ کے اتباع میں قرآن کو لوگوں تک پہنچائیں، اس ضمن میں جس طرح رسول اللہ کی سخت مخالفت ہوتی تھی اسی طرح متبعین رسول اللہ کی بھی مخالفت ہو گی۔ جس طرح حضورؐ کے زمانہ میں مخالفین کہتے تھے کہ لا تسمعوا لهذا القرآن والغوا فیہ لعلکم تغلبون (۴۱/۲۶)۔ ان قرآن والوں پر غالب آنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم نہ خود قرآن کو سنو نہ کسی دوسرے کو سننے دو، جہاں قرآن کی آواز بلند ہو وہاں شور مچا دو۔ چڑیوں کی طرح چیں چیں کرنا شروع کر دو، اسی طرح آج بھی یہی کچھ ہو رہا ہے لیکن جس طرح آخرکار انھیں ناکامی ہوئی تھی، انھیں بھی ناکام رہنا پڑے گا۔ اور خدا کی بات پوری ہو کر رہے گی۔

نوادرات
علامہ اسلم جیراجپوری کے مضامین کا نادر مجموعہ
قیمت ــــ چار روپے
ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

ہندوؤں کا انخلا (صفحہ ۷ سے آگے)

ہوتا ہے۔ اس وجہ کے علاوہ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کو یہ ڈر بھی لگا رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حکومت ہند ان کا آنا جانا بند کر دے حالانکہ وہ پسند نہیں کرتے، کیونکہ تقسیم سے بے شمار خاندان بٹ گئے ہیں۔ چونکہ ان کے کمانے والے زیادہ تر کلکتہ یا مغربی بنگال میں ہیں اس لئے وہ آہستہ آہستہ ادھر ہی آ جاتے ہیں۔ نیز انھیں یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ وہ جتنا جلدی ہندوستان پہنچ جائیں گے انھیں بحالی کی رقوم و مراعات فوراً مل جائیں گی۔

ہندوستان میں یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ پاکستان میں معاشی حالات ابتر ہیں اس لئے وہاں سے ہندو بھاگ رہے ہیں اس کی حقیقت سمجھنے کے لئے ذرا ہندوستان سے پاکستان آنے والوں کی تعداد پر غور کیجئے۔ اگست ۱۹۵۴ء میں سولہ ہزار افراد مشرقی پاکستان گئے۔ دسمبر میں یہ تعداد بائیس ہزار تک پہنچ گئی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مشرقی پاکستان سے ایک ہندو ہندوستان آتا ہے تو اس کے مقابلے میں دو ادھر سے آ جاتے ہیں۔ یہ واضح ہے کہ بائیس ہزار مسافروں میں سے بیس ہزار ہندو ہیں، اور دو ہزار مسلمان۔ ان ہندوؤں کے پاس ایک ایک سال کا اجازت نامہ ہوتا ہے۔ اگر پاکستان کے حالات تسلی بخش نہ ہوں تو اتنی کثیر تعداد میں ہندو کبھی وہاں نہ جائیں، جہاں تک معاشی حالات کا تعلق ہے وہ کوئی ایسے خراب نہیں، پاکستان میں چاول چھ سے نو روپے کے حساب سے بکتے ہیں۔ مچھلی مغربی بنگال سے سستی ہے۔ کپڑا مقابلتاً مہنگا ہے مگر ترک وطن کی تازہ تحریک شروع ہونے کے وقت سے سستا ہے۔ پھر معاشی بدحالی ہو تو ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے برابر ہے۔ اس کا اثر تنہا ہندو پر نہیں پڑتا۔

"کلکتہ کے اخبارات کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنے تصوروں میں یہ نقشہ رکھتے ہیں گویا مشرقی پاکستان میں ہر ہندو مرد ایسے رہ رہا ہے کہ اس کے گلے پر تلوار رکھی رہتی ہے اور اسے ہر وقت جان کا خطرہ لاحق رہتا ہے اور ہر ہندو عورت کے ساتھ ایک مسلمان سائے کی طرح پھر رہا ہے جو اسے اغوا کرے گا۔ ذہنیتیں یوں مسموم ہو جائیں تو پھر کیا حل کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ مثال کے لئے "ہندوستان سٹینڈرڈ" کو دیکھئے پاکستان اور ہندوستان کے وزراء نے مشرقی پاکستان کا دورہ کرنے کے بعد اتفاق سے کلکتہ میں دو گھنٹے مسلمانوں کے ساتھ بھی گزار لئے۔ اس سے یہ اخبار آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے بڑے غصے سے لکھا کہ مسلمانوں سے مل کر دونوں وزیروں نے پرامن ہندوستان کو جھگڑوں سے بھرے ہوئے پاکستان کی سطح پر لا کھڑا کر دیا ہے۔"

احادیث
کے متعلق پوری تفصیل
"مقام حدیث"
میں دیکھئے
کتاب دو جلدوں میں ہے
قیمت فی جلد
چار روپے

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ہوگا اسی قدر قرانی فکر عام ہوگا اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ہے۔ یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا دس* روپے کی ماہانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تا آنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ہوجائے۔ اس طرح — — —

- آپ کی پیشگی رقم سے ہمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اب شامل ہوجائیے۔

* پہلے ماہانہ قسط کی رقم کم سے کم پچیس روپے تھی لیکن اب متعدد قارئین کے اصرار پر اسے بدل کر دس روپے کر دیا گیا ہے۔ جو احباب دس روپے سے زیادہ قسطیں دینا چاہیں وہ دے سکتے ہیں۔

معاملہ کی ضروری باتیں

- طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ہے۔ یہ بھی آپ سے ایسا ہی برتاؤ کریگا۔
- حساب میں بعض اوقات غلطی ہوسکتی ہے۔ ایسی غلطی باہمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجیے۔
- رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے۔ کتابوں کے لئے الگ۔
- مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے۔ نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے۔
- پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو ہفتہ پہلے اطلاع دیجئے۔
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک ہفتہ کے اندر دیجئے۔ بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ - کراچی - ۳

Regd. No. S. 1089. TOLU-E-ISLAM, KARACHI. April 30, 1955.

دور حاضرہ کی عظیم کتاب

٭ نظام ربوبیت ٭

(از - پرویز)

شائع ہوگئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی رو سے اس زمین پر انسان کے سب سے اہم سوال۔ یعنی

معاشی مسئلہ

کا حل کیا ہے۔ انسانی عقل اس کے حل سے کس طرح قاصر رہی ہے اور وحی خداوندی نے اسے کس خوبصورتی سے حل کردیا ہے۔ رزق کے سر چشموں پر

ذاتی ملکیت

کیا نتائج پیدا کرتی ہے اور قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔ چونکہ اس کتاب کی عام اشاعت مقصود ہے اس لئے اسے دو قسموں میں شائع کیا گیا ہے۔

قسم اول: کاغذ سفید کرنافلی جلد مضبوط مع گردپوش۔ چھہ روپے

قسم دوم: کاغذ میکانیکل صرف ڈسٹ کور کے ساتھ۔ چار روپے

دونوں صورتوں میں محصول ڈاک الگ ہے۔

بہت جلد فرمائشیں بھیجیں۔ جن حضرات کی پیشگی رقم جمع ہے اُنہیں قسم اول از خود بھیجدی جائیگی۔ اگر وہ کتاب نہ لینا چاہیں یا قسم دوم لینا چاہیں تو بہت جلد اطلاع بھیجدیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ء - کراچی-۳

Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Jawed Press, McLeod Road, Karachi. Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1, Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi. Editor: KHURSHID ALAM